

خدا
ایقین
مایہ دہار

طلوعِ اِسلام (رجسٹرڈ)
ٹرسٹ

بی گلیکٹ، لاہور
۲۵

نام کتاب	:-	خدا اور سرمایہ دار
شائع کردہ	:-	طلوع اسلام ٹرسٹ
	:-	25-B، گلبرگ 2، لاہور۔ 54660
طابع	:-	خالد منصور نسیم
مطبع	:-	النور پرنٹرز و پبلشرز
	:-	3/2 فیصل نگر۔ ملتان روڈ، لاہور۔ 54500
ایڈیشن	:-	دوم 1996ء (بلا ترمیم)

(حقوق بحق طلوع اسلام ٹرسٹ محفوظ ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست

خدا ای سرمایہ دار

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۷	کے مطابق رکھ سکتے ہیں۔	۳	فہرست
۱۸	اس کے لئے جذبہ محرکہ کیا ہے۔	۴	پیش لفظ
۱۹	یہی اصل سوال ہے۔	۶	(۱) اسلام کے معاشی نظام کا خاکہ
۲۱	افراد کی ضروریات کا تعین کون کرتا ہے۔	۱۰	بھوک اور افلاس خدا کا عذاب ہے۔
۲۲	قرآن میں حدوتہ۔ غیرات۔ وراثت	۱۲	دنیا میں بھی عذاب اور آخرت میں بھی
۲۳	غیرہ کے احکام سے کیا مقصود ہے۔	۱۳	جنت کی زندگی رزق فراہم کی زندگی جس میں
۲۵	استفسارات اور ان کے جواب	۱۴	سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔
	(۲) ملکیت زمین	۱۵	تمام افراد کو رزق۔ ہم پہنچانے کی ذمہ داری اسلامی
	قرآن کی روش زمین پر کسی کی ذاتی	۱۶	معاشرہ پر ہوتی ہے۔
۳۰	ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔	۱۷	اس لئے رزق کے حصے انفرادی ملکیت کے بجائے
	لیکن مسلمانوں نے بعد میں اپنے ہاں	۱۸	معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں۔
۳۱	غیر اسلامی نظام رائج کر لیا۔	۱۹	افراد اپنی محنت کی کمائی میں سے صرف اپنی ضرورت

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	(۵) زرعی اصلاحات		(۳) زمینداری اور جاگیرداری
۷۵	ملکت پاکستان کی زرعی اصلاحات۔	۳۳	زمینداری اور جاگیرداری کا نظام اسلام کے
۷۶	مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت۔	-	خلافت ہے۔
۷۸	ان اصلاحات کا تجزیہ اور تبصرہ۔	۳۴	مصر کے مفتر سید قطب (مروجہ) کی تحقیق۔
۸۰	یکس حد تک ہلچلی ہیں؟	۴۰	عبدالسلامت و خلفائے راشدین میں زمین کی
	(۶) اقبال اور اشتراکیت	-	حیثیت۔
۸۲	نکد اقبال کا بنیادی حشر قرآن کریم تھا۔	۴۱	زمین، بٹائی یا گرایہ پر نہیں دی جاتی تھی۔
۸۳	اقبال نے قرآن کے معاشی نظام کا گہرا مطالعہ	۴۵	واقعہ خیر کی حقیقت۔
-	کیا تھا۔	۴۹	اسلامی نظام کا ما حاصل۔
-	اس کی فکری ارتقاء کے تین دور۔		(۴) قرن اول میں زرعی نظام
۸۴	معاشی دنیا کے تقاضوں کا تاثر۔	۵۱	زمین ملکیت کی تحویل میں وہی تھی۔
-	مزدور اور خواجہ کی کشمکش۔	۵۲	قطاع کاشت کے لئے دیئے جاتے تھے۔
۸۶	کمیونزم کا فلسفہ اور اقبال	۶۱	حکومت کو ان کے دلپس لے لینے کا بھی حق
۸۸	روس کے فلسفہ اشتراکیت پر تنقید۔	-	حاصل تھا۔
۸۹	اشتراکیت اور خدا کو یک جا کر دیا جائے تو	۶۳	ارضی پراختیار گلی ملکیت کو حاصل تھا
-	اس کا نتیجہ اسلام ہوگا۔	۶۴	انگرفتہ کی تصریح۔
	(۷) ربو کی بحث	۶۶	جو غیر مسلم اسلام لے آتے تھے ان کی اراضیات
۹۲	یہ بحث کہ سود جائز ہے یا ناجائز	-	کا معاملہ۔
-	قرآن نے ربو کو حرام قرار دیا ہے۔	۷۲	حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو زمین اور جائیداد
۹۳	ربو کا قرآنی مفہوم	-	رکھنے سے قانوناً منع کر دیا تھا۔
۹۴	ربو کے معنی سود ہی نہیں۔	۷۳	پیٹ وٹون حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؓ نے بھی
-	اس سے مراد سرمایہ پر منافع کے ہیں۔	-	جاری کیا تھا۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۱۷	مذہبی پیشوائیت بھی سرمایہ داری کا ساتھ دیتی تھی۔	۹۵	قرآن کی رو سے معاذ منہ محنت کا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔
۱۲۳	اسلام نے نظام سرمایہ داری کا تختہ الٹ دیا۔	۹۶	بیع و تجارت، اور ربوہ میں فسق۔
۱۲۵	لیکن بعد میں مسلمانوں نے اسے پھر اختیار کر لیا۔	-	ہمارے ہاں سرمایہ پر منافع کی اور شکلیں جائز۔
۱۲۶	موجودہ اسلام وہی ہے جو دور سوویت میں وضع کیا گیا تھا۔	-	سمجھی جاتی ہیں اور صرف سود کو حرام بتایا جاتا ہے۔
-	لیکن حقیقی اسلام قرآن میں محفوظ ہے۔	۹۷	حالانکہ اس منافع کی ہر شکل ناجائز ہے۔
-	ابروہ نظام سرمایہ داری کا دشمن ہے۔	۹۸	اس مشکل کا حل قرآن کے معاشی نظام میں ہے۔
	(۹) زکوٰۃ		(۸) خدا۔ اور۔ سرمایہ دار
۱۲۹	زکوٰۃ کی موجودہ شکل۔	۱۰۳	حق اور باطل کی کشمکش ابتداء سے چلی آرہی ہے۔
۱۳۰	اس پر اعتراضات۔	۱۰۴	حق، نوع انسان کے مفاد عامہ کا علمبردار ہے۔
۱۳۳	زکوٰۃ کا اشتراکی مفہوم	-	باطل، اگر وہ بندانہ مفاد کا متقاضی ہے۔
-	اسلامی مملکت کا فرض ہے تمام افراد کے لئے	-	اسی کا دوسرا نام نظام سرمایہ داری ہے۔
-	سامان نشو و نما پیدا کرنا ہے۔	-	دین، اس نظام کے خلاف مبلغ تھا۔
-	اسی سامان نشو و نما کو زکوٰۃ کہتے ہیں۔	۱۰۵	انہی کے کرام، اس نظام کی مخالفت کرتے تھے۔
۱۳۴	لہذا اسلامی مملکت "زکوٰۃ" دیتی ہے۔	-	اور نظام سرمایہ داری کے حامل انہی
-	لیتی نہیں۔	-	کرام کی دعوت کے خلاف محاذ متائم
۱۳۵	اس کے لئے ہر زمانہ کی اسلامی حکومت	-	کر لیتے تھے۔
-	خود قواعد و ضوابط وضع کرے گی۔	-	حضرت نوح سے لے کر حضور خاتم المرسلین تک
	(۱۰) کمیونزم اور اسلام	-	یہی کشمکش رہی۔
۱۳۸	معاشی نظام کی اہمیت۔	۱۱۱	خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیے۔
۱۳۹	مفسی تو رہیں خداوندی کی مخالفت آتی ہے۔		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۹۲	اس فلسفہ کا حباب زہ۔	۱۴۰	رزق بیا کرنے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے۔
۱۹۶	مترآنی فلسفہ حیات۔	۱۴۲	فرد اور معاشرہ کا باہمی تعلق۔
۲۰۸	مساوون اصداد۔	۱۴۴	زمین پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔
۲۱۱	غیر متبدل قوانین۔	۱۴۷	کمانے کی استعداد میں فرق۔
۲۱۳	مستقل اقدار۔	۱۵۱	دولت کا اکتنا نہیں کیا جاسکتا۔
۲۲۳	فلسفہ کا اثر معاشی نظام پر۔	۱۵۲	فاصلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہ سکتی۔
	(۱۴) ایک خط اور اس کا جواب	۱۵۴	ضروریات کا تعین کون کرے گا۔
۲۴۰	کیونکر کمزور کے حامیوں کے اعتراضات۔	۱۵۸	کام کرنے کا جذبہ محرکہ کیا ہو سکتا ہے۔
۲۴۳	ان اعتراضات کے جوابات	۱۶۰	ہشتر کی نظام کی اساس کمزور ہے۔
	(۱۵) اسلامی سوشلزم یا قرآن کا ہشتر کی نظام	۱۶۵	چند اعتراضات اور ان کے جواب۔
۲۵۹	مسلمان کسے کہتے ہیں۔		(۱۱) اساس پر حکم
۲۶۰	خدا کی ذمہ داری کیسے پوری ہوتی ہے۔	۱۶۲	کیونکر کمزور کا معاشی نظام اور فلسفہ حیات۔
۲۶۱	ملکیت کا تصور۔	۱۶۳	اس کے فلسفہ حیات کی بنیادی کمزوری۔
۲۶۲	مذہب پرستوں کی طرف سے اعتراضات۔	۱۶۴	مادی نظریہ حیات کی قسم کی اساس جھوٹا۔
۲۶۴	اس کا جواب۔		کھری نہیں سکتا۔
۲۶۸	اسلامی سوشلزم کے داعی۔	۱۶۷	یہ اساس حکم مترآنی نظریہ حیات بیا کرتا ہے۔
۲۶۹	یہ اصطلاح مفالطہ انگیز ہے۔	۱۶۸	اسی نظریہ حیات پر ہشتر کی نظام معیشت۔
۲۷۱	قرآن کا سوشل سسٹم۔		کی عارت استوار ہو سکتی ہے۔
	(۱۵) نظام رو بہ بیت کب قائم ہوگا	۱۸۳	چین کے ہشتر کیوں کے لئے لمحہ و فکر یہ۔
۲۷۷	بتائی تنا کے مطابق ہے۔		(۱۲) ماؤز سے تنگ اور قرآن
۲۷۸	ضبطی عشق کے تقاضے۔		کیونکر کمزور کا فلسفہ۔
۲۷۹	یہ انفرادی چیز نہیں۔	۱۸۷	علم کسے کہتے ہیں۔
۲۸۰	یہ اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہو سکتا ہے۔		
۲۸۰	اس کیلئے قلب و مانع کا انقلاب ضروری ہے۔	۱۹۱	

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

یوں قوم معاشی مسئلہ تاریخ انسانیت کے جز و لازم کی حیثیت سے ساتھ کے ساتھ چلا آرہا ہے لیکن ہمارے زمانے میں اس نے ایسی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ اسے کہتے ہی غم و غصہ میشت ہیں۔ اس وقت دنیا جن دو بلاؤں میں بٹ رہی ہے ان کی بنیاد بھی معاشی نظام کا اختلاف ہی ہے۔ یہ تصادم ہے نہ کہ نظام سرمایہ داری اور کمیونزم کے اشتراکی نظام کا۔ نظام سرمایہ داری کے متعلق اقبال نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

گیا دور سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا

لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ چمکتے جاتے بھی ہزار تیا متیں ڈھاجے گا۔ چنانچہ اس وقت اس کی حرکت بلوچی جو خون کے پھینٹے اڑا رہی ہے اس سے زمین لالسا ہر ہو رہی ہے۔ اس کے مقابل اشتراکی نظام ہے جسکی ابتداء اس سے ہوئی اور وہاں سے آگے بڑھ کر وہ چین میں پہنچا۔ لیکن اس وقت اس نظام کے فلسفہ کے متعلق خود روس اور چین میں جس قدر اختلاف رونما ہو چکا ہے وہ اپنی شدت میں اس سے کم نہیں۔ جو نظام سرمایہ داری اور اشتراکی نظام میں وجہ نسا د آدمیت بنا تھا اور جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اسلام کا دعوے ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔

اس کے اس دعوے کے پیش نظریہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے اس اہم ترین مسئلہ کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اسلامی شریعت کے علمبردار۔ یعنی ہماری مذہبی پیشوا میثت۔ جس معاشی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کرتے ہیں، وہ اس قسم کا سرمایہ دارانہ نظام ہے جسے خود نظام سرمایہ داری کی حامل قومیں بھی بہت پیچھے چھوڑ آئی ہیں اور جو اب زمانے کے تقاضوں سے حالت نزع میں ہے۔ اگر اسلام نے اس مسئلہ کا

یہی حل پیش کیا تھا تو اس کا نوع انسان کی نجات کا ضامن ہونے کا دعویٰ محل نظر قرار پا جاتا ہے۔
 اور اگر نظام سرمایہ داری کے برعکس، اشتراکی نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے تو
 پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس نظام کے متعلق اسلام کا رد عمل کیا ہے؟
 اور اگر اسلام ان دونوں سے الگ کوئی اور نظام پیش کرتا ہے تو اس نظام کی تفصیل کیا ہے
 اور اس کے اطمینان بخش ہونے کی ضمانت کیا؟

طلوع اسلام اس دعوے کا حامی ہے کہ قرآن کریم نوع انسان کے تمام بنیادی مسائل کا اطمینان
 بخش حل پیش کرتا ہے اس بنا پر اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ معاشی نظام جیسے اہم ترین مسئلہ کو اپنی خصوصی توجہ
 کا مرکز بناتا۔ چنانچہ اس نے گزشتہ ہر سال میں اس موضوع پر ہزار ہا صفحات شائع کئے ہیں۔ ان میں نظام
 سرمایہ داری کی اصل و بنیاد اور اشتراکی نظام کے فلسفہ اور معاشی نظم و نسق کا تجزیہ کر کے ان کا نقاب الی
 مطالعہ کیا اور اس کے بعد شرح و بسط سے بتایا کہ قرآن کریم کونسا فلسفہ زندگی اور اس پر متفرع کس قسم کا
 معاشی نظام پیش کرتا ہے اور ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے جو کچھ اسلام کے نام سے پیش
 کیا جاتا ہے اس کی اصل و حقیقت کیا ہے؟

ان مقالات کی اہمیت کے پیش نظر ہمیں مسلسل تقاضے ہو رہے تھے کہ انہیں مرتب کر کے
 اس طرح یک جا شائع کیا جائے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ (ضروری نظر ثانی کے بعد)
 پیش خدمت ہے۔ جہیں امید ہے کہ یہ اس اہم مسئلہ کے سمجھنے اور اس نعمتی کے سنبھالنے میں مدد و معاون
 ثابت ہو گا۔

(۲) اس سے پہلے اس موضوع پر پرویز صاحب کی ایک خود مکتفی تصنیف، نظام ربوبیت
 کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ جو احباب قرآنی نقطہ نگاہ کو زیادہ وضاحت سے سمجھنا چاہیں، اس کتاب کا
 مطالعہ ان کے لئے مفید رہے گا۔

(۳) اس کتاب کے اعلیٰ ایڈیشن کے ساتھ، عالم اشاعت کی غرض سے، چیمپ ایڈیشن بھی شائع
 کیا جا رہا ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ ٹکے - لاہور

اکتوبر ۱۹۶۶ء

اسلام کے معاشی نظام کا خاکہ

(پرویز صاحب کی ایک تقریر)

انسانی بچہ جب دنیا کی فضا میں پہلا سانس لیتا ہے تو بھوک سے چلاتا ہے اور اپنے رزق کے سرچشوں کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ اور جب انسان اس دنیا میں آخری سانس لیتا ہے تو بھی اس کے حلق میں کچھ ٹپکایا جاتا ہے تاکہ اسے کچھ نہ کچھ توانائی مل سکے۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ اس شخص کا رزق ختم ہو گیا تھا۔ لہذا رزق کا معاملہ ایسا ہے جس سے انسان اپنی زندگی کے کسی سانس میں بھی تسلیت نہیں دے سکتا۔ انسانی زیست کے لئے اس سے زیادہ اہم مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کو آرام سے باغیچہ کھانے پینے کو مل جاتا ہے اس کی زندگی کو بڑی کامیاب زندگی تصور کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی ایک ایک سانس میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اُس نے اسے رونے کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونے دیا۔

انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر انسان کی اجتماعی زندگی پر غور کیجئے تو اس میں بھی یہی نظر آئے گا کہ قوموں کی تلگ و تاز اور جدوجہد کے لئے سب سے زیادہ جذبہ محرکہ رزق کا سوال ہوتا ہے۔ رزق کی کمی تھی جس کے پیش نظر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تاریخ انسانیت کی تعبیر ہی معاشی نقطہ نگاہ سے

کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک سابقہ اقوام کی تاریخ کا تعلق ہے مارتس کا نظریہ معاشیات کی اہمیت صحیح ہو یا غلط اس کے متعلق تفصیلی گفتگو ذرا آگے چل کر کی جائے گی، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے دور میں اس مسئلہ نے اسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ آئندہ والا مؤرخ جب اس پر نگاہ ڈالے گا تو وہ اسے عصر معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کے سوا کسی اور کے نام سے نہیں پکار سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیب، تمدن، معاشرت، سیاست، قومی مسائل اور بین الاقوامی معاملات سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت دنیا ملاجن رو بلاکس (BLOCKS) میں بنی ہوئی ہے، ان میں کچھ کو تو خط امتیاز نظام حکومت ہے۔ یعنی ڈکٹیٹر شپ اور جمہوریت۔ لیکن درحقیقت ان میں بنیادی اختلاف نظام معیشت (ECONOMIC ORDERS) ہی کا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام روٹی کے مسئلہ نے دونوں کی ناک میں نیکیں ڈالی ہوئی ہے اور وہ انہیں جھڑ جی چاہے کشاں کشاں کئے پھروا ہے۔

انسان نے اس اہم مسئلہ کے حل کے لئے جب مذہب کے دروازے پر دستک دی۔ — مذہب میری مراد ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب — تو اس نے یہ کہہ کر اپنا چھڑا لیا کہ ہمارا مقصد انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس دنیا کے مسائل سے بھارا مذہب اور روٹی کوئی مسئلہ بیکار نہیں۔ یہ مادی دنیا، کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔ اس خدا کے نیک بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس سے بچ بھاگیں۔ لیکن یہ محض فریب نفس تھا یا فرار کی راہ۔ اس لئے کہ انسان دنیا سے کتنی ہی دور کیوں نہ جھکا اور اس طرح کتنا ہی بڑا ایشور کا بھگت کیوں نہ بن جائے، جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے لیکن خوراک کے مسئلہ سے بھاگ کر کیوں نہیں جاسکتا۔ وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے۔ کھائے بغیر گزارہ ہو نہیں سکتا۔ بھوک رشیوں میں کو بھی لگتی ہے اور پیروں نفیروں کو بھی۔ کھائے بغیر نہ "ایشور کے اذن" زندہ رہ سکتے ہیں نہ اللہ کے مقرب۔ اس لئے انسانوں کے خود ساختہ "مذہب" کا یہ کہنا کہ اسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں، حقیقت کو جھٹلانا اور لوگوں کو فریب دینا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلہ سے اس دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کھاتے ہیں۔

اسلام مذہب نہیں بلکہ الدین ہے جس کے معنی ہیں نظام زندگی یا دنیا بیلہ حیات۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کا دعویٰ ہو کہ وہ انسان کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔ اور جو دنیا بیلہ حیات انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے راہ نمائی دینے کا مدعی ہو، وہ انسان کے معاشی مسئلہ سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے۔ وہ ردی کے سوال سے کس طرح آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ چنانچہ قرآن نے اس مسئلہ کو پوری پوری اہمیت دی ہے اور اس کا ایسا حل بتایا ہے جو ان پریشانیوں کو نہایت آسانی سے دور کر دیتا ہے۔ جو انسان کو جہنم کی آگ کے شعلے میں گر چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔

مترآن کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو ردی

کی فراوانی حاصل ہو، یہ سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو، اس پر خدا کا غضب ہے۔ سورہ نحل میں ہے۔ صَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا (۱۱۱) خدا نہیں مثال دے کر ایک بات سمجھاتا ہے (مَثَلًا قَرِيبَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔ ایک جتنی جتنی جو نہایت امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس کے کھانے پینے کا سامان (رزق) ہر جگہ سے با فراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔ فَكَفَّرَتْ بِاَنْعَمِ اللّٰهِ۔ اس نے اللہ کی ان نعمتوں کی ناشکر گزاری کی۔ تو ان کے اس جرم کی پاداش میں فَاَذَا قَهَا اللّٰهُ لِبَاسٍ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۱۲) اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

آپ نے مذہبی حلقوں میں اس قسم کے فقرے سنے ہوں گے کہ انسان کو ہمیشہ احکام خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیے جو شخص خدا کی نافرمانی کرے اس پر اس کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان سے پوچھئے کہ وہ عذاب کیا ہوتا ہے تو وہ کہہ دیں گے کہ اس قسم کے انسان کو مرنے کے بعد جہنم میں بھیجا جاتا ہے اور وہ وہاں خدا کے عذاب کا مزہ اچکھتا ہے۔ مرنے کے بعد جہنم اور جنت سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن مترآن کریم قانون خداوندی سے اعراض برتنے (رد گردانی کرنے) کا جو عذاب بتاتا ہے وہ اسی دنیا میں سامنے آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ اَعْوَضَ عَنْ ذٰلِكَ فَاِنَّ

معیشت کی تنگی | لَهٗ مَعِيشَةٌ ضَنْكًا (یعنی)۔ یاد رکھو، جو کوئی میرے قانون سے رد گردانی

کرے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی؟ اس سے ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ رزق کی تنگی یعنی بھوک کا عذاب ہے۔

آپ نے بعض لوگوں کو کہتے سنا ہو گا کہ خدا اپنے بندوں کو عذاب میں ڈالتا ہے اور انہیں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انہیں کھانے کو روٹی نہیں ملتی۔ پینے کو پٹر انہیں ملتا۔ منطقی تنگ دستی بے کسی بے چارگی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ وہ اس دنیا میں بڑی عُسرت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عاقبت اتنی ہی زیادہ تابناک اور خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن سترآن کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث رونما ہوتے ہیں جن میں انہیں سخت مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً جنگ کے زمانے کی تکالیف اور مصیبتوں سے کون واقف نہیں جن میں بڑی بڑی خوش حال اور دولت مند قومیں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں؟ لیکن یہ صرف ہنگامی حادثات ہوتے ہیں جو آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ لیکن عُسرت اور غموں حاسی کسی فرد یا قوم کی زندگی کا معمول ہو جائے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ یہ خدا کے مقبول بندوں کی علامتیں ہیں۔

دنیا اور آخرت میں عذاب یہ چند سبزہ زدہ دنیاوی زندگی کے مصائب ہیں۔ اس کے بعد آخرت کی زندگی میں تمام خوشگواریاں اُدھر سرقر لڑیاں انہی کے حصے میں آئیں گی۔ اس لئے کہ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (جو ہمارے قانون سے اعراض برے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی) تو اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وَ غَشْرُوا يَوْمَ الْعَقِيبَةِ أَعْمٰی (اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے؟) اس سے ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی سے اعراض کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں رزق کی تنگی اور آخرت میں ذلت و رسوائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سترآن کی دُور سے زندگی ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے اس دنیا تک مسلسل چلی جاتی ہے اس لئے جن اعمال کے نتائج اس عاقبت کا اندھا زندگی میں رسوا کن اور ذلت انگیز ہوں، عاقبت میں ان کے نتائج عزت بخش اور سترت آمیز نہیں ہو سکتے اس باب میں قرآن کا واضح فیصلہ ہے کہ

مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمٰی فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمٰی وَأَضَلُّ سَبِيلًا (۱۱)

جو اس دنیا میں اندھا یا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

اقبال کے الفاظ میں۔

وہ کل کے غم و عیش پر کچھ حق نہیں رکھتا
وہ قوم نہیں لاکھ ہنگامہ فردا
جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
جس قوم کی تقدیر میں مرور نہیں ہے

لہذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی قوم کی عاقبت کی زندگی کیسی ہوگی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کیسی ہے۔ اگر اسے سالانہ زیست کی فردانی نصیب نہیں۔ اگر وہ رزق کی تنگی کے عذاب میں مایوس ہے۔ اگر وہ اپنی روٹی کے لئے بھی دوسروں کے دروازے پر جھولی پھیلانے کے لئے مجبور ہے تو اس قوم کو عاقبت کی سرفرازیاں اور سربندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رو سے جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہوتی ہے اور آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ جتنا انسان کی سرگزشت کو قطعہ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے وہ اس میں بتاتا ہے کہ جب آدم جنت میں تھا تو اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ اِنَّ لَكَ اَلَا تَجُوعُ فِيْهَا وَ لَا قَهْرٌ وَاَنْتَ لَوْ تَطْمَنُّ اِيْهَا وَ لَا تَنَفُّى (۱۰۰)۔ ”تجھے یہاں یہ میسر ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا رہے نہ تنگ۔“

نہ پیاسا رہے اور نہ ہی دھوپ میں۔ یعنی اس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی (روٹی، پانی، لباس، مکان) سے محروم نہیں تھا۔ اس میں آدم اور اس کی بیوی سے کہہ دیا گیا تھا کہ كُلْ مِنْ حَيْثُ رَزَقْنَاكَ وَ اَعْبُدْنِيْ وَ اِلَیَّ رُجْعُکُمْ (۱۰۱)۔ تم اس میں سے جہاں سے جی چاہے کھاؤ و بیو، یعنی اس میں ہر ایک کے لئے ہر جگہ بافراط سالانہ رزق موجود تھا۔ یہ تھی وہ جنت ارضی جو ان کی مفاد پرستیوں کی وجہ سے اس سے چھین گئی اور جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اسے خدا کی طرف سے راہ نما ملی اور اس سے کہہ دیا گیا کہ فَاِمَّا يَنْتَحِبْکُمْ فَمِنْ هٰذِهِ فَمَنْ اَتَّبَعَ هٰذَا فَاِیْ فَلَ یَغْضِبْکُمْ وَ لَا یَنْصَحْکُمْ (۱۰۲)۔ سو جب تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آئے۔ سو جو میری راہ نمائی کا اتباع کرے گا، تو نہ اس کی کوششیں رائیگاں جائیں گی اور نہ ہی وہ (سالانہ زندگی سے) محروم رہے گا۔ (اور نہ ہی اسے ان کے حصول کیلئے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی)۔

فرزندان آدم کے لئے اس زمین پر ہی جنت کی دوبارہ تشکیل قرآن کا مقصود و نیت ہے۔

اسے قرآنی نظامِ ربوبیت یا (QURANIC SOCIAL ORDER) کہتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت قائم کس طرح ہوتا ہے اور اس میں انسان کو کیا کچھ حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کا مقصد یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی رو سے روٹی کے مسئلہ کا حل مقصود باندھا ہے یا کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے کہ اسی بنیاد پر انسانی ہیئت اجتماعی کی پوری کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

زندگی کا ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے کھاپی کر پڑا ہوتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ کھانے پینے کا سامان حاصل کر کے۔ شادی کرتا ہے۔ صاحبِ اولاد ہوتا ہے۔ اولاد کو کمانے کے قابل بنادیتا ہے اور مر جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر زندگی کا مقصد اتنا ہی ہے تو پھر ایک حیوان اور انسان میں کچھ فرق نہیں۔ یہ کچھ بہ حیوان کرتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ اپنی نسل بڑھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ قرآن اس زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وَ الْاِنْسَانُ لَكَفُورٌ ۝۱۰۰ اُدھر جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ (منہاج زندگی سے) فائدہ اٹھاتے ہیں اور

حیوانی سطح کی زندگی

حیوانات کی طرح کھاپی کر رہ جاتے ہیں، ان کا ٹھکانہ آگ ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا تصور حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے جس سے ایک فرد اس دنیا میں بھی سرفرازی و سر بلندی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں اترتھائے ذات کے مزید مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو تمام نوع انسانی کو بھوک، خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔

انسانی سطح کی زندگی

اس کا نام انسانی سطح کی زندگی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر افراد روٹی کھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ایسا معاشرہ قائم ہونا چاہیے جو افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دے تاکہ انہی کو انسانی اور صلاحیتیں حیوانی سطح سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ قرآنی نظام ربوبیت افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر کے انہیں انسانیت کی سطح پر لے آتا ہے۔ معاشرہ اس خدا کی ذمہ داریاں اپنے سر پر دیتا ہوا جس کے قوانین کو عملنا نفاذ کرنے کے لئے وہ وجود میں

رزق کی ذمہ داری

غَنَىٰ نَبْرُؤُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۱۱۱)

ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

یہ ذمہ داری صرف ان افراد تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اس ملک کی حدود میں بسنے والے تمام ذی حیثیت کو محیط ہوتی ہے اس لئے کہ جس خدا کے نام پر یہ ملک قائم ہوتی ہے اس کا اعلان ہے کہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱۲)۔ ”رہے زمین پر بسنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو“ اللہ کی یہ ذمہ داری اسلامی ملکیت کے ہاتھوں کس طرح پوری ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے فرمائیے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتابھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمر سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اسلامی ملکیت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد ملکیت (بلکہ اس حدود میں بسنے والے تمام جانوروں تک) کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر پر لے۔ جو ملکیت اس ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لیتی وہ اسلامی ملکیت نہیں کہلا سکتی۔

میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملکیت ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح کر سکتی ہے؟ قرآن اس کا بھی جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس ملکیت نے خدا کی ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے سر لیا ہے۔ رزق کے سرچشمے اور وسائل پیداوار جو خدا کی ملک میں اس ملکیت کی تحویل میں

چلے جائیں گے تاکہ وہ ان کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی پرورش ہوتی چلی جائے۔ یہ وجہ ہے کہ شراعی نظام رو بہیت میں، رزق کے سرچشموں پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ نہ افراد کی اور نہ ملکیت کی۔ ملکیت بھی صرف ان کا انتظام کرتی ہے۔ رزق کے سرچشموں میں بنیادی حیثیت ارض (زمین) کو حاصل ہے جس سے نہ صرف اناج پیدا ہوتا ہے بلکہ تمام مصنوعات کے لئے خام مالہ بھی وہیں سے برآمد ہوتا ہے۔ ارض کے لئے قرآن نے کہہ دیا ہے کہ اسے خدا نے مخلوق کی پرورش کے لئے

پیدا کیا ہے وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۳۹)۔ اس لئے اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا پیدا کردہ رزق تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر بکھلا رہے۔ سَوَاءٌ لِّلشَّائِلِينَ (۴۰)۔ اس لئے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ (۴۱) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے سامان زندگی۔ اسے اسی مصرف میں لانا چاہیے۔ اگر یہ افراد کی ملکیت میں چلی جائے تو اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے معاشرہ کی اجتماعی تحریک میں رہنا چاہیے تاکہ جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے وہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ اس حقیقت کو مت یان نے سورہ الواقعہ میں بڑے دل شین پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے اَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۚ کیا تم نے اس پر بھی غور کیا جسے تم بوتے ہو؟ تم اتنا ہی کرتے ہو کہ زمین میں ہل چلاتے ہو۔ اسے کاشت کے قابل بناتے ہو۔ پھر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اس کے بعد سوچو کہ اَمْ اَسْتَحْمُرُ تَزْرَعُونَهٗ اَمْ اَنْحَنُ الزَّارِعُونَ ۚ کیا اس بیج میں سے پودا تم پیدا کرتے ہو یا ہمارا قانون پیدا کرتا ہے؟ اَوْ نَشَاءُ ۚ جَعَلْنَهٗ حُطًا مَّا فَطَمْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۚ اِنَّا لَمُعْرِضُونَ ۚ بَلْ اَسْحَنُ فَحَرِّوْهُمُ ۚ اگر ہمارا قانون اس کے خلاف چاہتا تو ہم اس کھیتی کو خشک سالی سے چورا چورا کر دیتے اور تم حیرت میں گم ہو جاتے کہ یہ کیا ہو گیا؟ ہم پر مفت میں چینی پڑ گئی۔ فصل تو ایک طرف، ہم بیج سے بھی محروم ہو گئے۔

پھر آگے بڑھو اَفَرَأَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِی تَشْرَبُونَ ۚ کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا جو تمہارے لئے زندگی کا سامان اور تہیاری کھیتی کے گھنے کا ذریعہ بنتا ہے؟ اَمْ اَسْتَحْمُرُ اَنْزَلْنَاهُ ۚ مِنَ الْمُنْزِلِ اَمْ اَنْحَنُ الْمُنْزِلُونَ ۚ کیا اسے بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ اَوْ نَشَاءُ ۚ جَعَلْنَهٗ اُجَاجًا ۚ فَلَوْ لَا تَشْكُرُونَ ۚ اگر ہمارا قانون دوسری طرح چاہتا تو ہم اسے (ایسا) بھانا بنا دیتے جسے نہ تم پی سکتے نہ اس سے تہیاری کھیتیاں اگ سکتیں۔ سو تم اس کے نذر دان کیوں کیا ہوتے؟

اور آگے بڑھو اَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِی تُورُونَ ۚ کیا تم نے اس آگ پر بھی غور کیا جسے تم جلاتے ہو۔ اَمْ اَسْتَحْمُرُ اَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا ۚ اَمْ اَنْحَنُ الْمُشْتُونَ ۚ کیا اس درخت کو جس سے آگ کا سامان ملتا ہے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔

ذرا سوچو کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس میں تمہارے لئے عبرت دہ مو غلط کی ہزار داستانیں

پوشیہ میں غنّ جَعَلْنَاهَا ثَلَاثَ نِكَاحٍ اس سے سبق حاصل کرو۔ یہ سبق کہ یہ سب کچھ تمہارا پیدا کردہ نہیں۔ ہمارا پیدا کردہ ہے۔ تم اس میں صرف محنت کرتے ہو۔ اس لئے اس کھیتی میں تمہارا حصہ تمہاری محنت کے بقدر ہے۔ باقی سب کچھ ہمارا ہے۔ اسے ہم نے مَتَّانًا لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (۲۳۷)۔ بھوکوں کے لئے سامانِ زیست بنایا ہے۔ اس لئے اس مالِ تو رزق کو ان کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو۔ سارے کا سارا اپنی ملکیت نہ سمجھو۔ اِتِّبَال کے الفاظ میں غور کرو کہ

پالتا ہے سچ کو مٹی کی تارکی میں کون کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے کون
کون لایا کھینچ کر کچھم سے پاؤں ساز گا خاک یکس کی بے کس کا ہی یہ تو راقا
کس نے بھری موتیوں سے خوشہ گندم کی حبیب مومنوں کو کس نے کھلائی بے غمئے انقلاب

وہ خدا یا تیرے میں تیری نہیں، تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، تیری نہیں (بالجیل)

جو کچھ قرآن نے یہاں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے۔ وہی کچھ دوسرے مقامات پر عام رولت کے متعلق بھی کہا ہے۔ تارون کو قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے غائبہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تارون کی ذہنیت یہ تھی کہ وہ کہتا تھا کہ اِنَّمَا اُوْتِيتُہُ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِی (۲۳) میری تمام دولت میری اپنی ہنرمندی کی وجہ سے ملی ہے۔ تارون کہتا ہے کہ بَلْ هٰی فِتْنَةٌ ۚ وَلٰکِنَ اَلْکَوْرُ هُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۲۴) یہ ذہنیت بڑی غلط تھی اور گمراہی پر مبنی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ انسان کماتا ہے وہ اس کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس میں کتنے ایسے بھی عنصر شامل ہوتے ہیں جن میں انفرادی طور پر اسے کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت، ماحول کے اثرات، معاشرہ کا نظم و نسق، مناسب مواقع OPPORTUNITIES کا ملنا وغیرہ۔

یہ تو رہا اس مسئلہ کا اصولی پہلو۔ جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے۔ قرآن اسے نہایت عمدگی سے حل کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب افراد کی تمام ضروریات زندگی اور ان کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما کیلئے سامان و ذرائع کی فراہمی کی ذمہ داری ملکیت اپنے سر لے لے تو دولت فرد اور ملکیت کا معاہدہ

اس افراد کی ملکیت میں رہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں افراد

اور ملکیت میں ایک معاہدہ ہوتا ہے جسے قرآن نے نہایت مختصر لیکن جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ اِنَّ
 اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنْ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۲۴۱) (انفرادی طور پر)
 اپنی جان اور مال اللہ (یعنی اس ملکیت) کے سپرد کر دیتے ہیں جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے قائم ہوتی
 ہے) اور ملکیت انہیں الجنۃ کی ضمانت دے دیتی ہے۔ الجنۃ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جہاں
 اس دنیا میں جتنی زندگی کا تعلق ہے، اس میں تمام سامانِ زیست اور ضروریاتِ زندگی با فراغت ملتی چلی جاتی ہیں۔
 افراد اور ملکیت کا یہ معاہدہ یونہی ذہنی طور پر نہیں ہوتا بلکہ اس سوسائٹی کا ممبر وہی بن سکتا ہے (بالفاظ دیگر مسلمان
 رہی ہو سکتا ہے) جو رضا و رغبت بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے، اس معاہدہ پر دستخط کرے۔ اس معاہدہ
 کی رو سے، ہر فرد اپنی محنت کے ما حاصل سے اپنے پاس صرف اتنا رکھ سکتا ہے جتنے میں اس کی ضروریات
 پوری ہو جائیں۔ باقی سب نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھنا ہے۔ اور ملکیت کے فیصلے کے مطابق
 صرف کرتا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے یَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (۲۶۴)۔ یہ ترجمہ ہے پوچھتے
 ہیں کہ ہم (اپنی محنت کی کمائی میں سے) کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہو کہ میں قدر پھاری
 ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ اس طرح قرآن، فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی
 کے پاس نہیں رہنے دیتا۔ اور نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی فاضلہ
 دولت پر ہے۔

اس نظام پر یہ سوال سامنے آتا ہے جس کا ربطا ہر کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا اور جسے
 نظامِ سرمایہ داری (CAPITALISTIC SYSTEM) کی تائید میں بطور دلیل حکم پیش کیا جاتا ہے۔
 یہی وہ بھنور ہے جس میں روس کے معاشی نظام کی کشتی بری طرح پھنس رہی ہے اور اسے اس میں سے
 نکالنے کی کوئی تہ سیر دہاں کے اربابِ حل و عقد کے ذہن میں نہیں آتی۔ سوال یہ ہے کہ جب افرادِ معاشرہ
 کو یقین ہو جائے کہ وہ کام کریں یا نہ کریں ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں گی۔
جذبہ محرکہ اولاً نہیں اس کا بھی پتہ ہو کہ وہ کتنا ہی کام کیوں نہ کریں، ان کی ضروریات سے زائد دولت
 ان کے پاس رہ نہیں سکتی۔ تو اول تو وہ کام ہی کیوں کریں۔ اور اگر ان سے کسی طرح کام لیا بھی جائے
 تو وہ پوری محنت سے کام کیوں کریں؟ جس دولت کے متعلق وہ جانتے ہوں کہ ان کے پاس نہیں رہ سکتی
 وہ اس کے حصول کے لئے جان کیوں کھپائیں؟ لہذا اس قسم کے نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ محنت سے

جی چرائیں گے اور ملک کی پیداوار اور قومی دولت روز بروز کم ہوتی چلے گی۔ روس اس وقت اسی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کمیونزم نے غریبوں اور مزدوروں کو یہ کہہ کر انقلاب کے لئے ابھارا کہ تم اٹھو اور دولتمندوں سے ان کی دولت چھین لو۔ لیکن جب یہ مرحلہ گزر گیا اور جن دولتمندوں کے خلاف عوام کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی گئی تھی وہ باقی نہ رہے تو عوام کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب وہاں کوئی جذبہ محرکہ ایسا نہیں ملتا جو عوام کو جانفروشانہ طور پر محنت پر آمادہ کر سکے۔ کمیونزم کی ہی بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے نظام سرمایہ داری کے حامل یہ کہتے ہیں کہ جب تک افراد کو اس لگاتار نہ ہو کہ وہ جو کچھ کمائیں گے ان کی ملکیت میں رہے گا وہ کبھی پوری محنت سے کام نہیں کریں گے، لہذا نظام سرمایہ داری ہی قابل عمل نظام ہے۔ کیونکہ اس میں (PRIVATE ENTERPRISE) کی عام اجازت اور حدود فراموش دوست ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو نظام سرمایہ داری کا یہ کہنا کہ اس میں افراد کی ساری دولت افراد کی ملکیت میں رہتی ہے، قریب اور مراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ کمیونزم محنت کشوں سے زائد دولت براہ راست چھینتی ہے۔ کیپٹل ازم کا نظام زائد دولت مختلف قسم کے TAXES کے ذریعہ کھینچ لیتا ہے۔ استبداد دونوں جگہ کارفرما ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ اشتراکی نظام میں محنت کش اپنی فائدہ کمائی برضا و رغبت اسٹیٹ کے حوالے کرتے ہیں۔ نہ نظام سرمایہ داری میں لوگ بطیب خاطر ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

لہذا سوال یہ ہے کہ وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جس کی رُو سے افراد زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور اپنی فائدہ کمائی برضا و رغبت نظام کے حوالے کر دیں۔ پروڈیوسر (HWTREY) نے کہا ہے کہ جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ جذبہ محرکہ صرف تدرآن سے مل سکتا ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ تدرآن کی رُو سے زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی

جسم کی پرورش کے لئے قانون یہ ہے کہ جسم کی پرورش ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں ایک فرد خود کھانا یا استعمال کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دوسروں کو کھلاتے جائیں اور جسم آپ کا تنومند و توانا ہوتا جائے۔ لیکن اس کے

عکس، انسانی ذات کی نشوونما کے لئے قانون یہ ہے **انسانی ذات کی نشوونما کا قانون** کہ ایک فرد کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے

جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ لہذا جس قدر کوئی فرد دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا جائیگا اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی کا مقصد اپنی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا۔

اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھے گا اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے گا۔ ایسے شخص سے محنت کرانے کے لئے ڈنڈا یا منتر تو ایک طرف کسی وعظ و نصیحت کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ نیز وہ جو کچھ دوسروں کو دے گا اس کے لئے بدلہ یا معاوضہ تو کجا شکریت تک کا بھی خواہاں نہیں ہوگا، کیونکہ

انہیں جو کچھ دیتا ہے خود اپنی ذات کی منفعت کے لئے دیتا ہے۔ ان پر احسان نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جب دوسروں کی پرورش کا انتظام کرتے ہیں تو ان سے کہہ دیتے ہیں اِنَّمَا نَطْعُمُكُمْ لِوَجْهِ

اٰمِلِہِ لَا مُزِیْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَ لَا شُکْرًا ۝ (۳۳)۔ ہم تمہاری پرورش کے لئے جو انتظام کرتے ہیں تو یہ صرف قانون خداوندی کے اتباع میں کرتے ہیں (کہ ایسا کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے)

اس لئے ہم تم سے معاوضہ تو ایک طرف، شکریت تک کے بھی خواہاں نہیں۔ یہ لوگ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ یُوْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ کَانَ بِہُمْ خَصَاصَةٌ ۝ (۳۴)

وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انہیں تنگی ہی میں گزار دے کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مَنْ یُّؤْتِ شَيْئًا نَّفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۳۵)۔ کھیتیاں اپنی کی پڑا پڑھتی ہیں جو مفاد پرستانہ جذبات سے محفوظ رہیں۔

یہ ہے وہ جماعت جو دنیا میں نظام ربوبیت قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ انہی کو عجبت

مؤمنین یا حقیقی معنوں میں مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پوری پوری محنت کرتے ہیں اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ (۳۶)۔ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح پیہم محنت اور مسلسل سعی و کادش سے انہیں جو

ملت ہے، وہ اُس میں سے بعد ضرورت اپنے لئے رکھتے ہیں اور باقی سب مملکت کی تحویل میں دے دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے خدا کی عالمگیر ربوبیت کی عظیم ذمہ داری کو پورا کرے۔ اپنی ضروریات کے تعین میں بھی وہ نہ ہزار سے کام لیتے ہیں۔ نہ تہذیب سے۔ یعنی نہ ضرورت سے زائد خرچ کرتے ہیں نہ بلا ضرورت دولت صنائع کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهُ

ضروریات کا تعین

لَا يُحِبُّ الْمُتَّبِعِينَ ۝ (۱۱۱) خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا اِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (۱۱۲)۔ دولت صنائع کرنے والے شیاطین کے بھائی بند ہیں۔

یہ ہے وہ معاشی نظام جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام میں آپ دیکھئے کہ نہ صرف انسان کا معاشی مسئلہ ہی نہایت اطمینان بخش طریق سے حل ہو جاتا ہے بلکہ انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا بھی خود بخود استیصال ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی ضروریات زندگی خود بخود پوری ہوتی جائیں گی تو کوئی شخص ان ناپسندیدہ کاموں کے لئے تیار نہیں ہوگا جو اسے موجودہ غلط معاشرے میں محض روٹی کی خاطر کرنے پڑتے ہیں اور جب وہ فاضلہ دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا۔ تو اسے بددیانتی۔ چور بازاری۔ نفع خوری۔ سمگلنگ۔ فریب دہی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اُس وقت نہ زمیندار اور کاشتکار کے ہیکڑے ہوں گے نہ مزدور اور کارخانہ دار کے ترازے۔ نہ صاحب جائیداد اور کرایہ دار کے مناقشات ہوں گے نہ گاہک اور دوکاندار کے قہیے۔ اُس وقت نہ تقسیم درآمد کی مقدمہ بازی ہوگی۔ نہ بین دین کی تکا فضیحتی۔ اُس وقت شہر شخص ضروریات زندگی سے بے نیاز ہوگا اور اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف۔

کہہ دیا جائے گا کہ صاحب! حسین خواب (UTOPIA) اور شاعرانہ تخیل ہے۔ اس قسم کا معاشرہ کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آپ

حسین خواب

اس جذبہ کو دل سے نکال نہیں سکتے۔ انسان کبھی ایسے نیک نہیں بن سکتے جیسی ان کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ انسان شروع سے ایسا ہی رہا ہے اور ایسا ہی رہے گا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے۔ انسان بد فطرت نہیں ہے۔ اس کی فطرت کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت، جمادات نباتات و حیوانات کی ہوتی ہے جسے وہ بدل نہیں سکتے۔ انسان کو کچھ بننے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اگر ان صلاحیتوں کی صحیح تربیت کر دو تو وہ اچھا انسان

بن جائے گا۔ ان کی غلط تربیت کرو تو وہ بُرا انسان بن جائے گا۔ ہم غلط معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ اس میں انسانی بچوں کی تعلیم و تربیت غلط خطوط پر کرتے ہیں۔ جب اس قسم کے معاشرے پر دو چار صدیاں گزر جائیں تو ظاہر ہے کہ دراشت اور ماحول کے اثرات سے اس میں اُسی قسم کے انسان پیدا ہونے لگ جائیں گے۔ ہم اس قسم کے خود غرض اور بدنیت انسان پیدا تو خود کرتے ہیں، لیکن رنج و غم بردہ ہونے کے لئے، کہہ دیتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح تصورات زندگی کے مطابق کریں اور اس طرح دو چار نسلوں تک

خواب نہیں حقیقت

کرتے جائیں تو پھر نظر آئے گا کہ ہمارے معاشرے میں کس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نظام ربوبیت کے قیام کے لئے ان افراد کی تعلیم و تربیت نہایت ضروری (بلکہ لازمی) قرار دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس نظام کا قیام عمل میں آتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ ہم اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کے لئے ذہنی فضا کو سادہ بنا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت شروع کر دو۔ جو ان آنے والی نسلوں کا قلب و دماغ صحیح (مستراقی) قالب میں ڈھلتا چلا جائے، اس نظام کو تدریج آگے بڑھاتے جاؤ۔ تاکہ یہ اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے۔

قرآن چونکہ انسانی زندگی کے ہر دور کے لئے راہ نمائی دیتا ہے۔ اس لئے اس نے جہاں اس منزل کا پورا پورا تعارف کرا دیا ہے۔ جہاں پہنچ کر نظام ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے، وہاں اس نے اس عبوری دور (TRANSITORY PERIOD) سے متعلق بھی احکامات و ضوابط دیدیئے ہیں جس سے گذر کر یہ تدریج آخری منزل تک پہنچتا ہے۔ اس عبوری دور کے احکام و قوانین بھی ایسے ہیں جو معاشرہ کو رفتہ رفتہ آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں خیرات و صدقات کی ترغیب، بخل اور حرص کی مذمت، ربوہ کی ممانعت، زراعت و زری کی مخالفت، دراشت کے احکام، سب اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔ کہیں اس کا ارشاد ہے کہ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹۰)۔ جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے، تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ اور کہیں وہ کہتا ہے کہ ہمارے

عبوری دور کے احکام

عبوری دور کے احکام و قوانین بھی ایسے ہیں جو معاشرہ کو رفتہ رفتہ آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں خیرات و صدقات کی ترغیب، بخل اور حرص کی مذمت، ربوہ کی ممانعت، زراعت و زری کی مخالفت، دراشت کے احکام، سب اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔ کہیں اس کا ارشاد ہے کہ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹۰)۔ جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے، تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ اور کہیں وہ کہتا ہے کہ ہمارے

الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَ اللَّهُ يَخْكُمُ لَہٗ مُعَقَّبٌ حُكْمُہٗ وَ هُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ (۳۳)۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح زمین کو اس کے بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان معاملات کے فیصلے خدا (کائناتوں) کرتا ہے۔ اس کے فیصلے (کو روکنا تو ایک طرف اس پر نظر ثانی کرنے کا بھی کسی کو اختیار حاصل نہیں۔ وہ بہت جلد حسا کرنے والا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کا ”بہت جلد حساب کرنا“ بھی ہمارے حساب و شمار سے سینکڑوں برس لے لیتا ہے۔ لیکن اگر انسان چاہے کہ خدا کا یہ قانون ہمارے حساب و شمار سے مطابق نتائج مرتب کرے، تو اس کا طریق یہ ہے کہ انسان اس قانون کے ساتھ تعاون کرے اور اسے آگے بڑھانے کے لئے اس کا دست دباؤ دین جائے۔ انسان اگر اس طرح خدا کے قانون کی مدد کرے گا تو اس کا قانون خود انسان کا محدود معاون بن جائے گا۔ اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (۳۴) کے یہی معنی ہیں۔ اس طرح غلط نظام کی صفیں دنوں میں اُلٹ جائیں گی۔ اور اس کی جگہ صحیح نظام کی باٹ بچھتی چلی جائے گی۔ نبی اکرمؐ اور حضورؑ کے رفتار (رفتہ) کی جماعت نے یہی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند دنوں کے اندر ایک ایسا عظیم العقول انقلاب برپا ہو گیا جس کی مثال چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی اور جس کے سبب و علل معلوم اور متعین کرنے کے سلسلہ میں دنیا بھر کے مؤرخ آج تک انگشت بندھاں ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اس قانون کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسی نظام زندگی کو اختیار کر لیا جسے شانے کے لئے قرآن آیا تھا تو خدا کا کائناتی قانون پھر اپنی رفتار سے چلنے لگ گیا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری تھا۔ آپ اس ہزار سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے اور دیکھنے کے کس طرح

دُنیا از خود ادھر آرہی ہے | انسان اپنے ناکام تجارت کے بعد رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر قرآنی نظام زندگی کے مختلف اجزاء کو اپنالے چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کی رفتار ہر حال سے میری کوشش یہ ہے کہ ہم اس خطہ زمین میں، جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ ہم اپنا اسلام کا صحیح نظام قائم کریں۔ خدا کے کائناتی قانون کی رفتار کا فریضہ سرانجام دیں تاکہ اس کے نتائج ہمارے حساب و شمار سے برآمد ہونے شروع ہو جائیں۔ اس کا پہلا قدم یہ تھا

میری کوشش | اس میں منکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ قرآن کا جو تصور زندگی اپنے عرصے سے نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے وہ پھر ہمارے سامنے آجائے بشکلیں پاکستان کے بعد میں

اپنی تمام مساعی کو اسی نقطہ پر مرکوز کر رکھا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے نتائجِ برسرے حوصلہ افزا ہیں۔ اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ پاکستان کا مجوزہ آئین انہی خطوط کے مطابق مرتب ہو جائے اور اس طرح کاروانِ مکت اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے جو اسے قدمِ قدمِ استراحتی نظامِ ربوبیت کی آخری منزل تک لیجائے اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھئے گا کہ غلط نظامِ بنائے زندگی کا ستایا ہوا انسان کس طرح کشاکشوں میں آئے گا نظامِ کے حیات پر ورسایہ عاطفت میں پناہ لینے کے لئے آتا ہے اور کس طرح پھر یٰ خَلْقُ فِی دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۱)۔ کاکیت اور منظرِ عجیب بالیدگیِ قلب و نظر ہو جائے۔ وَ اَشْرَقَتْ الْاَمْصُورُ بِمُؤَدِّ رَہْطَہَا (۲)۔ (زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی) کی بشارت کس طرح ایک زندہ شہادت بن کر سامنے آ جاتی ہے۔

جو لوگ قرآن کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں؛ کیا ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کوشش کریں کہ آئینِ پاکستان اس نظامِ کامنظہر ہو اور ملکیتِ پاکستان تمام افرادِ معاشرہ کو اس کی نعمت دے کہ

مَنْ سَرَّزُ شُکْرٍ وَ اِیَّاهُ حُرِّ (۳)۔

ہم تمہارے رفیق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رفیق بھی۔



استفسارات

تقریر کے بعد سامعین کی طرف سے کچھ سوالات کئے گئے جن کے وہیں جواب دیئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ سوال ہم بھوک کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی تصور نہیں تو پھر ہم بلا تصور عذابِ خداوندی میں مبتلا کیوں کر دیئے گئے ہیں؟

جواب اجتماعی جرائم اور ان کے نتائج کا سلسلہ انفرادی غلطیوں کی پاداش سے مختلف ہے۔ ایک قوم غلط نظام قائم کرتی ہے یا غلط روش اختیار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذلت اور پستی، بھوک اور افلاس کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ عذاب آئندہ نسلوں تک برابر جاری

رہتا ہے۔ یعنی اس قوم کی ہر نسل شروع ہی سے بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔ یہ نسل کی پیش رو نسلوں کے اجتماعی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جسے اس نسل کو بھگتنا پڑے گا۔ بعینہ جس طرح اگر کسی قوم کی ایک نسل اچھے کام کرتی ہے تو وہ قوم خوش حال ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کی آنے والی نسلیں خوش حال پیدا ہوتی ہیں۔ انفرادی طور پر سمجھنا ہو تو یوں سمجھئے کہ تندرست ماں باپ کا بچہ پیدائشی طور پر تندرست ہوتا ہے اور جس بچے کے والدین کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوں اُسے وہ مرض پیدائش کے ساتھ وراثت میں مل جاتا ہے اور عمر بھر اس کا دکھ سہتا رہتا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس کے لئے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ہماری سابقہ نسلوں نے غلطی کی اور اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ ہم نے تشکیل پاکستان کے بعد خود غلط نظام قائم کیا اور ہم سے ملتی جڑی جراثیم بھی مسلسل سرزد ہوتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ لہذا ہمارے قحطے میں تو یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ہم بلا تصور عذاب خداوندی میں مبتلا ہیں۔ البتہ اگر ہم نے اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی نہ کی تو ہماری آنے والی نسلیں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ ہم اپنے اسلاف کے جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں۔

یہ سبہ اجتماعی جرائم کا فلسفہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی رُوسے، ”قومیں“ جہنم میں داخل ہوتی ہیں (دیکھئے سورہ اعراف۔ آیت ۴۳)۔

۲۔ سوال یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی سابقہ نسلوں کے جرائم کی پاداش میں بھوک کے عذاب میں گرفتار ہیں لیکن اس سے ہمارا کیا عاقبت کیوں خراب ہو؟

جواب اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر مطمئن رہیں اور اس عذاب سے بچنے کی کوشش نہ کی تو ہمارے اس جرم کی پاداش میں ہماری عاقبت خراب ہوگی۔ لیکن اگر ہم نے یہاں مجمع نظام قائم کرنے کی کوشش کی تو پھر ہماری عاقبت خراب نہیں ہوگی۔ خواہ یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو جائے یا اس کے بعد۔ اگر نظام ہماری زندگی میں قائم ہو گیا تو ہماری یہ زندگی بھی خوش حال ہو جائے گی اور اگلی زندگی بھی سرسبز و شاداب۔ لیکن اگر یہ نظام ہمارے بعد قائم ہوا تو ہم بے شک عسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے مرجائیں گے لیکن ہماری اگلی زندگی شاداب ہوگی۔ اور ہماری آنے والی نسل کی زندگی خوش حال۔ اگر انھوں نے اس نظام کے ہتھکام کے لئے کوشش کی تو اس دنیا کی خوش حالی کے ساتھ ان کی آخری زندگی بھی شاد کام ہوگی۔ لیکن اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ان کی موجودہ زندگی تو آسانی سے گزر جائے گی لیکن آخرت تباہ ہو جائے گی۔

۳۔ سوال آپ نے کہا ہے کہ جس قوم کی دنیاوی زندگی عسرت اور بد حالی کی ہوتی ہے۔ اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی میں گذرتی ہے اس کی آخرت بھی سنور جاتی ہے۔ اقوام مغرب کی موجودہ زندگی بڑے عیش و آرام میں گذرتی ہے کیا وہ آخرت میں بھی اسی طرح عیش کریں گے؟

جواب آپ نے مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے میں غفلت کی ہے۔ صورت یہ ہے کہ اس دنیا کی رزق کی کثرت خدا کے طبعی قوانین سے وابستہ ہے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق تسخیرِ فطرت کرے گی اس کی زندگی خوش حالی میں گذرے گی۔ وہ قوم مسلم ہو یا غیر مسلم۔ قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں خدا کسی میں تفریق نہیں کرتا ﴿لَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ رِزْقًا وَهُوَ غَافِلٌ عَنْ رِزْقِ رَبِّهِ﴾ جو چیزیں خدا نے نوع انسانی کی پرورش کے لئے مفت عطا کی ہیں۔ یعنی سانا رزق۔ وہ زمین کے دسترخوان پر رکھی پٹری ہیں جس کا جی چاہے ہاتھ بڑھا کر اٹھالے۔ جو قوم ان کے حاصل کرنے میں جس قدر محنت کرے گی۔ اسے اسی قدر مل جائے گا۔ یہ نہیں کہ خدا نے غیر مسلموں کے رستے میں بند لگا دی ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس دنیا کی متاع ہر قوم کو باندازہ سعی و عمل مل جاتی ہے۔ لہذا اگر کوئی غیر مسلم قوم اس کے لئے محنت کرتی ہے تو اسے دنیا میں خوش حالی نصیب ہو جاتی ہے۔ جماعت مومنین کی زندگی کے ہر شعبہ میں قوانین خداوندی کا اتباع کرتی ہے اس لئے اس کی دنیاوی زندگی یقیناً سر فرازی اور سر بلندی کی زندگی ہوتی ہے اور چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی نہیں بلکہ وہ موت کے بعد بھی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے اس کی آخری زندگی بھی تابناک ہوتی ہے۔

جو غیر مسلم قوم دنیاوی متاعِ زمیست کے لئے کوشش کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی خوش حال ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ زندگی کو اس دنیا تک محدود سمجھتی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق قوانین خداوندی پر یقین نہیں رکھتی اس لئے اس کی آخری زندگی ناکام رہتی ہے۔ اقوام مغرب کی یہی حالت ہے۔ لیکن جو قوم بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے اس کی دنیاوی زندگی بھی غلامی میں گذرتی ہے اور آخری زندگی بھی عذاب میں۔ ہم (بد قسمتی سے) اسی شق میں آتے ہیں۔

۴۔ سوال کیا اسلامی ملکیت کے نظام دلبوبیت میں غیر مسلموں کا بھی حصہ ہوگا؟

۴۔ سوال

پاکستان میں قرآنی نظام ربوبیت کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب

سب سے پہلے اس نکر کو عام کرنا چاہیئے کہ دین کا مقصود اس نظام کا قیام ہے اور اسلامی مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس نکر کے عام کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے نئے آئین میں یہ بات درج ہو جائے کہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات اور ان کی ذات کی نشوونما کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرنا مملکت کی ذمہ داری ہے۔ جب مملکت اس فریضہ کو اپنے ذمہ لے لے گی تو اس نظام کا قیام عمل میں آجائے گا۔ اس کے لئے دقت ضرور گئے گا۔ آئین میں اس نکر کے شامل ہو جانے سے ہماری منزل کا تعین تو ہو جائے گا۔ آپ اس نکر کے عام کرنے میں جس قدر کوشش کریں گے، اُسی قدر اس نظام کے قیام کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے۔



(اکتوبر ۱۹۵۹ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ملکیت زمین

قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں (بلکہ تمام ذی حیات) کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی (بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے) ان اسباب و ذرائع کو بھی پیدا کر دیا جن پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ پانی، ہوا، روشنی، حرارت۔ اور زمین جس سے خوراک حاصل ہوتی ہے۔

(۲) حیوانات (یا یوں کہئے کہ انسان کے علاوہ دیگر ذی حیات) چونکہ تمدنی زندگی بسر نہیں کرتے اس لئے ان کے لئے کسی ایسے خارجی نظام کی ضرورت نہ تھی جو ان اسباب و ذرائع زیست (یعنی رزق کے حشرچمول) کا انتظام اس انداز سے کرے کہ ان سے ان سب کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ لیکن انسان کو تمدنی زندگی بسر کرنا تھی اس لئے اس کی صورت میں ایسے نظام کی ضرورت تھی۔ اس نظام کو ملکیت کہتے ہیں۔ چنانچہ اس ملکیت کا بنیادی فریضہ یہ مترادف دیا گیا کہ وہ زمین کا انتظام اس انداز سے کرے کہ اس سے تمام افراد انسانہ کی بنیادی ضروریات زندگی اطمینان اور سکون سے پوری ہوتی رہیں۔ اس مقصد کیلئے زمین، اسلامی ملکیت کے کنٹرول میں رہتی ہے۔ اب یہ اسلامی ملکیت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، ایسا انتظام کرے جس سے زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور اس پیداوار کی تقسیم اس انداز سے ہو کہ کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ یہ ہے مترادف کریم کی رو سے زمین کی پوزیشن۔ ظاہر ہے کہ اس میں زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۱) تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی۔۔۔ اسی سلسلہ میں اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ عہد رسالت کا دور خلافت راشدہ میں زمین کے انتظام کی شکل کیا تھی۔ اسی سلسلہ میں چند ایک بنیادی حقائق کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) یہ ہمارا ایمان ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ کی زندگی نثران کریم کے مطابق بسر ہوتی تھی اس لئے جو نظام انہوں نے قائم کیا تھا وہ لا محالہ نثران کی تعلیم کے مطابق ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ نثران کی منشاء کے خلاف اپنا انتظام قائم کرتے۔

(۲) اُس عہد کی تاریخ اُس زمانے میں مرتب نہیں ہوئی۔ یہ تاریخ اُس زمانے سے دو تین سو سال بعد اُس طرح مرتب ہوئی کہ اس کے لئے کوئی تحریری مواد موجود نہیں تھا۔ اس کا تمام انحصار صرف نبائی روایات پر تھا جو لوگوں میں عام طور پر چلی آرہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے مرتب شدہ تاریخ میں صحیح اور غلط ہر قسم کی باتیں درج ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک عہد محمد رسول اللہ والذین معہ کا تعلق ہے یہ پرکھنے کے لئے کہ اس (تاریخ) میں کون سی بات صحیح اور کون سی غلط ہے، ایک ہی معیار قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں جو بات نثران کریم کی تعلیم کے خلاف ہو، اس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ صحیح نہیں۔

(۳) اسلام کی اولیں مملکت جس سرزمین میں قائم ہوئی تھی (یعنی عرب کا ملک) وہ عام طور پر غیری زرع تھا۔ یعنی اس کی معیشت زرعی نہیں تھی۔ اس لئے اس مملکت نے زرعی معیشت کے متعلق کوئی ایسا جامع و مانع نظام متعین نہیں کیا تھا جو دنیا کے موجودہ حالات پر مبنی و عمن منطبق ہو سکے۔ اس میں زرعی نظام کے سرسری اور ابتدائی خطہ و حال ہی مل سکتے ہیں۔

(۴) اسلامی مملکت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظام کے مختلف شعبوں کی ابتدا اس ماحول کے تقاضوں کے مطابق کرتی ہے جس میں وہ جنم لیتی ہے اور پھر اس کے بعد بتدریج اس نظام کو منہجی و تائیدی بنا دیتا ہے۔ یہی انداز ہمارے قرن اول کی اسلامی مملکت نے اختیار کیا تھا۔ لیکن ہماری تاریخ میں رجحانی کچھ بھی وہ ہے (واقعات کے ریکارڈ کرنے میں) اس امر کا التزام نہیں کیا گیا کہ جس ترتیب سے وہ رونما ہوئے تھے۔ اسی ترتیب سے وہ درج کئے گئے ہوں۔ یہ واقعات گڈ ٹڈ شدہ شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر اکثر اوقات متضاد باتیں تاریخ میں لکھی ملتی ہیں اور ان میں شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ ان میں سے کسے قبول اور کسے مسترد کرے۔ انہی سے ایک ہی مسئلہ کے موافق اور مخالف سندیں پیش کر دی جاتی ہیں۔ اگر یہ واقعات اُسی ترتیب سے مذکور ہوتے جن کے مطابق یہ رونما ہوئے تھے تو واضح ہو جاتا کہ اس

اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ وہ مملکت، ہر شعبہ زندگی میں اپنے نظام کو بتدریج آگے لے جا رہی تھی۔ اس تدریج میں اس کا قدم، وسترآن کے مقرر کردہ اصولوں سے تو ادھر ادھر نہیں ہوتا تھا لیکن ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جاتا تھا اس کی مختلف کڑیوں میں جزئی فرق ناگزیر تھا۔ ہمارے لئے غیر متبادل وہ اصول ہیں جو وسترآن کریم میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ ہم ان اصولوں کو اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں، اپنے طریقوں کے مطابق بروئے کار لائیں گے۔ یاد رکھئے۔ کاروان انسانیت کے لئے وہ منزل غیر متبادل ہے جسے وسترآن نے متعین کیا ہے۔ ذرائع و طرق سفر غیر متبادل نہیں۔ بسا اگر تاریخ سے یہ معلوم بھی ہو جائے کہ کسی زمانے میں وسترآن کے اصولوں پر عمل کس طریق سے ہوا تھا تو یہ چیز میں صرت تاریخی فائدہ دے گی۔

(۵) زمین کے انتظام کے سلسلہ میں، قرن اول کی اسلامی مملکت نے کیا طریق کار اختیار کیا تھا، تاریخ میں اس کے متعلق جو کچھ ملتا ہے اسے آئندہ دو عنوانات میں سامنے لایا گیا ہے۔ آپ ان کا مطالعہ اس مہم کی روشنی میں کریں۔



زمینداری اور جاگیرداری

(شائع شدہ اپریل ۱۹۵۷ء)

قرآن کریم کی رو سے اگر دیکھا جائے تو یہ امر نہایت وضاحت کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے کہ اسلام میں مروجہ زمینداری و جاگیرداری نظام کے لئے قطعاً کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہم سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا تصور بھی موجود ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ نیز اس امر کو بھی دیکھنا ہو گا کہ اسلام انفرادی ملکیت کو جائز رکھتا ہے تو بلا تخصیص و تحدید ہر قسم کی چیزوں میں اس کو جائز رکھتا ہے یا اس ضمن میں کچھ حدود و قیود عائد کرتا ہے۔ اس میں کچھ مستثنیات تو نہیں ہیں۔ قرآن کی ہدایت اس باب میں کس قدر واضح ہیں سہرست ہم اس سے بحث نہیں کریں گے کیونکہ قرآن کی رو سے اسلام کا نظام رو بہ بیت کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک تفصیلی تعریف محترم پروفیسر صاحب کے زیر ترتیب ہے جس سے اس کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آ جائیں گے۔ اس فرصت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم سے پہلے ان حضرات اس موضوع پر کیا کچھ لکھ چکے ہیں اور ان کے نتائج و فکر اس باب میں کیا ہیں؟

اس موضوع پر ہم سب سے پہلے مصر کے شہر زغفر علامہ سید قطبؒ کا خیال پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب العدل الاجتماعی فی الاسلام میں بیان کیا ہے۔ ان کی اس بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

اس کتاب شائع ہو کر میت مقبول ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہ اب مروج ہو چکے ہیں۔

”یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بعض اموال میں انفرادی ملکیت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے مگر اس کے لئے کچھ حدود اور قیود عامہ کی ہیں ساتھ ہی کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن کے لئے اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے ان کی حیثیت بھی عینی ملکیت کی ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو فرد کی حیثیت ان اموال میں بھی جماعت کی طرف سے یک گونہ دیکل کی سی ہے۔ ورنہ مال علی العموم جماعت ہی کی ملکیت میں داخل ہے اور جماعت بھی دراصل حقیقی مالک نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے نیا جبہ اس میں تصرفات کرنے کا حق رکھتی ہے ورنہ ہر چیز کا مالک حقیقی سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔

قرآن کریم وضاحت کے ساتھ اس اصل عظیم کو واضح کر دیتا ہے۔ چنانچہ سورہ حدید میں ہے۔
 اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَحْسِنٰلَیْنِ فِیْهِ (۵۶)
 اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جن اموال میں اس نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے ان کو مصالح عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

اس آیت میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ جو معنی ہم نے اس سے سمجھے ہیں اس کے لئے یہ نص صریح ہے کہ انسان کے ہاتھ میں جو اموال ہیں وہ دراصل خدا کے اموال ہیں اور انسان ان اموال میں دیکل ہے، اصل نہیں ہے ایسے ہی سورہ نور میں جہاں مکاتبتین (وہ غلام جو مکاتبت کر کے آزادی حاصل کرنا چاہیں) کی امداد و اعانت کا حکم دیا گیا ہے وہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَ اَقْوَامٌ مِّنْ مَّثَالِ اللّٰهِ الَّذِیْ اَشْكُرُّ (۲۳۱)

اور ان مکاتبتین کو خدا کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے۔

یہاں دیکھئے کہ مالدار لوگ ان مکاتبتین کو اپنا مال نہیں دیتے ہیں بلکہ اللہ کا مال دیتے ہیں۔ دینے والے شخص درمیان کا واسطہ بنتے ہیں۔ تیسری آیت جو سورہ نحل کی ہے وہ ان سے بھی زیادہ صریح ہے۔

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِیْ الرِّزْقِ ۚ فَاَ الَّذِیْنَ فَضَّلْنَا
 سَرَادِقِیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ۚ اَخْبِئْ عَمَّا
 اَللّٰهُ یَخْضَعُ لَدُوْنِ ۝ (۱۶)

خدا نے تمہیں رزق کے ضمن میں بعض کو بعض سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔ لہذا جو لوگ رزق مال کما سکتے ہیں وہ زائد مال کو اپنے زیر دستوں کی طرف کیوں نہیں لے جاتے کیونکہ یہ مال انہی کا

ہے۔ یہ لوگ ایساں خیال سے نہیں کرتے کہ اس طرح برابر ہو جائیں گے ایسا خیال کرنے میں وہ خدا کی نعمت سے انکار کرنا چاہتے ہیں؟

یہاں قرآن کریم نے یہ چیز ثابت کر دی ہے۔ کہ دولت مند لوگ اپنے ہاتھ کے نیچے کے لوگوں کو جو کچھ دیتے ہیں وہ دراصل ان مالداروں کے مال کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جو وہ ان ضرورتمندوں کو دیتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ دراصل خود ان کا اہلی حق ہوتا ہے جسے یہ لوگ پورا کرتے ہیں کیونکہ اس مال میں وہ اور یہ سب برابر ہیں۔ ان میں سے ہرگز وہ دوسرے کے مثل حقدار ہے کیونکہ مال کا سرچشمہ ایک ہی ہے جو کچھ یہ لوگ لیتے ہیں یہ ان کا حق ایسا ہی ہے جیسے ان لوگوں کا جو دیتے ہیں اس کے بعد سوال انکاری ہے کہ کیا یہ لوگ خدا کی نعمت کا انکار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ مال جو ان کے قبضہ میں ہے درحقیقت ان کی اپنی ملکیت تو نہیں ہے بلکہ خدا کا فضل و انعام ہی تو ہے۔

اس سے بھی زیادہ صریح قرآن کا وہ حکم ہے جو سورہ نسا میں موجود ہے جس سے انفرادی ملکیت کی حقیقت بالکل ہی واضح ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ملکیت کتے کسے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد تصرف اور انتفاع کی ملکیت ہی ہے۔ اگر کسی کو کسی مال میں تصرف اور انتفاع کا حق نہیں تو وہ اس کا مالک نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم ہر فرد کو اپنے اموال میں تصرف کا حق نہیں دیتا بلکہ اس کے لئے غفلت تصرف کی شرط عام کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص تصرفات میں حماقت و سفاہت کا ثبوت بہم پہنچا لے تو وہ یا جماعت اس کے حق تصرف کو واپس لے سکتی ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا
وَارْزُقُوا هُمْ مِنْهَا وَاكْسُوهُمْ وَ قُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا (۲)

اور سفیہ لوگوں کو تم اپنے اموال نہ دو جنہیں خدا نے تمہارے لئے قیام کا باعث بنایا ہے بلکہ اس میں انہیں کھانے پینے کے بعد رہی دو۔

اس آیت میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ تصرف کا حق ان کو ہی وقت مل سکتا ہے جبکہ وہ ہوش و خرد کے

لے یہاں اَمْوَالُكُمْ کا لفظ مزید دعوت فکر دے رہا ہے۔ سفیہ کے اموال کو قرآن ان کے اموال قرار نہیں دیتا بلکہ (اموالکم) جماعت کے اموال قرار دیتا ہے۔

ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر کسی مالک میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو ملکیت کے طبعی ثمرات یعنی حقوق تصرف و توفیق ہو جاتے ہیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جس شخص کا کوئی بھی وارث نہ ہو تو امام ہی اس کا وارث ہوتا ہے یعنی وہ جماعت کا مال ہے جس پر فرد کو قبضہ حاصل تھا۔ جب اس کے بعد وہ منقطع ہو جاتا ہے تو مال اپنے اصلی سرچشمہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہ چیز واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ فرد کے اندر یہ شعور ہی کہ وہ اس مال میں جو دراصل جماعت کی ملکیت ہے محض جماعت کی طرف سے نائب یا ذکیل ہے۔ ان فرائض کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے جو ایک نظام اس کے ذمے عائد کرتا ہے اور ان قیود کو منوا سکتا ہے جس سے وہ اس کے تصرفات میں حد بندیاں لگا سکتا ہے۔ ساتھ ہی جماعت کا یہ شعور کہ وہی اس مال کی اصلی مالک ہے، جماعت کو فرائض عائد کرنے اور حدود قائم کرنے کی جرات دلا سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں عینی ملکیت کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں بلکہ بعض اموال میں تو درحقیقت اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زمین کو لے لیجئے۔ عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی انسان خود زمین کا مالک ہو سکتا ہے۔ انسان دراصل اس کی پیداوار اور غلہ کا مالک ہوتا ہے نہ کہ خود زمین کا۔ تو اعتبار محض انتفاع کا ہے۔ نہ کہ عینی ملکیت کا۔

اس کے بعد ایک اور بنیادی مسئلہ پر بھی غور فرمائیے کہ اسلام مال سے انتفاع کے لئے بھی اس کا وادائے نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے ایک خاص گروہ میں قید ہو کر رہ جائے کہ ہر بھر کر انہیں میں گھومتا رہے اور دوسرے لوگ اس کو نہ پاسکیں۔ سورہ حشر کی اس آیت پر غور فرمائیے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۵۹)

تاکہ مال غنم میں سے صرف دو لقمہ دوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اس نص کے ساتھ ایک واقعہ متعلق ہے جسے سمجھ لینے سے آیت کو سمجھ لینے میں ہمیں سہولت ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مکہ مکرمہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہاجرین نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ جو تنگ دست تھے وہ اپنے ساتھ کیا مال لے کر آتے لیکن جو دولت مند تھے وہ بھی اپنا مال ساتھ نہیں لے سکے۔ لہذا دوسرے تنگ دستوں کی طرح یہ بھی تنگ دست ہی تھے۔ انصاف نے امتہانی سخاوت کا مظاہر کیا اور اس بخل سے اپنے آپ کو بلند کر کے دکھا دیا جو انسانی نفس میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے ان ہاجرین کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کئے اور ہر اس چیز میں جو ان کی ملکیت میں تھی ان کو برابر کا شریک کر لیا، حتیٰ کہ

مخصوص ترین اشیاء تک میں بھی۔ یہ سب کچھ انہوں نے کسی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ نہایت خوش دلی اور سبراخ و صلگی کے ساتھ کیا۔ سورہ ہشر میں ہے۔

يُجْبُونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً
مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ

جو لوگ ان کی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں انصار ان سے محبت کرتے ہیں اور جو اموال ان کو دئے گئے ہیں ان کو مہاجرین کے حوالہ کر دینے سے اپنے سینوں میں تنگی محسوس نہیں کرتے، بلکہ اپنی غرر کو پران کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ درحقیقت وہ خود ان چیزوں کے انتہائی محتاج ہیں۔

صحیح اعتقاد انسان کو کیلئے کیا بنادیتا ہے حضرات انصار رضی اللہ عنہم اجمیع ان کا ایک کامیاب نمونہ تھے۔

مگر مدینہ منورہ کے مالداروں اور فقراء مہاجرین میں پھر بھی عدم توازن کی ایک خلیج حائل تھی۔ نبی صلعم انصار کی سخاوت اور دیادگی کو دیکھ رہے تھے لہذا آپ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ جو کچھ وہ خود ہی کر رہے ہیں اس سے زیادہ کا ان سے مطالبہ کریں۔ تاآنکہ واقعہ بنی نضیر پیش آیا جس میں جنگ نہیں ہوئی۔ اس کا تمام فائدہ اللہ اور رسول (مرکز ملت) کی ملکیت قرار پایا۔ اس وقت حضورؐ کی رائے ہوئی کہ مسلمانوں کی جماعت میں مالی اعتبار سے کسی قدر توازن قائم کر دیں چنانچہ بنی نضیر کا تمام فائدہ خصوصیت کے ساتھ مہاجرین ہی کو عطا کیا گیا۔ انصار میں سے فقط دو آدمی تھے جنہیں اس میں حصہ دیا گیا تھا کیونکہ وہ دونوں ذاتی ضرورت مند تھے۔ واقعہ کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِلَّذِينَ
انْفَرَوْا مِنَ الْبَيْتِ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ كُنْ لَا يَكُونَ دُولَةً
بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَا التَّكْوِينُ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۚ
لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يُنْفِقُونَ
فَضْلًا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ وَيَصْطَرُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ
الصُّدُوقُونَ ۝ (۵۹)

مختلف آبادیوں کے جو اموال بطور فے کے حاصل ہوں وہ صرف اللہ اور رسول (مرکز ملت) اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہیں۔ یہ حکم اس لئے ہے تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے (بلکہ معاشرہ میں مالی توازن قائم رہے) لہذا رسول جو کچھ تمہیں دیدے وہ لے لو، جو نہ دے اس سے باز رہو اور تقویٰ شعار بنو۔ (یاد رکھو خدا کا عذاب (نافرانوں کے لئے) بڑا ہی سخت ہے۔ یہ اموال فے صرف ان ضرورت مند ہاجرین کے لئے ہیں جن کو اپنے شہروں اور اموال و دولت سے بے دخل کر کے نکال دیا گیا ہے۔ وہ خدا کے فضل و رضا کے طالب اور خدا کے دین اور رسول کے (مشن کے) مددگار ہیں۔ یہی لوگ اپنے دعوئے ایمان میں سچے ہیں۔

رسول اللہ صلعم کا اموال بنی نصیر میں یہ تصرف کہ انہیں صرف ہاجرین ہی میں تقسیم کرنا۔ قرآن کی طرف سے اس تصرف کی تصدیق و تائید اور پھر اس کی علت بیان کرنا کہ ایسا اس لئے ہے تاکہ دولت صرف چند دولت مند ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے کہ صرف ان کے درمیان ہی گردش کرتی رہے۔ مسئلہ کی حقیقت کو بالکل واضح کرتا ہے جس کے مزید بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے صراحت یہ اصول مستنبط ہو جاتا ہے کہ اسلام بنیاداً طور پر اس کے خلاف ہے کہ دولت جماعت کے اندر چند ہاتھوں میں محبوس ہو کر رہ جائے اس کے برعکس اسلام کا منشا یہ ہے کہ جماعت کے مختلف اوضاع میں ایک قسم کا ایسا اعتدال پیدا کر دے کہ ملت میں مکمل توازن قائم رہے اور دولت صرف دولت مند لوگوں ہی میں گردش نہ کرتی رہے کیونکہ ایک جہت میں مال و دولت کے انبار جمع ہو جانا اور دوسری جہت سے بالکل سمٹ جانا بہت بڑے اجتماعی مفسد کا باعث بن جاتا ہے جس سے جماعت کے مختلف طبقات میں حسد، کینہ، اور بغض و عناد کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن سے مفاو عام وابستہ ہوتا ہے اور افراد کے لئے ان کو کسی جہت سے بھی اپنے لئے مخصوص کر لینا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے اس قسم کی تین چیزوں کی تصریح فرمادی ہے۔ یعنی پانی۔ چارہ۔ اور آگ۔

الناس شركاء في ثلث، الماء، والكلا والنار

تمام لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی، چارہ، اور آگ۔

چونکہ عرب کے قدیم تمدن میں یہ تین چیزیں حیات اجتماعی کی ضروریات ہیں شمار ہوتی تھیں لہذا ان تین چیزوں سے تنہا حاصل کرنا پوری جماعت کا حق شمار کیا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اجتماعی حیات کی ضروریات نہ ہر تمدن میں یکساں ہوتی ہیں نہ ہر زمانہ میں۔ قیاس، جو تشریح اسلامی کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اس کی گنجائش رکھتا ہے کہ جو چیزیں بھی اس حکم میں داخل ہوں وہ تطبیق کے تحت اس میں شامل کر لی جائیں۔

لہذا اسلام میں انفرادی ملکیت کی طبعی حقیقت کا خلاصہ یہ قانون نکلتا ہے کہ مال عموماً جماعت کی ملکیت ہے اور انفرادی قبضہ مالکانہ نہیں بلکہ محض وکالت ہے جس کے لئے بہت سی شرطیں اور قیود ہیں۔ نیز بعض اموال کا شمار اموال عامہ میں ہو گا جن پر کسی شخص کی انفرادی تحویل بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان انفرادی تحویل کا بھی ایک حصہ ایسا ہے جو جماعت کا حق ہے اور جماعت اس حصہ کو افراد سے واپس لے کر ان طبقات پر خرچ کر دیتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہوتا کہ وہ اپنی حالت کو درست کر سکیں اور ان کی حالت کی درستگی سے جماعت کی مجموعی حالت درست ہو سکے۔

(یہ ہے خلاصہ علامہ قطب کی بحث کا)

—————

مذکورہ بالا بحث سے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں انہیں ایک مرتبہ پھر دہرایمے تاکہ آگے بڑھنے میں آسانی ہو۔

- (۱) اسلام نے اموال پر انفرادی ملکیت کے حق کو عینی ملکیت کی حیثیت سے قطعاً تسلیم نہیں کیا۔
- (۲) جو اموال انفرادی تحویل میں ہوں ان پر افراد کو کالتی حیثیت سے تصرف کا حق رکھتے ہیں ورنہ وہ سب جماعت کی ملکیت ہوتے ہیں۔
- (۳) اموال کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جن پر وکالتی تحویل کا حق تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

(ب) جن پر یہ حق بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) جو اموال ایسے ہوں کہ ان سے مفاد عام وابستہ ہوں ان پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اب سے چودہ سو سال پہلے عرب کے قدیم تمدن میں حضور اکرم صلعم نے اس ضمن میں تین چیزیں۔

(پانی۔ چارہ۔ آگ) کی تعیین و تخصیص فرمادی تھی۔

(۵) اجتماعی حیات کی ضروریات تمام تمدنوں اور تمام زمانوں میں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ ان تین چیزوں پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہ کرنے کی علت چونکہ ان سے مفاد عام کا وابستہ ہونا ہے لہذا قیاس کو کام میں لاتے ہوئے اگر کسی دوسرے تمدن یا کسی دوسرے زمانے میں کچھ اور چیزیں ایسی ہوں جن سے جماعت عام کا مفاد وابستہ ہو تو ان کو بھی قیاساً اسی ذیل میں شامل کیا جائے گا۔

اس تہید کے بعد کیجئے ہم دیکھیں کہ زمین کے متعلق عہد رسالت مآبؐ اور خلافت راشدہ میں کیفیت کیا تھی۔

عہد رسالت و خلفائے راشدین

زمین کی حیثیت

جیسا کہ معلوم ہے اسلامی نظام کی پہلی تجربہ گاہ سرزمین عرب تھی۔ اگر ہم اس کو اور مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ منورہ کی سرزمین تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب کی سرزمین زیادہ تر سنگلاخوں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے۔ باغ کی قلت۔ بلکہ میلوں تک نمایاں کی بنا پر سرسبزی کہیں دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ پورے جزیرہ عرب میں طائف کا ایک حصہ ایسا ہے جسے سرسبز کہا جاسکتا ہے۔ مدینہ منورہ میں کھجوروں کے کچھ باغات اور کہیں کہیں جو کے چند کھیت نظر آسکتے تھے۔ باغات اور کھیت کے لفظ سے آپ اپنے ذہن میں اپنے ہاں کے باغات اور کھیتوں کا تصور نہ لے آئیں۔ مدینہ منورہ کے باغات ایسے ہی تھے کہ کہیں کہیں کھجوروں کے چند درخت لگا دیے گئے اور اس کو باغ کہہ دیا گیا۔ مدینہ منورہ کی یہ سرزمین آج بھی زائرین کے لئے ویشادابی قلب و نگاہ ہے اس کی زرعی حیثیت ایسی نہیں ہے جس کا آج اندازہ نہ کیا جاسکے۔ یا جو حیثیت اس کو عہد رسالت میں حاصل تھی وہ آج بدل گئی ہو۔ مدینہ منورہ کے دو طرف کالے پتھروں کا وسیع و غریض سنگستان ہے جو حرہ کہلاتا ہے۔ یہ تمام علاقہ زراعت کے ناقابل اور بخر ہے۔ باقی حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت وغیرہ لگا جاسکتے ہیں مگر یہ حصہ بھی مسلسل ایسا نہیں ہے۔ کہیں کہیں قابل زراعت ٹکڑے آجاتے ہیں۔ بہر حال یہ وہ سرزمین تھی جسے اسلامی نظام کی اولین تجربہ گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس زمین کا تصور اپنے ذہن میں رکھئے اور سوچئے کہ کیا اس علاقہ اور اس سرزمین کو مثال بنا کر اپنے موجودہ خد کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کے لئے وجہ جواز نکالی جاسکتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں وہ بمشکل خود ان کی ضرورتوں کو پورا کر سکتی تھیں۔ یہ لوگ خود ہی اپنے ہاتھوں سے ان میں کام بھی کرتے تھے۔ زمین کے مالک بن کر کام کئے بغیر زمین سے استفادہ کا طریقہ ان میں عموماً قریج

نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مدینہ کو کھیتی باڑی کرنے والے کسان، کاشتکار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ قریش مکہ جو خود کو ایک تاجر قوم کے افراد سمجھتے تھے مدینہ والوں کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ عام لڑائیوں میں مبارزت کے وقت قریشی بہادروں نے انصار مدینہ سے دود بابتھ کرنا بھی گوارہ نہیں کیا اور جواب میں ہی کہا کہ ہم ان کسانوں سے مقابلہ کرنے میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں ابو جہل کو مرتے دم اگر افسوس تھا تو یہی کہ وہ کسانوں کے لونڈوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ چنانچہ اہل مدینہ کے اس پیشہ کے متعلق صحاح ستہ میں ابو ہریرہؓ کا یہ قول موجود ہے۔

كَانَ يَشْغَلُهُمْ عَمَلُ اِرَاضِيَهُمْ

ہمارے انصاری بھائیوں کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ مدینہ منورہ کے دو اہم قبیلوں اوس و خزرج میں سے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ کے متعلق امام سرخسیؒ نے نقل کیا ہے کہ

کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاؤڑ سے سے کام کرنے کی وجہ سے ان کی بھیلیوں میں گئے
پر گئے تھے۔
کتاب الکسب للسرخی نمبر ۳ ص ۲۵

جس قوم کے سرداروں کا یہ حال تھا ان کے عوام کا حال معلوم۔ البتہ مدینہ منورہ میں بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ضرور ایسا موجود تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں۔ چنانچہ خود اس قبیلہ کے ایک فرد حضرت ارفع بن خدیجؓ کا یہ قول بخاری میں موجود ہے۔

كُنَّا أَكْثَرَ الْأَنْصَارِ مَزْمَرًا (بخاری)

تمام انصاریں سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ اپنی زمینوں کو بٹائی پر دینے کے بھی عادی تھے۔ بہر حال اگرچہ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی مگر زمینداری سسٹم ان کے اندر موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس قبیلہ کے سربراہ اور وہ لوگوں کو طلب فرمایا۔ بخاری میں حضرت ظہیر رافعؓ کے خدیجؓ کے چچا کا یہ قول موجود ہے۔

رسول اللہؐ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ تم لوگ کیا کرتے ہو؟

وہاں سے واپس آکر ظہیر اور ان کے بھائی نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جو حضورؐ کا حکم پہنچایا ہے اس کے

الفاظ یہ ہیں۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں۔

میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور ہیر) سے سنا جبکہ وہ دونوں اپنے حملہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بند و بست کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانعت فرمادی ہے۔ (صحیح ستہ) رافع بن خدیج اپنے ماموں سے نقل کرتے ہیں۔

میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی بات سے منع فرمادیا ہے جو تم لوگوں کے لئے زیادہ نفع بخش تھی مگر اللہ اور رسول کی فرما برداری ہمارے لئے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمینیں دینے سے بالکل منع فرمادیا ہے۔

(کنز العمال۔ صفحہ ۷)

شمس اللہ خیر سی نے امام محمدؒ کے حوالہ سے اسید بن حفصہ صحابیؒ یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

اے بنو حارثہ والو! آج تم پر بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کرایہ پر زمینوں کا بند و بست کرنے سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانعت فرمادی ہے۔ (مبسوط جلد ۲ صفحہ ۱۷)

رافع ابن خدیجؒ کی یہ روایتیں تمام صحاح ستہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں یہ الفاظ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زرعی زمینوں کو کرایہ پر بند و بست کرنے سے منع کر دیا ہے۔ (بخاری)

کہیں ان الفاظ میں ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا ہے کہ زمین کو بند و بست کر کے زمین کے مقابلے میں کوئی معاوضہ یا

کسی قسم کا کوئی حصہ لیا جائے۔ (مسلم وغیرہ)

کہیں یہ تصریحات ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا تنویر اہبت اناج بھی کاشتکار سے زمین کا مالک نہیں

لے سکتا؟ فرمایا نہیں، پھر سوال کیا گیا کہ (چھاغلہ نہ سہی بھوسا تو لے سکتا ہے؟) فرمایا

(نہی)

نہیں۔

کہیں یہ بھی تفصیلات دی گئی ہیں۔

زمین کو چوتھائی، تہائی، یا اناج کی مقررہ مقدار پر بھی بند و بست کرنا جائز نہیں

ہے۔ (ابوداؤد۔ مسند احمد۔ کنز العمال)

رہ گئی یہ صورت کہ زمین کو نقد رقم کے مقابلہ میں بندوبست کیا جائے تو اس کے متعلق رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے کچھ نقل نہیں کرتے۔ وہ محض اپنی رائے بیان کرتے ہیں اور ان کی یہ رائے مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ منہ ملتے ہیں۔

دینار اور درہم کی شکل میں زمین کو کہ ایہ پر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (بخاری)

مگر ساتھ ہی جب ان کے پوتے عمران بن سہل ان سے آکر عرض کرتے ہیں۔

کہ دادا جان! میں نے دو سو درہم پر اپنی زمین کو کہ ایہ پر دیدی ہے۔

تو وہ بایں الفاظ ان کو منع فرمادیتے ہیں۔

اس طریقہ کو چھوڑ دو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمینوں کو کہ ایہ پر لینے سے منع فرمایا ہے۔

اس اختلاف رائے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نقدی بندوبست کا رواج نہیں تھا اس لئے صراحتہً حضور سے اس کی مانع مردی نہیں تھی۔ لہذا کبھی وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جس چیز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتہً منع نہیں فرمایا اس سے ہم کیوں منع کریں اور کبھی وہ اسولی مانع کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے منع فرمادیتے تھے۔ بخاری میں موجود ہے کہ رافع بن خدیج سے نقدی بندوبست کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ

سو نے چاندی پر بندوبست کرنے کا اس زمانہ میں رواج نہیں تھا۔

بہر حال جہاں رافع بن خدیج سے اس کی اجازت نقل کی جاتی ہے وہ ان کا اپنا قول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رہی یہ بات کہ بعض روایتوں میں رافع بن خدیج نے اس اجازت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کیا ہے تو اس کے متعلق حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے۔

در اصل راوی کو سمجھے میں مغالطہ ہوا ہے ورنہ درحقیقت یہ سعید بن المسیب کا قول ہے جسے راوی

کچھ اس طرح غلط ملط کر دیا ہے کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم معلوم ہوتا ہے۔

(فتح الباری - جلد ۵ - صفحہ ۲۰)

رافع بن خدیج کے علاوہ اسی مضمون کی حدیثیں دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ سے منقول ہے۔

کچھ صحابہؓ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے یا اپنی زمین کو روکے رکھے۔ (بخاری و مسلم)

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں۔

عطاء جابرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ تہائی چوتھائی اور نصف بٹائی پر زمینیں کاشت کے لئے دیا کرتے تھے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو اسے وہ خود کاشت کرے یا کسی کو بخش دے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔ (بخاری و مسلم)

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی اسی قسم کے الفاظ منقول ہیں۔ اسی مضمون کی روایات حضرت زید بن ثابتؓ اور ثابت بن النضاکؓ اور ابو سعید خدریؓ سے بھی نقل کی جاتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مسلم۔ ابو داؤد۔ طحاوی وغیرہ) یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صورت حالات کیا تھی۔ زمین بے بی سلتے کہ اس سے انسان اپنی غذا پیدا کریں غذا پیدا کرنے کے لئے یہ زمینیں لامحالہ کسی نہ کسی کی تحویل میں ضرور دیا جائیں گی ورنہ وہ خود پٹری پٹری غذا اگلنے سے رہیں چنانچہ آپ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو جن لوگوں کے قبضہ میں زمینیں چلی آ رہی تھیں آپ نے ان کو انہی کی تحویل میں رہنے دیا کیونکہ عام طور سے لوگوں کے پاس اپنی ذاتی ضرورتوں سے زیادہ زمینیں نہیں ہوتی تھیں اور جن لوگوں کے پاس زمینیں ہوتی تھیں وہ اپنے ہاتھوں سے اس میں کام کاج کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں صرف جو حارثہ کا ایک قبیلہ ایسا تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ زمینیں تھیں اور وہ بٹائی پر لوگوں کو زمینیں دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتا ہے تو آپ اس کو فوراً بند فرما دیتے ہیں۔ بٹائی پر دینے سے بھی اور کسی دوسری صورت میں کرایہ پر دینے سے بھی۔ نقد بندوبست کا اس زمانہ میں رواج موجود نہیں تھا لہذا اس کی مانگت صراحتہ آپ سے نقل نہیں کی گئی لیکن نفی عن کسائر الارضین۔ نفی عن المزارعہ وغیرہ عمومی ارشادات سے اس صورت کا حکم بھی مناسب طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ زمین کو غلہ کی مقدار پر کاشت کے لئے دیا جائے یا روپیہ پیسہ پر روح دونوں جگہ ایک ہی ہے لہذا حکم میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ رافع بن خدیجؓ نقد بندوبست کے متعلق حضورؐ کی مانگت کی نفی کرتے ہیں جس کی وجہ وہ خود ہی بتا دیتے ہیں کہ آپ کے زمانہ میں اس کا رواج ہی نہیں تھا لیکن جب عملی طور پر خود ان کا پوتا ایسا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس سے روک دیتے ہیں اور استدلال میں حضورؐ کا وہی

عمومی حکم نقل فرماتے ہیں۔

یہ تھا نقشہ حضورؐ کی زندگی میں مدینہ منورہ کی زمینوں کا جس سے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی بوجھ نہیں

آتی۔

بے محل نہ ہوگا اگر اسی سلسلہ میں واقعہ خیبر کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بنا اور آج تک بنا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کا تذکرہ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھنے لفظ میں فرماتے ہیں۔

(۲) ابن عمرؓ کی روایت ہے اور عبداللہ بن عباسؓ اور انس بن مالکؓ کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی صلعم نے خیبر پر حملہ کیا اس کا کچھ حصہ صلعم فتح ہوا اور کچھ بزرگ شمشیر منسوب ہوا۔ آنحضرتؐ نے آدمی علاقہ کو حکومت کی ضروریات کے لئے مخصوص فرما دیا اور آدمی علاقہ کو مقاطعات میں تقسیم کر کے ان مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوہ خیبر میں شریک تھے یعنی بحساب ۱۰۰- آدمی فی قطعہ) پھر آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔ مگر یہودیوں نے آکر عرض کیا کہ آپؐ ہمیں یہاں رہنے دیں۔ ہم آپؐ کی طرف سے یہاں کاشت کریں گے۔ آدمی پیداوار آپؐ لے لیجئے گا اور آدمی ہم لے لیں گے۔ آنحضرتؐ نے یہ دیکھ کر کہ آپؐ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے، ان کی بات مان لی، اور ان سے فرمایا کہ ہم جب تک چاہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب چاہیں گے تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ ان شرائط پر آپؐ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ کاشتکاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔ آدمی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ ۵۰ سو حصہ دار تھے جن پر یہ مقاطعات تقسیم کئے گئے تھے۔ بنائی کے معاہدہ کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اس کو حکومت اور قبیلہ کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلعم کا اپنا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپؐ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں فتلہ اور کھجوریں اپنی ازواج مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضورؐ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی پر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کار بند رہے۔ پھر جب یہودیوں نے خیبر میں پیہم شرائطیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رلے یہ ہوئی کہ معاہدہ کے مطابق

ان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو آپ نے اعلان کیا کہ خیر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین بٹھال لے۔ ازواج مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو پسند کریں وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلہ اور ثمرہ آپ کو نبی صلعم کے زمانہ سے ملتا آ رہا ہے اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازرع مطہرات نے غلہ اور ثمرہ پسند کیا اور حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ رضی اللہ عنہما نے زمین لے لی اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیر سے منتقل کر کے تیمار اور ارجامیں بسا دیا۔

(بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہد نبوت و خلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ نبی صلعم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دی ہے اپنی طرف سے بھی حکومت کی طرف سے بھی اور ان پندرہ سو افراد کی طرف سے جن کا حصہ خیر میں تھا۔ اس طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحہ حیات تک عامل رہے اور آپ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دینا ممنوع تھا؟ (مسئلہ ملکیت زمین)

امیر جماعت اسلامی کی اس جسارت پر ہم کیا کہیں؟ انہیں شاید معلوم ہو کہ یہ واقعہ خیر ہے جس سے لفظ غبارہ بنایا گیا ہے۔ غبارہ کے معنی ہوتے ہیں خیر جیسا معاملہ کرنا۔ اس سے پہلے خود مودودی صاحب صحاح ستہ کے حوالوں سے حضرت زید بن ثابتؓ، جابر بن عبد اللہؓ، رافع بن خدیجؓ کی روایتوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کر چکے ہیں کہ ”نہی رسول اللہ صلعم عن الخباہر“ جس کا ترجمہ ہوا۔ ”رسول اللہ صلعم نے خیر جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے“۔ یہ روایات متعدد صحیح سندوں سے متعدد صحابہؓ سے خود صحیحین تک میں موجود ہیں۔ ان روایات میں غبارہ کا لفظ خود بتلار ہا ہے کہ خیر کا یہ واقعہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اس معاملہ ہی کے پیش نظر عربی زبان اسی واقعہ سے ایک لفظ بھی وضع کیا جا چکا تھا جو عام طور سے مستعمل تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ لفظ یہ بھی بتا رہا ہے کہ خیر کے معاملہ کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ بٹائی پر بندوبست کرنا نہیں تھا اور نہ غبارہ کے اس نئے لفظ کو استعمال کرنے کی

کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جبکہ عربی زبان میں محافلہ - مزارعہ جیسے دوسرے بہت سے الفاظ پہلے ہی موجود تھے۔

آنحضرت مسلم نے مجوروں اور زمین کی پیداوار کے نصف کی جو شرط عالم کی تھی وہ جزیرہ کے طور پر تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کہیں موجود نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے اس کے علاوہ کوئی جزیرہ لیا ہو یاں تک کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ابو بکرؓ و عمرؓ نے بھی نہیں لیا حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ اگر یہ جزیرہ نہ ہوتا تو آیت جزیرہ کے نزول کے بعد ان سے جزیرہ ضرور لیا جاتا۔ (بحوالہ عینی شرح بحثاری صفحہ ۷۲۴)

آپ اس نکتہ کو پھر سمجھ لیجئے کہ مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ جنگ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین مسلمانوں کی ملکیت میں آگئی تھی اور انہوں نے (مسلمانوں نے) اسے یہودی کاشتکاروں کو بٹائی پر دیدیا تھا۔ اس سے وہ زمین کو بٹائی پر دینے کی سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اس زمین کو مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں نہیں لیا تھا۔ وہ یہودیوں ہی کی ملکیت میں رہی تھی۔ اسلامی حکومت نے ان سے ذمی ٹیکس (نقدی کے بجائے) پیداوار کی شکل میں وصول کیا تھا۔ یہ بات رکہ زمین یہودیوں کی ملکیت میں رہی تھی) خود مودودی صاحب کو بھی تسلیم ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب الجہاد فی الاسلام میں لکھتے ہیں۔

یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن ان مجرموں کو اس طرح جلاوطن نہ کیا گیا کہ ان کے اموال دارا صنی پر قبضہ کر کے انہیں بیک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہو۔ جو کچھ وہ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ بیت المال سے دیا گیا۔ (طبع دوم - صفحہ ۲۶۳)

اس سے واضح ہے کہ جنگ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین ان کی ملکیت ہی میں رہی تھی اس لئے جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں انہیں خیبر سے نکالنا پڑا تو انہیں اس زمین کی قیمت ادا کی گئی۔ چنانچہ مشہور مصری مصنف محمد حسین ہیکل اپنی کتاب عمرؓ آروق میں لکھتے ہیں کہ

یہی کچھ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا جو خیبر اور فدک میں باقی رہ گئے تھے۔ انہیں وہاں سے جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔ ان کی زمینوں کی قیمت انہیں دیدی گئی اور ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی گئی۔ (صفحہ ۵۷۸)

یہ حقائق اس کی شہادت دیتے ہیں کہ جنگ خیر کے بعد یہودی اپنی زمین کے بدستور مالک رہنے دیئے گئے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنی زمین کے مالک تھے تو ان سے بٹائی کا معاملہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بٹائی کا معاملہ مزارع مالک زمین سے کرتا ہے۔

یہاں تک کی تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں لوگوں کے پاس دو قسم کی زمینیں تھیں۔

- (۱) وہ زمینیں جو اسلام لانے سے پہلے لوگوں کے قبضہ میں چلی آ رہی تھیں۔
- (۲) جو بعد میں ضرورت کے لحاظ سے مرکزِ ملت کی طرف سے ضرورتمند مسلمانوں کو عطا ہوئیں۔
- (۳) پہلی قسم کی زمینیں زیادہ تر اتنی ہی تھیں جو بمشکل اپنے قابض لوگوں کی ضروریات کو کافی ہو سکتی تھیں۔
- (۴) صرف بنو حارثہ کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں موجود تھیں اور وہ اپنی زمینیں بٹائی پر دینے کے عادی تھے۔
- (۵) بٹائی پر دینے کے سسٹم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً بند فرما دیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس بٹل زمینیں ہوں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بخش دیں۔
- (۶) حضرات صحابہؓ کی اطاعت و فرمانبرداری کو دیکھتے ہوئے یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ صحابہؓ نے اس پر عمل نہیں فرمایا ہو گا۔ اس لئے ایسا یقین کر لینے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ضرورت سے زیادہ زمینیں ضرورتمندوں کو فوراً دیدی گئی ہوں گی۔
- (۷) جن لوگوں کے پاس زمینیں تھیں وہ خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔
- (۸) مرکزِ ملت کی طرف سے جن لوگوں کو زمینیں دی گئی تھیں وہ بھی خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔ ان کو بٹائی پر نہیں دے سکتے تھے۔
- (۹) خیر کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں اور وہ اپنی مقدار کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ زمینیں نہ تھیں۔
- (۱۰) خیر کی زمینیں وہاں کے یہودی باشندوں کو مرکزِ ملت کی طرف سے بٹائی پر دی گئی تھیں مگر

یہ معاملہ بھائی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ خراج یا جزیہ وغیرہ کا کوئی معاملہ تھا۔

(۱) چونکہ خیر کے اس معاملہ سے شبہ ہو سکتا تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کے ساتھ صحابہؓ کو خیر جیسا معاملہ کرنے کی ممانعت فرمادی تھی۔

اب اس کے بعد آپ یہ دیکھتے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں ان کی حیثیت کیا تھی؟ وہ ان پر بحیثیت کاشتکار کے قابض تھے یا بحیثیت مالک کے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ زمینیں افراد ملت کی ملکیت تصور ہوتی تھیں یا مرکز ملت کی؟

اصولی طور پر ہم یہ چیز پہلے وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ زمین تو زمین اسلام کسی قسم کی چیز میں بھی انفرادی ملکیت کو عینی ملکیت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ انتفاع اور استفادہ کے لئے افراد کی تحویل میں وکالتی حیثیت سے اموال دیدینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا مگر ملکیت بہر حال جماعت ہی کی رہتی ہے زمین بھی ہولی طور پر اس سے خارج نہیں ہے لیکن خصوصی طور پر زمین کے متعلق بھی ہمیں اس قسم کے اشارات ملتے ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ زمینیں جو ان افراد کی تحویل میں تھیں وہ مرکز ملت ہی کی ملکیت تصور ہوتی تھیں نہ کہ انفرادی۔

(۱) عہد نبویؐ میں قابل کاشت زمینوں کی خرید و فروخت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

(۲) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کا اختیار دیا تھا۔ رافع ابن خدیجؓ کی یہ روایت پہلے گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے۔ یا اپنے کسی بھائی

کو بخش دے۔ یا اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔

تیسرا اختیار تو محض تہدید کی نوعیت کا ہے اہل میں دو ہی اختیار تھے یا وہ خود کاشت کریں یا اپنے کسی بھائی کو بخش دیں۔ اگر زمینوں کی بیع و فروخت بھی مشروع ہوتی تو تیسرا تہدید ہی پہلو اختیار کرنے کے بجائے سیدھی بات یہ ہوتی کہ یوں کہا جاتا کہ وہ دوسرے کسی بھائی کو قیمتاً فروخت کرے، یہ صورت زیادہ سہل، آسان اور قابل قبول ہو سکتی تھی مگر اس صورت کا اختیار نہیں دیا گیا۔

(۳) عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ملکیت کا قانون یہ تھا کہ جو شخص تین سال تک اپنی زمین کو بیجا رول

پھوڑے رکھے، حکومت اس زمین کو واپس لے لے اور کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کر دے۔ چنانچہ علامہ ابن علیہ لکھتے ہیں۔

ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین عطا کی تھی لیکن وہ اس کو آباد نہ رکھ سکے۔

اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے یہ زمین ان سے واپس لے لی اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دی۔

(کتاب الاموال لابن علیہ صفحہ ۲۹۰)

قرن اول میں زرعی نظام

[ہماری تاریخ میں 'قرن اول کے زرعی نظام کا جو خاکہ ملتا ہے مولانا محمد تقی امینی صاحب کے اس مضمون میں اسے سامنے لایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس مہتد کو پیش نظر رکھئے جو سابقہ مضمون کے شروع میں لکھی گئی ہے۔]

ہم اسلام ایک عالمگیر انقلاب کی شکل میں اسات و عدالت، اخلاقیات و رحمت اخوت و مساوات اور انسانی و قربانی کا پیام لے کر وادی "غیر ذی زرع" سے نمودار ہوا، اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اس نے دنیا کی زہریلی ہواؤں کو نسیم سحر کے جھونکوں میں تبدیل کر دیا اور ایک فضا پیدا کر دی کہ نہ تو ملکیت کی آڑ میں جو روستباد کی گنجائش باقی رہ گئی اور نہ روٹی کی خاطر انسان غیر اللہ کی غلامی پر مجبور رہا۔ اس نے ذرائع پیداوار کی تنظیم و تقسیم میں مذہب و ملت کا فرق کئے بغیر ضرورت و صلاحیت اور حسن عمل کو ملحوظ رکھا۔ اور اپنے زمانہ کے زمیندارانہ و جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جس میں زمین کی ملکیت کا تصور نہیں بلکہ اس کے آفات ہونے کا تصور غالب تھا۔

چنانچہ خلافت الہی میں ایک قسم ان اراضی کی ملتی ہے جو مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت کی جانب سے لوگوں کو دی جاتی تھیں جس کو عربی زبان میں "قطاع" کہتے ہیں۔ اس انتظام کی دو صورتیں رائج تھیں۔

(۱) کاشت کے لئے کسی کو زمین دی جاتی تھی اور وہ خود اس زمین پر کاشت کرتا تھا۔

(۲) اگر مفاد عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتا تو دوسرے کے ذریعہ

کاشت کرتا تھا اور آمدنی یا پیداوار میں دونوں شریک ہوتے تھے۔

خلافت کی جانب سے اس عطیہ کی کبھی تو یہ شکل ہوتی کہ اس کو صرف زمین کی منفعت کا مالک بنادیا جاتا اور ذات نہیں پر کسی قسم کے تہذیب و غیرہ کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ اور کبھی زمین اور اس کی منفعت دونوں کا مالک بنادیا جاتا تھا۔ اس آخری صورت میں ہر قسم کے تہذیب و غیرہ کے اختیارات بھی اس کو حاصل ہوتے تھے۔

لیکن قطائع کی کوئی شکل بھی سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی بلکہ اجتماعی مفاد کے لئے خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے "قطائع" پر زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ انہی اختیارات کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے بعض قطائع کو جلیل القدر صحابیوں سے واپس لے لیا تھا اور اس واپسی میں مفاد عامہ کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارسزما نہ تھا۔ جس طرح رسول اللہؐ نے مفاد عامہ کی خاطر "قطیعہ" دیا تھا اسی طرح حضرت عمرؓ نے اسی کے پیش نظر واپس لے لیا تھا۔ دراصل قطائع دینے اور ان کے واپس لینے دونوں میں مفاد عامہ کی روح کام کر رہی تھی۔

اس بحث کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زمانہ خلافت کے "قطائع" کی اصل حقیقت واضح ہو سکے اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ بعد میں اس کی اصل حقیقت کس قدر مسخ ہوئی اور اب اس لفظ کو موجودہ زمینداری و جاگیر داری کی حمایت میں کس بری طرح آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔

زمانہ خلافت کے قطائع کی اصل شکل | خلافت الہی میں قطائع کی جو نوعیت تھی اس کو سامنے رکھ کر ان کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے "مفاد عامہ کی

خاطر غیر آباد زمین کو آباد کاری کے لئے کسی کو دینا اور حسب حاجت مصلحت اس سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا۔" مندرجہ ذیل تصریحات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

أَوْ قَطَاعٌ إِعْطَاءُ الْأَرْضِ لِلْأَحْيَاءِ سَوَاءً وَجَبَ فِيهِ الْعَشْرُ
أَوْ الْحُرَّاجُ

"اقطاع" کسی کو آباد کاری کے لئے زمین دینا خواہ اس میں عشر واجب ہو یا حنراج۔

علامہ مقرئ نجی اس سلسلہ میں کلام عرب کا یہ محاورہ نقل کرتے ہیں۔

أَقْطَعَهُ نَهْرًا أَوْ أَرْضًا أَبَاحَ لَهُ ذَلِكَ

نہریا زمین "قطیعہ" دیا۔ یعنی اس کے لئے مباح کر دیا۔

علامہ بدرالدین عینی "شارح بخاری" فرماتے ہیں۔

"قطاع" قطیعہ کی جمع ہے۔ خلیفہ کے قطاع دینے کی یہ شکل ہے کہ جس شخص میں وہ اہلیت

وصلاحیت دیکھے اللہ کے اموال میں سے کچھ حصہ خلافت کی جانب سے اس کو عطا کر دے۔

اکثر اس لفظ کا استعمال زمین کے بارے میں آتا ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) یا تو زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔

(۲) یا صرف زمین کی منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے ذات کا نہیں۔

قاسمی ابوبکر بن علی "شارح ترمذی" کہتے ہیں۔

"قطاع" ہمہ ہے جس میں ایک حصہ دوسرے شرکار سے جدا کر دیا جاتا ہے کیونکہ اصولاً آرا

میں تمام لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا بیان ہے۔

وَالسُّلْطَانُ إِقْطَاعُهُ عَلَى الْمَلِكِ وَكَذَا عَلَى عَدَمِهِ

خلیفہ کو قطاع دینا جائز ہے چاہے تو زمین کا مالک بنا دے اور چاہے تو مالک نہ بنائے (صرف

انتفاع کا موقع دے)۔

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت الہی میں "قطاع" کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ شخصی

کو آباد کاری کے لئے خلافت کی جانب سے زمین دی جاتی تھی اور وہ زمین سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ

ہوتی تھی بلکہ خلیفہ کے اختیارات اس پر بہ نسبت دیگر اراضی کے زیادہ ہوتے تھے۔ بعض متأخرین نے "قطاع"

کی یہ تعریف کی ہے۔

هُوَ تَمْلِیْکُ الْأَرْضِ مَزْدُوْعَةً عَنِ الْمَوْلٰی فَلَا یُکَوِّنُ فِیْهَا الْعَشْرُ وَالْخَرَاجُ

"قطاع" کسی کو زمین کا اس طرح مالک بنادینا کہ اس پر ٹیکس وغیرہ نہ عشر کی صورت میں واجب ہو اور

نہ خراج کی صورت میں۔

ظاہر ہے کہ قطائع کی یہ تعریف مذکورہ بالا تعریفوں سے کتنی مختلف اور حقیقت سے کس قدر دور ہے، زمانہ خلافت میں نہ اس قسم کی تنظیم کا کوئی ثبوت ملتا ہے اور نہ یہ مزاج اسلامی ہی کے موافق سمجھتی ہے۔ اسلام تو دراصل اسی قسم کی زیادتیوں کو ختم کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ ان کو باقی رکھنے اور رواج دینے کے لئے۔

احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کی اراضی ایسی تھیں جو خلافت کی جانب سے لوگوں کو بطور قطعہ دی جاتی تھیں۔

(۱) ہجر زمین جو ہمیشہ سے غیر مزدور اور غیر آباد چلی آتی تھی۔ ایسی زمینوں کی دیرانی اور سختی دیکھ کر عام لوگوں کو انہیں قابل کاشت بنانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ خلافت نے ایسی زمینوں کی طرف توجہ کر کے انہیں قابل کاشت بنانے کے لئے لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ، نقیع میں جو زمین حضرت زبیر کو دی گئی تھی وہ اسی زمین سے تھی۔

(۲) افتادہ زمین جس میں قابل زراعت ہونے کے باوجود کسی وجہ سے کاشت نہ ہوتی تھی اس میں تمام وہ زمینیں شامل تھیں جو بستیوں کے اجاڑ ہو جانے کے بعد بیکار پڑی رہتی تھیں اور انہیں کوئی آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ مدینہ کی وہ زمینیں بھی اسی میں شامل تھیں۔ جو آپاشی کی دشواری کی وجہ سے رسول اللہ کے حوالہ کر دی گئی تھیں اور ان کو آپ نے لوگوں میں زراعت کی خاطر تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ بلال بن حارث کو رسول اللہ نے وہی غنیمت اسی زمین سے عطا فرمائی تھی۔

(۳) خالصہ زمین اس میں منصوصہ علاقوں کی تمام وہ زمینیں شامل ہوتی تھیں جو خلافت کے لئے خالصہ قرار دی جاتی تھیں۔ ایسی زمینوں کی کئی قسمیں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

ا۔ جن زمینوں کے مالک جنگ میں مارے جاتے۔

ب۔ یا بھاگ جاتے۔

ج۔ شاہی جاگیریں جو بادشاہ کے صرف خاص کے لئے "خالصہ" ہوتی تھیں۔

د۔ شاہی خاندان اور منسراں کی جاگیریں۔

۴۔ ترانی، جھیلیں، جھاڑیاں وغیرہ۔

یہ اور اسی قسم کی تمام وہ زمینیں جن پر چند افراد قابض ہو کر عیش کرتے تھے اور اسلامی غلبہ کے بعد

ان کا کوئی مالک اور آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ اسی تمام زمینیں خلافت کے لئے "خالصہ" ہو کر مفاد عامہ کے لئے وقف ہو جاتی تھیں۔

ابو عبیدہ خالصہ زمین کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔
 قَلَمْ يَبْقَ بِهَا سَاكِنٌ وَلَا لَهَا عَامِرٌ فَكَانَ حُكْمُهَا إِلَى الْإِمَامِ
 مذکورہ خالصہ زمینوں میں نہ کوئی رہنے والا باقی رہتا تھا اور نہ آباد کرنے والا اس لئے ان کا مکمل
 خلیفہ کے سپرد ہو جاتا تھا۔

قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔

وَذَلِكَ بِمَنْزِلَةِ الْمَالِ الَّذِي لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ وَلَا فِي يَدِ أَحَدٍ

اسی زمین کی حیثیت اس مال جیسی ہوتی تھی جو نہ کسی کا ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ خلافت میں انہی زمینوں سے "قطاع" دیئے جاتے تھے جو نہ تو کسی کے قبضہ میں
 ہوتیں اور نہ کوئی ان کا مالک اور وارث ہوتا۔ نہ کسی کے آباد کرنے کا کوئی نشان ہوتا اور نہ اسی زمین ہوتی
 جو قانوناً کسی کو نہ دی جاسکتی تھی مثلاً چراگاہ، جنگل، نمک کی جھیل وغیرہ اور نہ اسی صورت ہوتی جس میں کسی کے
 نقصان کا سوال پیدا ہوتا۔

اسی زمینوں کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ بیکار پڑی رہتیں اور حقوق عامہ جو زمین سے
 متعلق ہیں وہ پائمال ہوتے رہتے (۲) اور یا وہ صورت اختیار کی جاتی جو مفاد عامہ کے لحاظ سے مناسب اور
 بہتر ہوتی۔

خلافت نے نفع خلق کے پیش نظر دوسری صورت اختیار کی تھی، یہ اسی انتظام کا نتیجہ تھا کہ زمانہ خلا
 میں تمام بخر و فسادہ زمینیں آباد ہو گئی تھیں اور آباد شدہ زمینوں سے غلہ اُگلنے لگا تھا۔

قطاع لوگوں کو مفاد عامہ کے پیش نظر دیئے جاتے تھے | حکومت الہی میں قطاع دینے کا مقصد زیادہ
 سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا اور خلق اللہ
 کا عام مفاد ہوتا تھا۔ جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا خلافت کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی لیکن اگر اس

کو تباہی ہوتی یا اور کوئی عمدہ صورت اراضی کے تنظیم کی سامنے آتی جس میں نفع خلق زیادہ معلوم ہوتا تو خلافت کو بے دخل کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا تھا۔

چنانچہ تاریخ میں چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں بلا پس و پیش اسی نظریہ کے ماتحت صاحب زمین کو بیدخل کر دیا گیا تھا۔ چند واقعات یہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو پوری ”دادی عقیق“ دیدی تھی لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے تھے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے آپ کو یہ زمین اس لئے نہ دی تھی کہ نہ خود آباد کریں اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں لہذا جتنی زمین آپ آباد کر سکتے ہوں اپنے پاس رکھئے اور بقیہ خلافت کے حوالہ کر دیجئے۔

یہ سن کر حضرت بلالؓ نے کہا کہ میں رسول اللہؐ کی دی ہوئی زمین کبھی واپس نہ کروں گا خواہ میں اسے آباد کروں یا نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے داپسی پر اصرار کیا اور بالآخر آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی۔ اس موقع پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ بلال بن حارثؓ فرس رسول اللہؐ کے قریب ترین صحابی تھے اور انھیں زمین کا عطیہ خود رسول اللہؐ نے عطا فرمایا تھا جس کی بنا پر اس عطیہ کے ساتھ خصوصی لگاؤ ہونا فطری بات تھی۔ مگر حضرت عمرؓ نے مفاد عامہ کے لئے بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا خیال کیا اور نہ اس جذبہ کا کہ رسول اللہؐ کا دیا ہوا عطیہ کس طرح واپس لیا جائے۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حکومتِ الہی میں خلیفہ اللہ کے سامنے خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا۔ وہ اس کے لئے نہ اپنے بزرگ سا بھتیوں کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی سلوک کرنے کے لئے تیار ہوتا تھا اور نہ محض جذباتی امور سے متاثر ہو کر عام مفاد کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب رسول اللہؐ کا دیا ہوا عطیہ مفاد عامہ کے پیش نظر بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے واپس لیا جاسکتا ہے تو دیگر نا اہل لوگوں کے پاس سے بیکار زمین یا ان کی ضرورت سے زائد زمین واپس لینے میں کیسے غور و فکر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اور اس میں حقوقِ ملکیت کا ”گورکھ دھندا“ کیسے حائل بن سکتا ہے۔

(۲) رسول اللہؐ نے ایک اور شخص کو زمین دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے زمین کے آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین لے لی تھی۔

(۳) قومِ بجیلہ کا واقعہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ نے خا

زمین کا کچھ حصہ انہیں دیدیا تھا، اور دو تین سال تک وہ اس کو آباد کرتے رہے تھے لیکن جب خلق خدا کے نفع کی اس سے عمدہ صورت سمجھ میں آئی تو خلافت نے بلا پس و پیش وہ زمین ان لوگوں سے واپس لے لی تھی۔

(۴) حضرت عمرؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کا عام قانون کے ماتحت مسلمانوں کو زمین کی جائیداد سے بیدخل کر ان کا وظیفہ مقرر کر دینا اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ حکومت الہی میں قطائع دینے کا سلسلہ عام مغل کے پیش نظر ہوتا تھا جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا تھا قطائع باقی رکھے جاتے تھے ورنہ جس صورت کے اختیار کرنے میں نفع خلق زیادہ نظر آتا حتی الامکان ذاتی مفاد کو ملحوظ رکھ کر وہی صورت اختیار کرنے کی پوری گنجائش ہوتی تھی۔

اس نظریہ کی مزید وضاحت ان اصول سے ہوتی ہے جو قطائع کے بارے میں ناقد تھے اور اس طرز عمل سے بھی ہوتی ہے جو خلفاء کا اس سلسلہ میں تھا۔

قطائع کن لوگوں کو دیئے جاتے تھے | حکومت الہی میں انہی لوگوں کو قطائع دیئے جاتے تھے جو کاشتکار ہوتے یا جن کے ذمہ مفاد عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہوتی تھی جس کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتے بلکہ دوسروں سے کاشت کر کے اس کے ذریعہ اپنی گذر بسر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ مقرئری اور قاضی ابویوسفؒ یہ کلیہ بیان کرتے ہیں۔

قَدْ أَقْطَعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَ تَأَلَّفَ عَلَى الرَّسُولِ أَقْوَامًا وَ أَقْطَعَ الْخُلَفَاءُ مَنْ رَأَوْا أَنَّ فِي أَقْطَاعِهِمْ صَلَاحًا

پیغمبر اسلام اور آپ کے جانشینوں نے انہی لوگوں کو قطائع دیئے تھے جن کے دینے میں ملک فلت کی بھلائی ہوتی تھی اور قطائع دینے میں مالیت قلوب مقصود ہوتی تھی۔

علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں: ”خلیفہ کے قطائع دینے کی شکل یہ ہے کہ اللہ کے مال سے وہ ان لوگوں کو عطایا دے جن میں اس کی اہلیت و صلاحیت دیکھے۔“

زمانہ خلافت میں جن کو قطائع دیئے جاتے تھے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ جن میں آباد کاری اور کاشتکاری کی صلاحیت ہوتی تھی۔

۲۔ جن کے سپرد مفاد عامہ کی کوئی خدمت ہوتی تھی۔

۳۔ فوجی اور تمام وہ لوگ جو ملک و قوم کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔

۴۔ نو مسلموں کو تالیفِ قلوب کے لئے قائل دیئے جاتے تھے۔

بسا اوقات لوگ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو نادر اور محتاج پاتے تھے اور ان کے پاس گزرو بسری کی کوئی شکل نہ رہ جاتی تھی۔ ایسی صورت میں خلافت انہیں قائل دے کر کسبِ معاش کے قابل بناتی تھی۔ اس حسنِ سلوک سے ایک طرف تو یہ ہوتا تھا کہ نو مسلموں کو اسلام قبول کرنے کے بعد معاشی پریشانیوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا تھا اور وہ مطمئن ہو کر خدمتِ خلق اور رحمتِ الہی کو عام کرنے میں اپنی توجہ خرچ کرتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ غیر مسلم کو حسنِ سلوک دیکھ کر سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملتا تھا اور اسلام قبول کرنے کے لئے راہیں کھلتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خلافت کے پیشِ نظر قائل کا مقصد اللہ کی مخلوق کے لئے زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانا اور عام خوشحالی کی فضا پیدا کرنا ہوتا تھا اس لئے بالعموم انہی لوگوں کو قائل دیئے جاتے جو زمین کو زیرِ کاشت لاکر بیدار کر رہا کئے تھے۔ اور اگر کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر خود کاشت نہ کر سکتے تو دوسروں کے ذریعہ کاشتِ را کے اس مقصد کو پورا کرتے تھے۔ جیسا کہ قاضی ابویوسفؒ نے فرمایا۔

وَلَوْ لَمْ يَكُنْ لَمْ يَأْتِ تَوْكُّدٌ وَ لَمْ يَفْطَحُوا حَقَّ مُسْلِمٍ وَلَا مَعَاهِدٍ

گر یہ مقصد نہ ہوتا تو رسول اللہؐ اور خلفاء کسی کو کسی مسلمان یا معاہد کا حق نہ دیتے رہیں لحاظ سے کہ زمین میں سب شریک ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ زمانہ خلافت میں ایک شخص کو زمین کی کتنی مقدار دی جاتی تھی اس سلسلہ میں تاریخِ خلافت کا مطالعہ کرنے سے پہلے بنیادی حیثیت سے چند باتیں لائقِ توجہ ہیں۔

۱۔ اس زمانہ میں بنجر اور افتادہ زمینیں بکثرت تھیں اور آباد کرنے والے کم تھے۔

۲۔ پیداوار آج کے مقابلہ میں کم تھی خصوصاً عرب کی زمینوں کی۔

۳۔ رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت تک فوجیوں اور دیگر کارپردازوں کی تنخواہیں مقرر نہیں ہوتی تھیں۔

- ۴۔ حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کر کے تنخواہوں اور وظیفوں کا باقاعدہ انتظام کیا تھا۔
- ۵۔ تنخواہ اور وظیفہ مقرر نہ ہونے کی صورت میں ان لوگوں کے لئے جن کے ذمہ مفاد عامہ کی خدمت سپرد ہوتی تھی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ (۱) ڈیوٹی چھوڑ کر خود کاشت کے ذریعہ اپنی گذر بسر کرتے۔ (۲) یا زمین کاشتکاروں کے حوالہ کر کے پیداوار میں یا اس کی آمدنی میں دونوں شریک ہوتے اور اس طرح کاشتکار اور صاحب زمین دونوں حسب حیثیت مفاد عامہ کی خدمت کرتے رہتے۔
- ۶۔ تنخواہوں اور وظیفوں کے مقرر ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی زمین جائیداد کے بارے میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے وہ قابل غور ہے۔ مزید وضاحت کے لئے چند واقعات یہ ہیں۔

(۱) صدیق اکبرؓ نے حضرت طلحہؓ کو قطعہ دیا تھا اور اس پر چند لوگوں کو گواہ بنا کر حکمنامہ ان کے حوالہ کر دیا تھا ان گواہوں میں حضرت عمرؓ کا نام بھی تھا۔ حضرت طلحہؓ حسب دستور حضرت عمرؓ کے پاس حکمنامہ پر دستخط کر کے لئے گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

أَهَذَا كُلُّهُ لَكَ دُونَ النَّاسِ ؟

کیا یہ سب آپ ہی کو مل جائے اور دوسرے لوگ محروم رہیں۔

اس کے بعد حضرت طلحہؓ غصہ میں بھرے صدیق اکبرؓ کے پاس آئے اور کہا:

وَاللّٰهِ مَا أَذْرِيْ أَنْتَ الْخَلِيفَةُ أَمْ عُمَرُو ؟

واللہ میں نہیں سمجھ سکا کہ کون خلیفہ ہے آپ ہیں یا عمر

حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب میں کہا بَلْ عُمَرُو (بلکہ عمر ہیں)۔

الغرض حضرت عمرؓ کی مخالفت کی وجہ سے صدیق اکبرؓ کا یہ حکم منسوخ کر دیا گیا تھا۔

(ب) حضرت عیینہؓ کو صدیق اکبرؓ نے قطعہ دیا تھا۔ جب وہ دستخط کرانے حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو انہوں نے دستخط سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ لکھے ہوئے حکم کو مٹا دیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عیینہؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس آئے اور دوسرا حکمنامہ لکھ کر دینے کی درخواست کی۔ صدیق اکبرؓ نے ان سے جواب میں فرمایا۔

وَاللّٰهُ لَا اُجِدُ شَيْئًا رَّكَدًا عُمْرُهُ

واللہ میں وہ کام دوبارہ نہ کروں گا جس کو عمر نے رد کیا ہو۔

یہ بات کہ حضرت عمرؓ نے دستخط سے کیوں انکار کیا تھا جبکہ رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ اور خود عمرؓ سے تطبیع دینا ثابت ہے اس کی وجہ حضرت عمرؓ نے خود ہی ان الفاظ میں بیان کر دی تھی۔

اَ هَذَا كُلُّهُ لَكَ دُونَ النَّاسِ ؟

کیا یہ سب آپ ہی کو مل جائے اور دوسرے محروم رہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیقِ دُعا و دُعا دو دنوں کا ایک ہی مقصد تھا یعنی قِطائع دے کر زمین کو زیرِ کاشت لانا تاکہ خلقِ اللہ کے لئے زیادہ سے زیادہ غذا پیدا ہو سکے مگر یہ بات ہر وقت دو دنوں کو ملحوظ رہتی تھی کہ زمین چند افراد کے ہاتھ میں پڑ کر ان کے عیش و آرام طلبی کا سامان نہ بن جائے یا انتظام نہ ہو سکے کی وجہ سے بیکار نہ پڑی رہے۔ اور حقوقِ عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پائمال ہوتے ہیں۔ اس لئے قِطائع دینے میں یہ احتیاط ضروری تھی کہ صرف اپنی لوگوں کو دینے جائیں جو اس کے اہل تھے اور اس مقدار میں دینے جائیں جن کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنایا جاسکے۔

مذکورہ صورتوں میں حضرت عمرؓ نے جب دستخط سے انکار کیا تھا تو صدیقِ اکبرؓ کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ حضرت عمرؓ کے انکار کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ زمین کسی حیثیت سے مفادِ عامہ کے خلاف جا رہی ہے اور سلاں شخص کو تطبیع دینے میں کسی حد تک مقصد کی پائمالی ہو رہی ہے ورنہ حضرت عمرؓ کو انکار کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ آئیے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے حکم کو منسوخ قرار دے کر دوسرا حکم نامہ لکھنے کی درخواست رد کر دی تھی۔ حکومتِ الہی میں نہ تو کسی فرد کو بیکار رہنے دیا جاتا تھا اور نہ دوسرے کی محنت سے ناجائز نائدہ اٹھا کر کسی کو عیش و عشرت کا موقع دیا جاتا تھا۔ اگر کسی فرد میں کاشتکاری کی اہلیت و صلاحیت دیکھی جاتی تو زمین اس کے حوالہ کر کے اسے خلقِ اللہ کی خدمت پر مامور کر دیا جاتا تھا اور اگر وہ شخص دیگر مفادِ عامہ کے کاموں کے لئے موزوں ہوتا تو اس مقدار میں تطبیع دینے ہاتے تھے کہ وہ دوسروں کے ذریعہ کاشت کر کے اپنی گذر بسر کے لائق آمدنی یا پیداوار حاصل کر سکے تاکہ اس کو دیگر کام اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں سہولت ہو۔ اسی صورت میں کاشتکار اپنی صلاحیت

کے مطابق خدمت خلق کرتا تھا اور صاحب زمین اپنی صلاحیت کے مطابق اس فرض کو انجام دیتا تھا۔ نہ کوئی شخص بیکار رہنے پاتا تھا اور نہ کسی کو اس کی صلاحیت اور طبیعت کے خلاف ڈیوٹی سپرد کی جاتی تھی۔ اس سے ایک طرف تو یہ ہوتا تھا کہ ہر شخص مفاد عامہ کے کاموں میں لگا رہتا تھا اور سب کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاتے رہتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ ہر شخص اپنی صیغہ کی آزادی اور صلاحیت کے لحاظ سے اپنی اپنی لائن میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرتا تھا۔ نہ کسی کے ذہنی طور پر خود کشی کا سوال پیدا ہوتا تھا اور نہ کسی کو مزاج اور طبیعت کے خلاف محض سرمایہ اور بڑے کی خاطر کسی کام کے کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ غرض زمانہ خلافت میں جماعت جماعتی حیثیت سے خوش تھی اور نہ اپنی انفرادی حیثیت سے حوس تھا۔ نہ فرد کو جماعت سے شکایت تھی اور نہ جماعت کو فرد پر اعتراض تھا۔

قطائع کے بارے میں اسی پوزیشن کو واضح کرنے کے لئے علامہ بدرالدین عینی نے مندرمایا۔
 جَوَزَ الْجُنْدُ الَّذِي يُقَطَّعُ لَهُ أَنْ يُؤْجَرَ مَا أُقْطِعَ لَهُ
 شکر اور فوجی کے لئے اپنے قطائع کو ایہ پر دینا جائز ہے۔

اور شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں

وَلَا يُقَطَّعُ إِلَّا قَدَرُ مَا يَتَنَاهَى الْعَمَلُ عَلَيْهِ

اسی مقدار کا قطعہ دیا جائے جس پر اس کا کام کرنا آسان ہو۔

پھر کہتے ہیں۔

امام را باید که اقطاع کند بقدر حاجت

خليفة کو بہت ضرورت قطعہ دینا چاہیے۔

ان تصریحات سے دو باتیں واضح ہوئیں (۱) پہلی تو یہ کہ حاجت و ضرورت سے زائد کسی کو قطعہ نہ دیا جائے (۲) دوسری یہ کہ بوقت ضرورت و مصروفیت اپنے قطعہ کو کرایہ وغیرہ پر دیا جاسکتا ہے۔

زمانہ خلافت کے دیئے ہوئے قطائع سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ ہوتے تھے بلکہ بہ نسبت دیگر آراضی کے خلافت کے اختیارات قطائع

میں زیادہ وسیع ہوتے تھے۔ کیونکہ خلافت کا براہ راست تعلق خالصہ زمینوں سے ہوتا تھا اور قطائع بالعموم انہی زمینوں سے دیئے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے نظام تنظیم و تقسیم میں خلافت کی ذمہ داری زیادہ رہتی تھی۔ جب اس میں خلافت کی ذمہ داری زیادہ ہوتی تھی تو اس کے اختیارات کا وسیع ہونا ایک فطری امر تھا تاکہ دونوں

جانب توازن قائم رہ سکے۔ جیسا کہ امام ابو یوسف اختیارات کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
 ”قطاع اگر عشری زمین سے دیئے گئے ہیں تو عشر واجب ہوگا اور خراجی زمین سے دیئے گئے ہیں
 تو خراج واجب ہوگا۔“

پھر آگے چل کر اسی حقیقت کو ان الفاظ میں دخیل کرتے ہیں۔
 جس کسی کو خراجی زمین سے قطاع دیئے جائیں تو ٹیکس کے بارے میں خلیفہ کو اختیار ہے کہ پیداوار کا
 دسواں، پندرھواں، بیسواں حصہ یا اس سے بھی زیادہ یا خراج بہر حال جو مناسب سمجھے وہ ٹیکس
 مقرر کر دے۔“

پھر کہتے ہیں۔
 وَ اَرْجُوا اَنْ يَكُوْنَ ذَلِكَ مُوسَعًا عَلَيْهِ فَكَيْفَ فَاَشَاءَ مِنْ ذَلِكَ فَعَلَهُ
 مجھے امید ہے کہ اس بارہ میں خلافت جو بھی مناسب سمجھ کر کرے گی اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے۔
 یہی امام ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
 وَ اَعْمَلْ بِمَا تَرَى اَنْتَ اَصْلَحُ لِلْمُسْلِمِيْنَ وَ اَعْمَرْ نَعْمًا لِمَخَاصِيْهِمْ وَ عَامَّةِهِمْ
 وَ اَسْلَمْ لَكَ فِي دِيْنِكَ“

مفاد عامہ کے پیش نظر جس میں مسلمانوں کی اور تمام لوگوں کی نلاح و بہبودی ہو آپ کو اس میں بالکل
 اختیار ہے اور دین و ملت کے لحاظ سے بھی وہی زیادہ محافظ ہے۔
 حاصل یہ کہ حکومت الہی میں زمین کی جائیداد نہ ذاتی و تار اور اقتدار بڑھانے کے لئے ہوتی تھی اور نہ کاشتکاروں
 کی محنت سے فائدہ اٹھا کر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کے لئے بلکہ یہ ساری چیزیں پیداوار حاصل کر کے
 مفاد عامہ کی راہوں میں صرف کرنے کے لئے اور خلق خدا کی خدمت کے لئے ہوتی تھیں اسی لئے قانون اور
 کے معاملات میں خلافت کے اختیارات وسیع ہوتے تھے۔

جس طرح خلق اللہ کی ضروریات ہٹا کر ناخلافت کا فرض تھا اور جانوروں تک کا انتظام اس کی ذمہ داری
 میں داخل تھا اسی طرح قدرت کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں خلافت کے اختیارات کی وسعت اس کا حق تھا اگر آزاد

کے ساتھ حقیقی معنوں میں وہ نیا بت کے فرائض انجام دے سکے۔

مذکورہ بالا تصریحات کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ زمینداری و جاگیر داری کی شکل زمانہ خلافت کے قطائع سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس نظام میں جاگیر دار و زمیندار ایک وسیع حصہ زمین کا مالک ہو کر کاشتکار اور مزدوروں سے کام لیتا ہے اور بغیر ہاتھ پاؤں بلائے ان کے منافع سے غیش و آرام کرتا ہے۔

اس سے ایک طرف تو راحت طلبوں اور محنت خوروں کا طبقہ پیدا ہوتا ہے جو دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سوسائٹی کے لئے بار بنتا ہے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ان کی محنت کا پورا حق نہیں ملتا جس کی بنا پر انہیں رات دن کی محنت کے باوجود فراغت کے ساتھ روتی بیستر نہیں آتی۔

قطائع سے اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں نکل سکتی، بلکہ اسلام ایسے نظام کو سختی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہے اور زمانہ خلافت کی متعدد مثالیں اوپر گزر چکی ہیں جن سے اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

یہ حقیقت اس بات سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت الہی کی طے شدہ اور مقرر کردہ پالیسی یہ ہے کہ زمین اور جائیداد ذاتی و تار اور اقتدار بڑھانے کے لئے نہ ابتداء کسی کو دی جاسکتی ہے اور نہ بعد میں کسی کے پاس باقی رکھی جاسکتی ہے، یہ صرف مفاد عامہ کے پیش نظر لوگوں کو دی جاتی ہے اور اس کو سامنے رکھ کر ان سے واپس لے لی جاتی ہے۔ حکومت الہی میں اصل چیز مفاد خلق ہے۔ جب تک یہ حاصل ہوتا رہتا ہے خلافت کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی لیکن جب یہ فوت ہونے لگتا ہے تو خلافت اس وقت ہر تصرف کی مجاز ہوتی ہے۔ چنانچہ زمانہ خلافت میں قوم بچیلہ سے قطائع کا واپس لے لینا جس کی تفصیل آگے چل کر آتی ہے، اور بلال بن حارث مزی کے قبضے سے غیر آباد اراضی کا نکال لینا اور اس قسم کے جتنے واقعات اوپر مذکور ہو چکے وہ سب اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ت اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔
قطائع پر خلافت کے اختیار
 لَنَا رِقَابُ الْوَرَضِ

زمینیں دراصل ہماری (خلافت کی) ہیں۔

اور حضرت علیؑ نے ایک شخص سے اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا تھا۔

إِنَّ أَرْضَكَ فَهِيَ لَنَا

بیشک تیری زمین ہماری (خلافت کی) ہے

اسی حقیقت کو حافظ ابو بکر حصاصؓ یوں ادا کرتے ہیں۔

برہہ زمین جس کی آباد کاری سے لوگ عاجز ہیں اور حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پائمال ہونے لگیں تو اس کے انتظام کے بارے میں خلافت کو پورا اختیار ہے۔

قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔

وَلَا يَخْرُجُ مِنْ يَدِهِ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا إِلَّا بِحَقِّ يَحِبُّ لَهُ عَلَيْهِ فَيَأْخُذُ
بِذَلِكَ الَّذِي وَجَبَ لَهُ

ابن قطنؒ کو خلافت (بلاوجہ) بیدخل نہ کرے البتہ اگر حقوقِ واجبیہ کی ادائیگی نہ ہو رہی ہو تو اسکو بیدخل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

قاضی صاحب کا یہ جملہ "إِلَّا بِحَقِّ يَحِبُّ لَهُ عَلَيْهِ" نہایت قابلِ غور ہے اور اپنے عمومِ فہم کی بنا پر حقوقِ عامہ کے ہر جائز حق اور خلیفہ کے ہر جائز تصرف کو شامل ہے۔ اسی سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ کی یہ تصریح ہے۔

إِنَّ نَوَاحِيَ دَارِ الْإِسْلَامِ تَحْتَ يَدِ إِمَامِ الْمُسْلِمِينَ

دارالاسلام کے جملہ حصے خلیفۃ المسلمین کے زیرِ اقتدار ہوتے ہیں۔

اور امام مالکؒ کا یہ ارشاد ہے۔

تَصِيرُ الْأَرْضُ لِلْإِمْلَاقِ

زمینیں درہل بادشاہ (حکومت) کی ہوتی ہیں۔

ایک موقع پر علامہ عینیؒ کہتے ہیں۔

إِنَّ حُكْمَ الْأَرَاضِي إِلَى الْأِمَامِ

در اصل زمین کا معاملہ خلیفہ (خلافت) کے سپرد ہے۔

چونکہ اراضی کے معاملہ میں خلافت کے اختیارات وسیع ہوتے ہیں اس لئے خلیفہ کو مفاد عامہ کے پیش نظر موقوفہ اراضی میں بھی واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت جائز سمجھی جاتی ہے۔ اراضی موقوفہ کی بحث میں فقہائے تفریح کی ہے۔

إِنَّ السُّلْطَانَ يَجُوزُ لَهُ خُلَافَةُ الشَّرْطِ إِذَا كَانَ غَالِبُ جِهَاتِ
الْوَقْفِ قُرْبَى وَ مَزَادُهُ فَيُعْمَلُ بِأَمْرِهِ وَإِنْ غَايَرَ شَرَطَ الْوَاقِفِ
إِنَّ أَصْلَهَا لَيْسَتْ الْمَالِ

جب واقف کی اکثر جہات گاؤں اور مزدور زمینیں ہوں تو خلافت اپنے صوابدید کے مطابق انتظام کرے اگرچہ واقف کی شرطوں کی مخالفت پائی جاتی ہو کیونکہ گاؤں اور زمینیں اصل بیت المال (خلافت) کی ہوتی ہیں۔

اس بات یہ ہے کہ حکومت الہی میں زمین اور جائیداد پر کسی کے قبضہ ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ قابض کو بحیثیت 'امین' اس کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ امانت اس کے قبضہ میں یا یہ حق استعمال اس کے پاس اسی وقت تک باقی رکھا جاتا ہے جب تک خلق اللہ کے مفاد میں وہ خلافت کا ہاتھ بٹاسکے اور اسی فضا پیدا کرنے میں مددگار بنے جو مخلوق کی خوش حالی اور ترقی کی ضامن ہو لیکن جب اس کی خلافت درزی ہونے لگے یا امانت میں خیانت کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو خلافت کو بلا پس و پیش زمین سے بیدخل کر دینے یا جو بہتر صورت اس کی سمجھ میں آئے اس پر عمل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

خلافت کے اس اقدام میں نہ حقوق ملکیت کا گورکھ دھندا حائل ہوتا ہے اور نہ محض جذباتی چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

چونکہ خلافت کے ہر تصرف اور ہر فیصلہ میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے اس قسم کے تمام مواقع میں وہ ذاتی و انفرادی مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھتی ہے البتہ انفرادی و اجتماعی

معاوضات کے ٹکراؤ کی شکل میں وہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتی ہے

در اصل اسی انفرادی حق کے ماتحت زمانہ خلافت میں بعض ایسی شکلیں ملتی ہیں جن میں صاحب زمین کو ان کی زمین لے لینے کے بعد کچھ رقم ادا کی گئی تھی تاکہ اس شخص کے ذاتی حقوق پامال نہ ہونے پائیں۔ کبھی تو اس کی شکل معاوضہ کی ہوتی تھی جیسے کہ حضرت عمرؓ نے وادی القریٰ کے باشندوں کو منتقل کرنا چاہا تو ان کی اراضی اور تختستان کی ایک ایک پائی قیمت لگا کر جو نوے ہزار کے قریب ہوتی تھی ان کے حوالہ کیا تھا۔ اور جس طرح نجران کے باشندوں کو جب سیاسی مصلحت کی بنا پر منتقل کیا گیا تو زمین کے عوض زمین دی گئی اور فدک کے لوگوں کو منتقلی کے وقت زمین کی قیمت ادا کی گئی تھی اور جس طرح مدینہ کے یہودیوں کو ان کے منتقل کرنے سے پیشتر اپنی زمینیں فروخت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور کبھی حکومت کی جانب سے دی ہوئی رقم کی حیثیت معاوضہ کی نہ ہوتی تھی بلکہ بطور امداد ہوا کرتی تھی۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے قوم بھیلہ کے ابن جریر اور ایک عورت ام کرز کو اتنی اتنی دینار کے قریب دیا تھا اس کی حیثیت امداد کی تھی نہ کہ معاوضہ کی جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔



جس جگہ کے باشندے اسلامی رحمت قبول کر کے مسلمان ہو جاتے تھے ان کی زمین کی تنظیم و تنظیم **ارضی مسلم** کے بارے میں عام قانون یہی تھا کہ وہ بھی مفتوحین کی زمینوں کی طرح اشد کی ملک قرار رکھ جاتی تھیں اور خلافت کے انتظام و نگرانی میں انہی کے پاس رہنے دی جاتی تھیں اور سرکاری ٹیکس کے علاوہ ان کو کچھ وصول نہ کیا جاتا تھا۔

عام قانون رسول اللہؐ کی زبان میں یہ تھا۔

إِنِ الْقَوْمَ إِذَا أَسْلَمُوا أَخْرَجُوا دِمَاءَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ

جب کوئی قوم اسلام قبول کرے تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیتی ہے۔

یہ قانون عرب عجم کی تمام زمینوں کے لئے یکساں تھا اور اس میں منقولہ و غیر منقولہ جائیدادیں سب شریک تھیں۔

قاضی ابویوسف صاحب ہی حقیقت کو وضع کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فَإِنْ دِمَاءُهُمْ حَرَامٌ وَمَا أَسْلَمُوا عَلَيْهِ مِنْ أَمْوَالِهِمْ وَكَذَلِكَ أَهْلُهَا
هُمْ لَهُمْ وَهِيَ أَرْضٌ عَشِيرٍ بِمَنْزِلَةِ حَيْثُ أَسْلَمَ أَهْلُهَا مَعَ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ أَرْضُهُمْ أَرْضٌ عَشِيرٍ
وَكَذَلِكَ الطَّائِفُ وَالْبَجْرَانُ وَكَذَلِكَ أَهْلُ الْبَادِيَةِ إِذَا أَسْلَمُوا
عَلَى مِيَاهِهِمْ وَبِلَادِهِمْ فَلَهُمْ مَا أَسْلَمُوا عَلَيْهِ وَهُوَ فِي أَيْدِيهِمْ
وَلَيْسَ لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الْقَبَائِلِ أَنْ يَتَبَنَّى فِي ذَلِكَ شَيْئًا لِيَسْتَعِيقَ بِهِ
مِنْهُ شَيْئًا وَلَا يَخْضِرُ فِيهِ بَيْرًا لِيَسْتَعِيقَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَسْتَعِيقُوا
الْكَلَاءُ وَلَا يَمْنَعُوا الرِّعَاءَ وَلَا الْمَوَاشِيَ مِنَ الْمَاءِ وَلَا خَافِرًا
وَلَا خُفًا فِي تِلْكَ الْبُلْدَةِ وَأَرْضُهُمْ أَرْضٌ عَشِيرٍ لَا يُخْرِجُونَ
هَنَاءً فِيهَا بَعْدُ وَنِتَوَارَ ثَوَاهُهَا وَنِتَبَايَعُونَهَا

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں ان کا خون حرام ہے۔ قبول اسلام کے وقت جو مال ان کے پاس ہو گا وہ انہی کا رہے گا ایسے ہی زمینیں بھی انہی کی رہیں گی اور اس قسم کی زمینیں عشری ہوں گی جس طرح مدینہ کے باشندوں نے اسلام قبول کیا تو یہ ساری چیزیں انہی کے پاس رہنے دی گئی تھیں اور جس طرح طائف اور بصرہ کے لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا اسی طرح بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ اپنے اپنے چشموں اور اپنے اپنے علاقوں پر باقی رکھے گئے تھے قبیلہ والوں میں سے کسی کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ ان کی چیزوں میں کوئی ایسا تصرف کریں جس کی بنا پر اس کے وہ مستحق بن جائیں اور نہ اس میں کسی (بلا اجازت) کمزور کو روکنا جائز تھا کہ جس کی وجہ سے کچھ حصہ کے وہ مستحق ہو جائیں۔ البتہ انہیں گھاس سے کسی کو روکنا جائز نہیں ایسے ہی چرواہوں اور مویشیوں کو پانی سے روکنا جائز نہیں اور جانوروں اور اونٹوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکنا جائز نہیں ہے۔ ان کی

زمینیں عشری ہوں گی بعد میں بھی ان سے نکالی نہ جائیں گی۔ ان میں وراثت جاری ہوگی اور وہ ان کی خرید و فروخت کر سکیں گے۔

یہی قاضی صاحب پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

وَكُنَّا إِلَيْكَ بَلَاءُ أَسْلَمَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا فَهِيَ لَكُمْ وَمَا فِيهَا ۝
ایسے ہی جس شہر و علاقہ کے لوگ اسلام قبول کر لیں تو ان کی زمین اور ساری چیزیں (سابقہ) انہی کی رہیں گی۔

امام ابو عبیدہؓ کہتے ہیں۔

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں وہ زمین انہی کی ملک رہے گی اور عشر کے علاوہ کچھ نہ دینا پڑے گا۔

پھر آگے چل کر کہتے ہیں۔

كُلُّ أَرْضٍ أَسْلَمَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا فَهِيَ مَالُكَونَ لِرِقَابِهَا كَامِلِدَيْنَةٍ وَ
الطَّائِفِ وَالْيَمِينِ وَالْبَحْرَيْنِ ۝

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں وہ اپنی زمین کے مالک ہوں گے (ضبط نہیں کی جائیگی) اور انہیں انتفاع اور استعمال کا حق رہے گا، جیسے مدینہ، طائف، یمن، بحرین وغیرہ میں یہی کیا گیا تھا۔

الغرض زمانہ خلافت میں مسلمانوں کی زمین جائیداد کا یہی انتظام تھا خواہ وہ غلبہ سے فتح کئے ہوئے مالک کے باشندے ہوتے یا وہ لوگ ہوتے جن سے پہلے مصالحت ہو گئی ہوتی اور بعد میں اسلام کی حمایت و صداقت واضح ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا ہوتا۔ لیکن اس کے علاوہ اراضی سلم کے بارے میں ایک اور بات خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ کہ دراصل اسلام کا مقصد ایک ایسی صالح جماعت بنانا ہے جس کا نصب العین اگلا قدم دوسروں کے لئے رحمت کا ماحول پیدا کرنا ہو تب ہی خواہ اس کی خاطر سے جان و مال قربان

۱۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر واضح ہو جائے گا یہ طریق کار ابتدائی مصالح کے پیش نظر اختیار کیا گیا تھا۔ درنہ خلافت کو حق حاصل تھا کہ وہ اراضیات میں جس طرح کا جی چاہے تصرف کرے کیونکہ اراضی کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھی بلکہ اخراج میں ۱۶ حصہ الاموال صفحہ ۱۳ ۵ ۱۳ ایضاً۔

کڑا ہی کیوں نہ پڑے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان کے دلوں سے ذاتی منفعیت اور عیش و عشرت کا بت نکال کر تریانی کا جذبہ نہ پیدا کیا جائے۔ عام طور سے تو یہ ہوتا ہے کہ با اقتدار جماعت میں جب کوئی فرد داخل ہو جاتا ہے تو اسے ہر قسم کی جائز و ناجائز رعایتیں دی جاتی ہیں اس کی زیادتیوں پر پڑ ڈالا جاتا ہے اور اس کو اتنی زیادہ چھوٹ ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی حق تلفی کر کے خود عیش کر سکے۔ لیکن اسلامی جماعت میں داخل ہونے سے اللہ کے لئے ہر چیز وقف کر دینے کا عہد لیا جاتا ہے اور اپنے کو فنا کر کے دوسرے کی بقا کا سامان فراہم کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے، اسی لئے مسلم کی زمین و جائیداد میں خلافت اپنے اختیارات بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ استعمال کرتی ہے۔ کبھی ترغیب و ترہیب کے ذریعہ اور کبھی قانون کے ذریعہ جیسا کہ تاریخ اسلام میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ مسلم باشندے اپنی جائیدادیں عام مفاد و خلق کے لئے خلافت کے حوالے کر دیتے تھے یا خلافت بوقت ضرورت ان سے لے لیتی تھی۔ چند مثالیں یہ ہیں۔

(۱) ابتداء اسلام میں مدینہ کے مسلم باشندوں نے اپنی زمینیں پانی کی دشواری کی وجہ سے عام مفاد کے پیش نظر رسول اللہ کے حوالہ کر دی تھیں۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمَا قَدْ مَدَّ الْمَدِيْنَةَ جَعَلُوْا لَهُ كُلَّ اَرْضٍ لَا يَبْلُغُهَا الْمَاءُ يَصْنَعُ بِهَا مَا يَشَاءُ ۝

رسول اللہ جب مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے ہر ایسی زمین آپ کے حوالہ کر دی جس میں پانی کا پہنچنا دشوار تھا اور آپ کو اختیار دیدیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔ زمین ملنے کے بعد آپ نے اس کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی کوشش کی اور ابو عبیدہؓ کی رائے کے مطابق آپ نے بلال بن حارثؓ کو اسی زمین سے ”قطیعہ“ عطا فرمایا۔

(۲) خالصہ زمین کا کچھ حصہ حضرت عمرؓ نے قوم بھیلہ کی زمینیں خلافت کے واپس لے لی تھیں۔ قوم بھیلہ کو دیدیا تھا۔ دو تین سال تک ان لوگوں نے

اس زمین کو اپنے قبضہ میں رکھا، لیکن جب خلافت نے مفاد عامہ کے پیش نظر واپس لینا چاہا تو بلاپس و پیش ان لوگوں کو خلافت کے حوالہ کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

قبیل بن حازم کہتے ہیں جنگ قادسیہ (جو ایرانیوں سے ہوئی تھی) کے دن اسلامی فوج میں قوم بھیلہ کے لوگ چوتھائی تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو سواد کا چوتھائی حصہ دیدیا تھا۔ دو یا تین سال تک یہ زمین ان کے قبضہ میں رہی۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے اسی قبیلہ کے چند افراد عمار بن یاسر اور جریر وغیرہ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگ اس زمین کو عام مفاد خلق کے لئے خلافت کے حوالہ کر دیجئے۔ اس پر ان لوگوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور زمین خلافت کے حوالہ کر دی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے جریر کو اتنی دینار عطا فرمائے۔

جب اس واقعہ کی خبر قوم بھیلہ کی ایک عورت "ام کرز" کو ہوئی تو اس نے اپنے حصہ کی زمین واپس کرنے میں پس و پیش کیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آکر عرض کیا کہ

يَا امِيرُ الْمُؤْمِنِينَ اِنَّ اَبِي هَلَكَ وَ سَهْمُهُ ثَابِتٌ فِي السَّوَادِ وَ لَاقِي
لَهُ اُسْلَمٌ فَقَالَ لَهَا يَا اُمُّ كَرْزٍ اِنَّ قَوْمَكَ قَدْ صَنَعُوا مَا قَدْ
عَلِمْتَ فَقَالَتْ اِنْ كَانُوا قَدْ صَنَعُوا مَا صَنَعُوا فَاِنِّي لَسْتُ اُسْلَمُ
حَتَّى تَحْمِلَنِي عَلَى نَاقَةٍ ذَلُولٍ عَلَيْهَا قَطِيفَةٌ حَمْرَاءُ وَ ثَمَلَاءُ كُفَى
ذَهَبًا قَلِيلًا فَفَعَلَ عُمَرُ ذَلِكَ فَكَانَتِ الدُّنْيَا رُخْوًا مِنْ ثَمَانِينَ
دِينَارًا

اے امیر المؤمنین میرے والد کی وفات ہو گئی ہے۔ سواد کی زمین میں اس کا بھی حصہ تھا (جو ترکہ میں مجھے ملا ہے) میں اس کو کبھی واپس نہ کروں گی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اے ام کرز تیری قوم نے بلا چون دجرا واپس کر دیا ہے اور تجھے اس کا اچھی طرح علم ہے، اس نے جواب دیا قوم نے جو کچھ کیا ہے مجھے اس سے سروکار نہیں ہے میں تو اس وقت تک واپس نہ کروں گی جب تک کہ آپ مجھے ایک فرمانبردارا و نشئی نہ دیں جس پر سرخ رنگ کی گرم چادر پڑی ہو اور

زرد مال سے میرا ہتھ نہ بھروں۔ حضرت عمرؓ نے آخرا یہی کیا۔ اور نقدی جو آپ نے اس کو دی تھی اس کی تعداد تقریباً آٹھ دینار کو پہنچ گئی تھی۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خلافت جب چاہے مفاد عامہ کے پیش نظر مسلم باشندوں کو بیدل کر کے ان کی زمینیں لے سکتی ہے اسی طرح یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ اسی صورت میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ اجتماعی مفاد کے ساتھ ذاتی حقوق کی پامنائی نہ لازم آئے۔ لیکن اس واقعہ سے یہ بات لازمی طور سے نہیں ثابت ہوتی کہ خلافت کی جانب سے صاحب زمین کو جو کچھ دیا جائے اس کی حیثیت معادضہ کی ہو یا حضرت عمرؓ نے جو کچھ جریر اور ام کرز کو دیا تھا اس کی حیثیت معادضہ کی تھی جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ جب مفاد عامہ کے پیش نظر اسی صورت پیش آجائے تو خلافت کو بلاوضہ زمین لینے کا اختیار نہیں ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی نمایاں نہیں ہوتی ہے کہ خلافت کی جانب سے اس قسم کے جو کچھ تصرفات کئے جائیں ان میں صاحب زمین کی رضامندی ضروری ہے۔ جیسا کہ ذیل کی تصریحات اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ابو عبیدہؓ کہتے ہیں۔

جو لوگ مفتہ زمین کو اصل باشندوں کے پاس رہنے دینے میں فوجیوں کی رضامندی ضروری سمجھتے ہیں (امام شافعیؒ کا یہی خیال ہے) یہ واقعان کے لئے کیسے دلیل بن سکتا ہے جبکہ اسی جیسے واقعے عراق و شام کی فتح میں اصل باشندوں کے پاس زمین رہنے دینے جلنے کے بارے میں حضرت بلالؓ وغیرہ نے جب حضرت عمرؓ کی مخالفت کی تھی اور زمین کو فوجیوں پر تقسیم کرنے پر اصرار کیا تھا تو آپ نے ان سب کے متعلق فرمایا: **اَللّٰهُمَّ اَكْفِيْنَهُمْ** (اے اللہ تو ہی ان کے لئے کافی ہے) اس وقت کون سی ان لوگوں کی رضامندی مطلوب تھی جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ یہاں بھی حضرت عمرؓ ام کرز کو راضی کرنا چاہتے تھے اور بغیر رضامندی کے نہیں بیدل کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

ابو بکر جصاص قوم بجیلہ کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

اس واقعہ میں ان کی رضامندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ بات صاف طور پر کہہ دی تھی کہ زمین کو واپس کئے بغیر چارہ نہیں ہے اور اس میں لوگوں کی کھلائی ہے۔ باقی رہا ام کمر ز عورت کا معاملہ تو اس کو حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے (بطور امداد) رقم دی تھی۔ ویسے بھی خلیفہ کو اختیار تھا کہ عورت کے قبضہ کی زمین واپس لئے بغیر سرکاری خزانہ سے اس کو عطیہ دیتے۔

بہر حال مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت جب صاحب زمین کو بے دخل کرنا چاہے تو نہ اس کی رضامندی ضروری ہے اور نہ اس کا معاوضہ ادا کرنا لازمی ہے البتہ اس شخص کے ذاتی حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کہیں اس تصرف کی وجہ سے وہ پائمال نہ ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو زمین و جائیداد رکھنے سے قانوناً منع کر دیا تھا
حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں مسلمانوں کو زمین و جائیداد رکھنے اور کاشتکاری کرنے سے قانوناً منع کر دیا تھا اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ جب سب لوگوں کے اہل و عیال تک کے وظیفہ سرکاری خزانہ سے دیئے جاتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ لوگ انسانیت کی خدمت کے لئے وقف نہ ہوں اور بیلوں کی دم کے پیچھے لگے رہیں۔

علامہ طنطاوی جوہری اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔
فَلَمَّا كَثُرَتِ الْأَمْوَالُ فِي أَيَّامِ عُمَرَ وَوَضَعَ الدِّيَّانَ فَرَضَ الرَّقَاقَ لِلْعُمَّالِ وَالْقُضَاةِ وَمَنْعَ الدِّخَارِ الْمَالِ وَحَرَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ اقْتِنَاءَ الصِّيَاغِ وَالزَّرَاعَةِ وَالْمُزَارَعَةَ لِأَنَّ أَرْزَاقَهُمْ وَأَرْزَاقَ عِيَالِهِمْ تُدْفَعُ لَهُمْ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں جب مال بہت بڑھ گیا تو باقاعدہ رجسٹر مرتب کئے گئے، لوگوں کے وظیفہ مقرر ہوئے، عالموں اور قاضیوں کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، سرمایہ جمع کرنے سے روک دیا گیا

کاشتکاری خود کرنے یا دوسروں سے کرانے دونوں کی مانعت کر دی گئی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے مع ان کے بال بچوں تک کے وظیفہ بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے۔

ایک اہم قانون غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا تو اس کی تمام جائیداد غیر منقولہ ضبط کر کے بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس نو مسلم کا سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو فاروق اعظمؓ کے اس فیصلہ میں حکومت الہی کے خلیفہ کی انجام دہی اور مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

درہل اس مانعت کے قانون سے خلیفہ کے پیش نظر یہ بات کھتی کہ اگر یہ لوگ (مسلمان) زمین جائیداد اور مال جمع کرنے کے پیچھے پڑ گئے تو ظلم و فساد کے دروازے کھل جائیں گے اور خدمت خلق کے بجائے رجو ان کا مقصد زندگی ہے، دیگر حاکموں کی طرح ان کو بھی دوسروں کے خون چوسنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے علاوہ عیش و عشرت میں جنس کر یہ لوگ اپنے اصلی جوہر جو انحرافی بہادری، جفاکشی، ہمت، عزیمت وغیرہ کھو بیٹھیں گے جس کا نتیجہ بعد میں یہ ظاہر ہو گا کہ جو جماعت محض خدمت خلق اور رحمت الہی کو عام کرنے کے لئے زندہ ہے پھر اسے زندہ رہنے کا حق باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بعد کے مسلمان جب مال دولت اور جائیدادوں کے چکر میں الجھ گئے تو اس جماعت کے بلند اوصاف اور پاکیزہ صفات میں فرق پڑ گیا اور ان کے چھلی جو ہر جن سے اس جماعت کی خمیر تیار ہوتی تھی وہ سب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی **مانعت کا یہی قانون نافذ کیا تھا** **علامہ طنطاوی کہتے ہیں۔**

وَأَيُّ هَذِهِ الْقَاعِدَةِ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَكَانَ يَحْتَدِ ابْنُ
الْخَطَّابِ بِكُلِّ خَطْوَاتِهِ

اور حضرت عمرؓ کے اس قانون کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے نافذ کیا اور وہ حضرت عمرؓ کے ہر نقش قدم پر چلتے تھے۔

وہ قانون یہ تھا۔

(۱) فَقَالَ أَيُّمَا ذِيٍّ اسْلَمَ فَإِنَّ إِسْلَامَهُ يُعْرِضُ لَهُ نَفْسَهُ وَمَالَهُ
وَ مَا كَانَ مِنْ أَرْضٍ فَإِنَّهَا مِنْ قِيٍّ اَللّٰهِ عَلَى الْمُسْلِمِينَ۔

اعلان کرادیا کہ جو ذی (غیر مسلم) اسلام قبول کرے اس کی جان اور اموال منقولہ محفوظ رہیں گے
لیکن اموال غیر منقولہ مسلمانوں کے لئے اللہ کی فتنے ہو جائیں گے۔

(۲) وَ أَيُّمَا قَوْمٍ صَالَحُوا عَلَى حِزْبَةٍ يُعْطُونَهَا فَمَنْ اسْلَمَ مِنْهُمْ
كَانَتْ دَارُهُ وَ اَرْضُهُ لِبَقِيَّتِهِمْ۔

اور جن لوگوں سے معاہدہ ہو گیا ہے وہ لوگ اگر اسلام قبول کر لیں تو اموال غیر منقولہ اسی قوم
کے بقیہ لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

یہ چند مثال ہیں جن سے ایک طرف تو مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح
ہوتی ہے کہ اسلامی نظام حیات کا اپنے لئے والوں سے کتنا بلند اخلاق اور قربانی کا مطالبہ ہے اور نہ ملنے والوں کے
ساتھ کتنا اور کس قدر منصفانہ سلوک ہے۔

آج بھی دنیا کی مہذب قوموں میں اپنی پارٹی والوں کے ساتھ دور رعایت جائز سمجھی جاتی ہے اور پارٹی والے
اقتدار حاصل کرتے ہیں کہ وہ اوروں کا خون چوس کر خود عیش و عشرت کر سکیں۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت میں
مسلمان ہو کر کسی کا ناجائز طریقے پر مال لینے کا خیال تو الگ رہا، خود اس کا مال و جائیداد غیر مسلموں میں تقسیم کر دینے
کا حکم ہے۔

(جون ۱۹۵۹ء)



زرعی اصلاحات

۱۹۵۹ء میں، حکومت پاکستان کی طرف سے زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ اس پر طلوع اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۵۹ء میں حسب ذیل تبصرہ شائع ہوا۔

حکومت کی طرف سے زرعی اصلاحات کے لئے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اس نے اپنی سفارشات مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر دیں۔ کابینہ نے ان پر غور و خوض کے بعد کچھ فیصلے کئے۔ ان فیصلوں کا ملخص، محترم صدر مملکت پاکستان نے ریڈیو سے نشر کیا۔ ان میں سے قرآنی نقطہ نگاہ سے اہم فیصلے یہ ہیں کہ (i) کوئی شخص ایک خاص رقبہ سے زیادہ زمین اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکے گا۔ (ii) زائد زمین کو حکومت معاوضہ دیکر اپنی تحویل میں لے لیگی۔ جاگیروں کا معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ (iii) اگر کسی کے پاس ایک خاص معینہ رقبہ سے کم زمین رہ جائے تو وہ تقسیم نہیں ہو سکے گی۔ بغور دیکھئے تو ان میں دو فیصلے ایسے ہیں جنہیں اصولی کہا جائے گا۔ یعنی ایک خاص رقبہ سے زائد زمین، مالکان اراضی سے لے لی جائے گی اور ایک خاص رقبہ سے کم اراضی تقسیم نہیں ہو سکے گی۔

زمین کی ملکیت کے متعلق قرآنی مسلک کی وضاحت ایک مدت سے طلوع اسلام میں ہوتی چلی آ رہی ہے اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی ربوبیت (پرورش) اور ہدایت (راہ نمائی) اپنے ذمے لی۔ ربوبیت کے لئے اس کا سامان روز زمین میں جمع کر کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ وہ اس میں سے حسب ضرورت نکال کر کھاتا رہے۔ راہ نمائی کے لئے اس نے اپنے رسول بھیجے شروع کر دیئے۔ ربوبیت اور ہدایت کے بذمہ خدا ہونے کا لازمی نتیجہ تھا

کہ یہ چیزیں بطور موبیت (بلا قیمت و بلا معاوضہ) ملیں گی۔ چنانچہ جہاں ہر رسول یہ اعلان کرتا رہا کہ مَا اسْتَلْکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجرٍ۔ ”میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔“ زمین کے متعلق اس نے کہہ دیا کہ یہ سَمَوَاتِ لِلّٰہِ شَاطِیْلُہٗنَّ ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیے۔ یہ تھا انتظامِ خداوندی، لیکن چونکہ زندگی کے ایجنج پر ابلیس بھی ”آدم“ کے ساتھ ہی آگیا تھا، اس لئے اُس نے خدائی نظام کے بگاڑنے میں ہر ممکن کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقہ نے (طاقت کے زور پر) مادہ ارض کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا اور دوسرے نے ہدایت (خدائی راہ نمائی) پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی اور یوں رزق اور ہدایت رُخِ خدا کی طرف سے مفت ملے بھتے قیمتاً بکے لگ گئے۔ انسانیت کی تاریخ اسی کشمکش کی داستان ہے جس کی رو سے حزبِ اللہ (خدائی جماعتیں) رزق و ہدایت کو نوحِ انسانی کے لئے عام کرتیں اور حزبِ الشیطان (ابلیسی قوتیں) ان پر اجارہ داری قائم کرتی چلی آرہی ہیں۔ یعنی اس کشمکش میں موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) ایک طرف ہوتے ہیں اور فرعون، قارون اور ہامان دوسری طرف۔ اسی داستان کا حسین ترین باب حضرت خاتم النبیینؐ کا عہد ہما یوں تھا جس میں رزق کے سرچشمے اور شمعِ ہدایت عالمگیر انسانیت کے لئے عام ہو گئے۔ اس میں نہ کسی سرمایہ دار و زمیندار و جاگیردار کا نام و نشان باقی رہا اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کا وجود۔ اور یوں ”زمین اپنے نشوونما دینے والے کے فور سے جگمگا اٹھی“۔ لیکن اس کے بعد پھر غریبِ آئی قوتوں نے زور پکڑ لیا اور سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت نے سر اُٹھا کر لیا۔ قرآن نے کہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں آخر الامر حق، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن اگر ہر کشمکش کو تنہا خدا کے کائناتی قانون کے سپرد کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت دیر میں جا کر برآمد ہوتا ہے کیونکہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے، اور اگر اس کے ساتھ انسانی دست و بازو بھی شریک ہو جائیں تو اس کے نتائج بہت جلد سامنے آجاتے ہیں۔ جس چیز کو عام طور پر ”زمانے کے تقاضے“ کہا جاتا ہے وہ خدا کے کائناتی قانون کے مخفی اشارے ہوتے ہیں۔ زرعی اصلاحات کے سلسلے میں موجودہ اقدامات انہی تقاضوں کے منظر میں۔

ہمارے ہاں ردیگر مسلم مالک کی طرح، مفاد پرست گروہ کا موقف یہ تھا کہ انہیں زمین پر ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہے۔ ان کے اس موقف کی تائید مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھی جو اس قسم کے فتاویٰ جاری کرتے تھے کہ

”اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔۔۔۔۔ جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ۔ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار۔ اتنا صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی۔ اتنی موٹریں۔ اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔“

(مسئلہ ملکیت زمین - انسداد ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۷۲، ۷۳)

یہ موقف اور یہ اصول، قرآن کے یکسر خلاف تھا۔ حکومت نے یہ فیصلہ کر کے کہ ایک خاص رقبہ سے زائد زمین حکومت کی تحویل میں آجائے گی زمینداروں کے اس موقف اور افانوں کی خود ساختہ شریعت کے اس اصول کو توڑ کر رکھ دیا ہے اور اس طرح قرآنی اصول و نظام کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے۔ ہمارے نزدیک حکومت کا یہ اقدام مستحق ہزار مبارکباد ہے کہ اس سے زمینداری کے غیر اسلامی نظام کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت نے فاضلہ رقبوں کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے موجودہ ”مالکوں“ کو معاوضہ دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے لیکن اس سے ذاتی ملکیت کا اصول بہر حال باقی نہیں رہتا۔ ”ذاتی ملکیت“ کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو اس کا حق نہیں کہ وہ مالک کی رضامندی کے بغیر اس شے کو اس کے قبضے سے نکال کر اپنے قبضے میں لے لے یا کسی دوسرے کے قبضے میں دے۔ جب حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اتنے رقبے سے زائد رقبہ کو حکومت اپنے قبضہ میں لے لیگی تو اس سے ملکیت کا دعویٰ منزلزل ہو گیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب ہے اور جب سے مسلمانوں میں سرمایہ داری اور زمینداری کا نظام آیا ہے اس قسم کے انقلاب کی مثال نہیں ملتی۔ ہم نے دسمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت کے لمحات میں لکھا تھا کہ

”جہاں تک زمینداروں کا تعلق ہے اگر سردست یہ ناممکن ہو کہ زمین کو بالکل انفرادی ملکیت سے نکال لیا جائے تو پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی ملکیت کے رقبوں کی اس طرح تحدید کر دی جائے کہ نہ کسی کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین رہے اور نہ کوئی کاشتکار زمین کے مناسب قطعہ سے محروم رہے۔ قدم اول کی حیثیت سے یہ تحدید بجائے خویش قرآن کے منشاء کے مطابق ہوگی۔“

لشدا الحمد کہ حکومت کا یہ پہلا قدم اس کے مطابق اٹھا ہے۔ ہماری ذاتی رائے میں پانچ صد ایکڑ نہری یا

ایک ہزار ایکڑ بارانی رقبہ جو بعض حالات میں اس سے بڑھ سکتا ہے زیادہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ رقبہ کی مقدار اتنی ہونی چاہیے تھی جس سے ایک خاندان باعزت گزارہ کر سکے۔ پانچ صد ایکڑ رقبہ اس سے بھی زیادہ رقبہ اراضی کی آمدنی اور زائد رقبہ کا زر معاوضہ، مترفعین کے اس طبقہ کو باقی رکھے گا جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے اور فاضلہ دولت کے بل بوتے پر معاشرہ پر مختلف نوعیتوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے یہ قدم اول بہر حیثیت موجودہ صورت حالات سے کہیں بہتر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے ذاتی ملکیت کا اصول متزلزل ہو جاتا ہے۔

ہمارے ”ارباب شریعت“ کی طرف سے زمین پر ذاتی ملکیت کی تائید میں دوسری دلیل یہ دیکھائی گئی کہ اگر زمین پر ذاتی ملکیت نہ رہے تو قانون وراثت کا کیا بنے گا۔ ہم نے انہیں بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جب قرآن کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو اس معن میں قانون وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنی بات کو برابر دہرائے چلے جاتے۔ حکومت نے اب فیصلہ کیا ہے کہ اگر رقبہ اراضی ایک خاص کمتر حد تک پہنچ جائے تو اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) کسی شخص کے پاس دس ایکڑ زمین ہے اور اس کے چار لڑکے ہیں۔ ہمارے ارباب شریعت کے خیال کے مطابق یہ زمین ان چار لڑکوں میں بٹ جانی چاہیے۔ لیکن حکومت کے حالیہ فیصلہ کے مطابق یہ زمین ان لڑکوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قطعہ اراضی کی آمدنی میں ان سب لڑکوں کا حصہ ہو گا اور اس اعتبار سے وہ متوفی کے ترکہ کے وارث قرار پائیں گے۔ لیکن جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس فیصلہ سے قانون وراثت اپنی جگہ سے ضرور ہل جاتا ہے۔ موجودہ قانون وراثت کی رو سے ان لڑکوں و متوفی کے ورثا کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ اس رقبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے حصے کے مالک بن جائیں۔ لیکن حالیہ فیصلے کے مطابق وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ انہیں اس رقبہ کا مشترکہ انتظام کرنا ہو گا ورنہ حکومت اسے مناسب وضع دے کر اپنی تحویل میں لے لیگی۔ اس سے وراثت میں زمین پر حق ملکیت کا اصول ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ اصول قائم ہو جاتا ہے کہ حکومت، عوام کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے زمین کا جس قسم کا انتظام چاہے کر سکتی ہے۔ اور یہی قرآن کا منشاء ہے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ زائد زمین کا معاوضہ دے کر اسے اپنی تحویل میں لے لیا جائے اور پھر اسے کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ جاگیرداری کی طرح

زائد زمین بھی بلا معاوضہ حاصل کرنی جاتی اسے بلا قیمت کاشتکاروں میں حسب ضرورت تقسیم کر دیا جاتا۔ یہ انتظام زمین کے متعلق قرآنی تصور سے زیادہ قریب ہوتا۔ بایں ہمہ یہ اعلان بڑا اطمینان بخش ہے کہ حکومت کی طرف سے زمین کے اس لین دین کے سلسلہ میں خزانہ عامرہ پر کسی قسم کا کوئی بار نہیں پڑے گا۔ اور کنویں کی مٹی کنویں میں لگا دی جائے گی۔

حکومت کی طرف سے شائع شدہ پریس نوٹ میں (جواب ہمارے سامنے آیا ہے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو رقبہ اراضی "گزارہ کی حد تک" سمٹ جائے اس کا کوئی حصہ زمین - بیع - یا ہبہ کے ذریعے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ پورے کا پورا الگ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ زمین کو زمین رکھنے کی قطعاً اجازت نہ دی جاتی اور بیع کی صورت میں یہ پابندی لگا دی جاتی کہ اسے صرف حکومت کے پاس فروخت کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد حکومت اسے اس شخص کے ہاتھ فروخت کرتی جس کے پاس اس کی ضرورت سے کم رقبہ ہو۔ اگر بیع پر اس قسم کی پابندی نہ لگائی گئی تو رفتہ رفتہ یہ چھوٹے چھوٹے قطعات رپانچہ یا ایک ہزار ایکڑ کی حد تک، چند نفوس کے پاس اکٹھے ہوتے جاتے گئے اور مالک کاشتکاروں کی حیثیت پھر مزارعوں کی رہ جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مزارعوں کے حقوق کے تحفظ کے حالیہ فیصلوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسی شکل پیدا نہ ہونے دی جائے جس میں پانچ پانچ سو ایکڑ والے زمیندار کثرت پیدا ہو جائیں اور محنت کرنے والے مزدور کے مزدور رہ جائیں۔

پریس نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذاتی اوقاف کی اراضیات ان لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں گی جو اس وقت صرف ان کی آمدنی سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ بھی نسبتاً بہتر ہے۔ قرآن کی روش سے وقت کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کسی مردہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ زندہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے اور اس طرح اپنے اختیارات کو ابدیت سے ہمکنار کر دے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ افتادہ زمینوں کے مالکان کو نوٹس دیا جائے گا کہ وہ ایک مدد معینہ کے اندر اندر رقبہ کو زیر کاشت لائیں۔ بصورت دیگر حکومت اس زمین کو اپنی تحویل میں لے لیگی۔ یہ فیصلہ بھی بڑا استحسن ہے۔ اس سے بھی اصول ملکیت کی عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جو چیز زید کی ملکیت میں ہے، زید کو حق حاصل ہے کہ اسے استعمال میں لائے یا دوسرے ہی پڑا رہنے دے۔ قرآن اس قسم کا حق ملکیت اساسی طور پر کسی شے میں بھی تسلیم نہیں کرتا۔ نہ زمین میں وحشی کہ نہ انسان کی اپنی جان میں۔

یہ چیزیں نوع انسان کی منفعت کی ہیں اور انہیں قوانین خداوندی کے مطابق، اس مقصد کے لئے صرف میں لانا چاہیئے۔



یہ ہیں بہر حال، وہ چند موٹی موٹی تفصیلات جو حکومت کے عالیہ فیصلہ کے سلسلے میں ان سطور کی تسوہ تک سلسلے آئی ہیں جیسا کہ ہم نے ابتداء میں لکھا ہے حکومت اپنے اس فیصلہ کے لئے مستحق تبریک و تہنیت ہے۔ یہ سببیت مجبوری یہ زمین کے انتظام کے ضمن میں قرآنی نظام کی طرف قدم اول ہے جسے فی الحقیقت بڑی جرأت سے اٹھایا گیا ہے۔ یہی وہ احساس تشکر و تبریک ہے جس کے اظہار کے لئے حسب ذیل تلامذہ قرآنک ریسرچ سینٹر اور ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے جنرل محمد ایوب خان، صدر مملکت پاکستان کی خدمت میں ارسال کیا گیا ہے۔

زرعی اصلاحات کے جرأت مندانہ اقدام پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ قرآن کی روش زمین کو عوام کی ضروریات پورا کرنے کے لئے حکومت کی تحویل میں رہنا چاہیئے ان اصلاحات نے زمین پر ذاتی ملکیت کے غیر قرآنی اصول کی بنیادیں ہلا کر اور رقبوں کی تحدید سے قرآنی نظام کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اور بیباکانہ اٹھایا ہے۔ اس سے ملک کی معاشی حالت خوشگوار ہو جائے گی اور کمیونزم کا سیلاب رک جائے گا۔ خدا آپ کو مزید ہمت عطا فرمائے تاکہ آپ اس آئیڈیولوجی کو جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا، عملی حقیقت بنائیں اور اس طرح یہ خطہ زمین اسلامی پنج زندگی کا گہوارہ بن جائے۔

ہم اس مقام پر دہرائیں کہ قرآنی نظام ربوبیت کے مطابق، تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کو ادا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہوتی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ براہونے کے لئے حکومت ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔ ان پر ملکیت نہ افراد کی ہوتی ہے نہ ملکیت کی۔ ذرائع پیداوار میں ضرورت زمین ہی شامل نہیں۔ دور حاضر میں کارخانے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب حکومت، کارخانوں کے نظام کے متعلق بھی اسی قسم کی اصلاحات پر توجہ دے گی۔ اس لئے کہ جو خرابیاں زمین سے حاصل شدہ لاغور دولت سے پیدا ہوتی ہیں اسی قسم کی خرابیاں کارخانوں سے حاصل کردہ لاغور دولت سے بھی رونما ہوتی ہیں قرآن ان خرابیوں کا علاج یہ بتاتا ہے کہ فاضلہ (ضرورت سے زیادہ) دولت کو کسی کے پاس بھی نہ رہنے دیا جائے۔ اسے قوانین خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی منفعت

کے لئے عام کر دیا جائے، خدا کرے ہماری حکمت بتدریج اس منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح ایک ایسے انسانیت ساز معاشی نظام کو متشکل کر دکھائے جس کے سامنے امریکہ اور روس دونوں کی نگاہیں جھک جائیں۔

یارب این آرزوئے من چہ خوش است



اقبال اور اشتراکیت

(شائع شدہ اپریل ۶۳ء)

اقبال نے اپنے آپ کو "شاعرِ سرود" کہا تھا۔ چونکہ قوموں کی زندگی میں امروز و فردا صدیوں کے پیمانے سے ملے جاتے ہیں اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس فردا کا طلوع کب ہو گا جب مسلمان اقبال کے صحیح مقام اور اس کے پیغام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکے گا۔ لیکن یہ حقیقت تو ابھی سے بے نقاب ہونا شروع ہو گئی ہے کہ اقبال "ویا غصیر" کا شاعر تھا۔ چنانچہ آج انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی میں اقبال کے کلام کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور اس کی شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن خود پاکستان میں یہ حالت ہے کہ سال بھر کے بعد اپریل کے مہینے میں دو چار مقامات پر انفرادی طور پر "یومِ اقبال" کے جلسے منعقد کر لئے جلتے ہیں اور اس کے بعد اس "دفن ہے معنی" کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ دورانِ سال میں اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کسی نوال نے اقبال کی کوئی غزل گا دی یا کبھی ریڈیو والوں نے اپنے پروگرام کا خلا پُر کرنے کے لئے اس کی کوئی نظم سنوا دی۔ یوں یاد قائم کی جا رہی ہے اس شخص کی جس نے (اور کامِ باتوں کو چھوڑ بیٹے) اس قوم کو اس پاکستان کا تصور دیا۔ جس سے اب اس کی زندگی وابستہ ہے اور جس کی وجہ سے اسے وہ مواقع حاصل ہو گئے ہیں کہ اگر یہ چاہے تو دنیا کی ممتاز ترین قوموں کی صف میں جگہ پاسکتی ہے۔ اتنی بڑی احسان فراموشی مسلمانوں ہی سے ظہور میں آسکتی تھی۔

ہمارے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو پھر سے دستان سے

آشنا کرنے میں سلسلہ جدوجہد کی۔ اس میں مشہد نہیں کہ ملک پاکستان بھی ایک گراں بہا نعمت ہے۔ لیکن اقبال کے الفاظ میں ”ملکت ایک کوشش ہوتی ہے (ستر آتی) نصب العین اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی“ یہ ایک آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں رو بہ عمل لانے کی۔ یعنی اسلامی نقطہ نگاہ سے ملک کی اہمیت محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھلنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انہیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

اقبال نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھا یا قرآن سے سمجھا یا قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر معین چھوڑتا ہے تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کرتی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہے، وہ ردی کا مسئلہ ہے۔ اس میں مشہد نہیں کہ جب انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے ردی کا مسئلہ اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ نے ایک عالمگیر تعلق کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا۔ اپنے دور کے ایسے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور قرآن نے اس باب میں جو راہ نمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبال کا پہلا دور ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا ہے۔ دوسرا دور اس حل پر غور و فکر کرنے کا اور اسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو نہایت عقل انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس اثر پذیری کی آواز ہم سب سے پہلے ”خضر راہ“ میں سنتے ہیں۔ جب وہ خضر سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟

اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیا خروش؟

اور اس کے جواب میں خضر کہتا ہے

بندہ مزدور کو جب کہ مرا پیغام دے
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
مگر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
خضر کا پیغام کیسا ہے یہ پیغام کائنات
شلخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برتا
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدورات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس کے بعد پیغام مشرق میں دیکھے۔ وہ "صحبت زمکاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں، ٹالسٹائی کہتا ہے۔

بارکش اہرن لشکری شہر یار
داروئے ہیوشیش تاج، کلیسا، وطن
از پئے نان جوں تیغ ستم بر کشید
جان حن داد اور اخو اجہ بجائے خرید
کارل مارکس کہتا ہے۔

راز دان جزو دکل از خویش نامحرم شد است

آدم از سرمایہ دار کی متاقل آدم شد است

ہیگل اپنا فلسفہ اصدا پیش کرتا ہے، اور ٹالسٹائی "لسے" عقل دورو" کی چابک دستی قرار دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔ مزدک اعلان کرتا ہے کہ

دور پر دیزی گذشت اے کشتہ پر دیز خیز
نعمت گم کردہ خود را ز خسرو باز گیر

فرانسینی فلاسفر کو مٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ ————— نیاید محمود کار ایاز ————— اور
مزدور ایک پر معنی بسم سے جواب دیتا ہے کہ

حق کوہ کن دادی لے نکتہ سنج
بہ پرویز پر کار و نا بردہ رنج

آخر میں "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے

کرتا ہے جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ

غوغائے کارخانہ آہن گری و سن

نخلے کہ شہ خراج برومی نہد زن

اس خاک و آئینہ در شکم ادا از آن بن

اور اس کے بعد "نولے مزدور" میں کہتا ہے کہ

بیا کہ تازہ نوای نژاد و از رگ ساز

مغان و دیرمغان را نظام تازہ دہیم

ز رہزنان چین انتقام لالہ کشیم

یہی دعوت انقلاب ہے جسے ہم "زبور عجم" میں اس سے بھی تیز انداز میں دیکھتے ہیں۔ جہاں اقبال کہتا ہے کہ

خواجہ از خون رگِ مزدور ساز و دلِ تپا
از جفلے وہ خدایاں کشت ہتھکانِ خرا

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام
آنچنان زہرے کہ از دے مار بار بیج و تاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

"بال جبرلی" میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظام سرمایہ پرستی کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے

احتجاج ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

خلق خدا کی گھات میں زند و فقیہ میر پور
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو
کارِ امرار کے درو دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دھقان کو سینہ پیزی
میں کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اسی کتاب میں لینن کا وہ مشہور شکوہ بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ

تو تار و عا دل ہے مگر تیرے جہاں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

یہی نظام سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج جنہیں اقبال کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلبِ حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اوپر اُبھرے۔ یہی ہیں وہ اشعار جنہیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے ثابت کرتے ہیں کہ اقبال بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اقبال کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لے لے جبکہ غریب اور اسکے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے۔ جو قرآن سے راہ نمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لیے اقبال بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر وہ اس دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی ہیکل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی مادی تعبیر۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبال مسلمان تھا اس لیے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ وہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں (جولائی ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا) کہ

سوشلزم کے معنی ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے ایون تھو کہتے ہیں۔ لفظ ایون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مردوں کا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے سیاسی مفہوم کا..... سچو روحانیت میرے نزدیک منضوب ہے۔ یعنی ایون کی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

میرے وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو ”کلیم“ تو کہتا ہے لیکن بے تحاشی اور ”سیح“ قرار دیتا ہے۔ لیکن بے غلیب۔ حتیٰ کہ وہ جاوید نامہ میں افغانی کی زبان سے یہ کہلاتا ہے

صاحب سرمایہ از نسلِ خلیل یعنی آل پیغمبر بے جبریل
زانکہ حق در باطل اور مضمر است قلب او مومن و داعش کافر است
غربیاں گم کردہ اندا فلاک را در شکم جویند جان پاک را

دین آل پیغمبر ناحق شناس

بر مساوات شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خاص مادی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت یکسر مردہ ہو جاتی ہے۔ لہذا اس قسم کی اشتراکیت ہو، یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔

ہر دور احباب ناصبور و ناشکیب ہر دوریزداں ناشناس آدم فریب
زندگی این را حنروج آل را خراج در میان این دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دور اور آب دگل ہر دور اتن روشن و تاریک دل

زندگانی سو ختن با ساختن

در گلے تخم دے انداختن

یہی ”سو ختن با ساختن“ ہے جسے اقبال لا اور لا کے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لا کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ ”ساختن“ یعنی لا (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ ”پس چہ باید کرد“ میں روس کی اسی کشمکش کے بارے میں کہتا ہے۔

روس را قلب و جگر گریدیدہ خوں از ضمیرش حرف کا آمد بروں
اس نظام کہنہ را بر ہم زداست تیر نیشتہ بر رگ عالم زداست
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ! لا سلاطین لا کلیسا لا الہ

فکرا و درتند باد لا بساند

مرکب خود را سوئے الا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دور شروع ہوتا ہے، جہاں اقبال اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل

پیش کرتا ہے وہ سب سے پہلے "سوضن اور ساضن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ
 نکتہ می گویم از مردانِ حلال امتاں را "لا" جلال "الاق" جلال
 لا و الا احتساب کائنات لا و الا منہج باب کائنات
 برودت قدر چہاں کاف و لون حرکت از لا زاید از لا سکون
 در مقام لا نیا ساید حیات سوئے الا می حشر لہ کائنات
 لا و الا ساز و برگ امتاں

نئی بے اثبات مرگ امتاں
 لا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور الا کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام قائم
 کرنا یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جاسکتا ہے اور مستقل اقدار عقل کی رو سے کبھی
 نہیں مل سکتیں۔ یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اس لئے کہ

عقل خود میں غافل از ہیود غیر سود خود بیند، نہ بیند سود غیر
 وحی حق بیند سود ہمہ در نگاہش سود و ہیود ہمہ
 اسی لئے اقبال نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ
 تو کہ طرح دیگر سے اندختی دل زدستور کہن پر داحتی
 کردہ کار خدا و خداں تمام بگذر از لا جانب الا حشرام
 در گذر از لا اگر جو منندہ تارہ اثبات گیری زندہ

اے کہ می خواہی نظام عالمے

جستہ اور اساس محکمے؟

اقبال کے نزدیک نظام عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس و شران کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے
 اس نے روس سے کہا کہ

فکرار روشن کن از اتم الکتاب

داستان کہنہ شستی باب باب

اس کے بعد وہ کہتا ہے

دستگیر بندہ بے ساز و برگ

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا

ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

چیت قرآن؟ خواجہ رامعین ام مرگ

بیخ خیر از مردک ز کرش مجو

باملاں گفت جاں برکت بہنہ

اقبال کو خالی تخریبی پروگرام کی ناکامی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی ”پس چہ باید کرد“ میں یہاں تک کہہ دیا کہ

آیدش روزے کہ از زور حسنوں

خویش رازیں تند باد آرد بروں

اقبال اپنے ایک خط میں جواہروں نے سرفرانس ینگ ہرنیڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا

راہر جوا ۳ جولائی کے مول ٹیڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا، لکھتے ہیں۔

”ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لادھرم ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی

عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ

باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دھرمیت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس

ملک میں حالات کھٹک ہو جائیں گے اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا

وقت ملے گا۔ وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔ چونکہ بالشویت

کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے مجھے ذرا بھی

تعجب نہ ہوگا۔ اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو ہضم کر لے یا اسلام روس کو“

لیکن اقبال ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان

ہو جائے تو مسلمان کابول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ ہی کہتا

تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنی ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہذا اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اس وقت

زمنے کے تقاضوں سے جو معاشی کشمکش پیدا ہو رہی ہے، تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ اس

تمہیں قرآن ایسی راہنمائی دیدے گا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوام

عالم کی قیادت تمہاری حق میں آجائے گی۔ چنانچہ وہ ضرب کلیم میں کہتے ہیں کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرہی رفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ عبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بزار
انساں کی ہوس نے جنہیں کھا تھا کھپا
کھلے نظر آتے ہیں بتدریج وہ ہمارا
ستران میں ہو غوطہ زن لے مہرِ مسلمان
اللہ کیسے تجھ کو عطا جنت کر دار

جو حرف "قَتْلُ الْعَفْو" میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبال نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن میں غور کیا تو اس کے
سلئے یہ حقیقت آگئی کہ قرآن کی رو سے رزق کے فطری سرچشموں پر کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور کبیرِ مال
ہے۔ خدائے رب العالمین نے سامانِ رزق کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے
اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے سرچشمے زمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے زمین کے
متعلق اقبال صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ

حق زمین را بجز متاعِ ماندہ نغفت
ایں متاع بے بہا مفت است مفت
وہ خدا یا نکلستہ از من پذیر
رزق و گور از دے بگیر اورا ملگیر
باطن "الارض للذی" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کا مضر است
رزق خود را از زمین بردن رواست
ایں متاع بندہ و ملک خداست

آب و نان ماست از یک ماندہ

دودۃ آدم کے خفیں و احداۃ

بالِ جبریل میں قرآن کی اس حقیقت کو اور کبھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جہاں لکھا گیا ہے کہ
پالست ہے بیج کوئی کی تاری میں کوئی
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھانا ہی سحاب
خاک کیس کی ہے کس کا یہ نورِ آفتاب
کون لایا کھینچ کر پھیم سے بادِ سازگار
موسوں کو کس نے سکھائی ہے خوشے انقلاب
کس نے بھروی موتیوں سے خوشہ گندم کی

وہ خدا یا یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں!

اقبال، پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس قانون کو رائج کیا جاسکے، چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے صرف ایک سال پہلے قائد اعظم کو ایک خط میں لکھا کہ "ردی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے..... لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے..... شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے..... اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترمیم، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا..... ان مسائل کے حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اس شد لازمی ہے"

یعنی اقبال کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت ہی اس لئے تھی کہ یہاں اسلام کو شلزم کا نفاذ کیا جاسکے۔ جیسا کہ اقبال کو خود اندیشہ تھا، لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا۔ جس کا نتیجہ لیگ ان کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔



ربو کی بحث

(کیا معاوضہ محنت کلہے یا سرمایہ کا؟)

[آج سے کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں یہ بحث بہت زور دے رہی تھی کہ اسلام نے جس سود کو حرام قرار دیا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد سود مفرد ہے۔ سود در سود (سود مرکب) نہیں۔ ایک گوشے سے یہ آواز بلند اٹھی کہ کسی کو نجی ضروریات کے لئے قرض دے کر سود لینا تو حرام ہے لیکن کمرشل انٹرسٹ جائز ہے۔ کمرشل انٹرسٹ سے مراد ہے کسی کو تجارت کی غرض سے قرض دینا۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ بینک کا سود جائز ہے۔ غرضیکہ قطبی زبائین اپنی باتیں سننے میں آئیں۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام کی فروری ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں اس موضوع پر کچھ تفصیلاً لکھا گیا جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آجائے گی کہ ربو درحقیقت ایک ایسی اساس کا نام ہے جس پر ایک ایسے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے جو اسلام کے معاشی نظام کی منہ ہے۔ اسی لئے قرآن نے ربو کو ”خدا اور رسول“ (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ سے تعبیر کیا ہے۔]



قرآن کی رو سے ربو کی جامع الہامی تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے۔ جو سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۹ میں آئے ہیں۔

قرآن کی رو سے ربو کی تعریف

یعنی

وَ اِنْ شِئْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ

اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا پس المال ہے۔

سابقہ آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم ربو لینے سے باز نہ آئے تو اسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا ہے کہ اگر تم ربو لینے سے باز آ جاؤ اور توبہ کرو تو تم اپنا اصل زر دہاں لے لو۔ اس کے بعد ہے

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تَظْلَمُوْنَ ۝ (۲۴)

اس سے نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ

(۱) اگر صرف اصل زر دہاں لیا جائے تو اس سے مقرر صں پر ظلم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے تو یہ مقرر صں پر ظلم ہوگا۔

اسی کا نام ربو ہے۔ یعنی زر اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا۔ کہئے کہ اس میں کوئی الحجاؤ۔ کسی قسم کا التباں کوئی شک و شبہ کوئی دشواری یا مشکل ہے؟

۲۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ سود در سود و سود مرکب، تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو نتیجہ یوٹو

غلط ہے۔ یہ نتیجہ حسب ذیل آیت سے نکالا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ (۲۵)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

اے ایمان والو! یہ دو چاند سے چاند ہونے والا ربو کھانا پھوڑ دو۔

امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضَاعَفَةٌ دو اصل ضَعْفٌ سے ہے جس کے معنی کم کرنے کے ہیں۔ ضَعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربو جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ در حقیقت (ضَعْفٌ) کم کرنا ہے۔ ربو سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قوی معیشت بہت گھٹ جاتی ہے۔ بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل اور شہاد

کی ضرورت نہیں۔ ربو سے افراد کے کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور قومی دولت میں کمی آ جاتی ہے۔



قرآن کی رو سے ربو کے معنی ہیں، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظام معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ محنت (LABOUR)

کلبے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ **معاوضہ کس چیز کا جائز ہے** اَلَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (۲۳)۔ انسان صرف اپنی محنت

کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہذا لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ وہ ربو ہے۔ قرآن کریم کی رو سے حرام ہے، اور خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کے مراد۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشتکار آپ سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ ایک قطعہ اراضی خرید کر اس میں کاشت

کرے۔ اور اس کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے اور آہستہ آہستہ آپ کا **ربو کی مختلف شکلیں** قرضہ بھی ادا کر دے۔ آپ اسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے۔ لیکن

اسی روپیہ سے وہ قطعہ اراضی خرید کر اسے بٹائی یا پنہ پر دیدیتے ہیں۔ وہ اس میں سال بھر محنت کر کے فصل بوتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ کا قرض بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربو نہیں؟

یا ایک دوکاندار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے آپ اسے روپیہ دیدیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاد سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کو منافع کا حصہ دیتے چلا جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربو نہیں؟

یا آپ اس کاروباری آدمی کو براہ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بینک میں جمع کر دیتے ہیں اور بینک والے اس روپیے کو بطور قرض، اس کاروباری آدمی کو دیدیتے ہیں۔ وہ اس قرض پر جو سود

ادا کرتا ہے اس میں سے ایک متعین حصہ آپ کو ملتا رہتا ہے۔ اور آپ کا اصل زر بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ ربا نہیں؟ یہ سب ربا ہے اور قرآن کی رو سے ناجائز۔ خواہ اسے سود مفرد کے حساب سے شمار کیا جائے۔ یا سود مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں آپ غور کیجئے تو بادی تین یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفہ دیتا ہے۔ لہذا اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی صورت اس "صدقہ" کی ہے جسے کسی ضرورتمند کے لئے حبثہ بنہ دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے وہ ضرورتمند اس امداد کو معاشرہ کے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) اجرت۔ یہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔ اس ربا۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دینے والا محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کر لیتا ہے۔

(۳) منافع تجارت میں، اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اور محنت بھی کی جاتی ہے۔ (۴) قمار۔ رجا، اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

(۵) ربح اول کو چھوڑ کر، آپ باقی شکلوں کو دیکھئے۔ جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے مستران جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربا

معاوضہ محنت کا ہے میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے اسے دس روپے اصل زر سے زائد وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپے قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے؟ ذلک بآئسھر قالوا لئنا البیع مثل الربو (۱)۔ وہ بیع اور ربا کو ایک جیسا سمجھتے تھے لیکن مستران کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں بشرطیکہ

بیع اور ربو میں فرق | بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے۔ اور دوکان دار کو اس کی محنت کا معاوضہ۔ سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ لیکن ربو میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے جو حرام ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ہے کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو ربو ہے۔ کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا۔ محنت کا نہیں۔ اس بات کا تعین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع و تجارت میں انسان (RISK) لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربو میں (RISK) نہیں ہوتا۔ لیکن حلت اور حرمت کے لئے یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK) ہو تو جو اصین حلال ہونا چاہیے کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربو میں فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیع میں (راس المال) محنت کا معاوضہ، واپس ملتا ہے اور ربو میں (راس المال) راس المال کا معاوضہ، ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ راس المال کا معاوضہ حرام۔

دشوا ریاں کیونچ پیش آتی ہیں؟ | آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رو سے ربو کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشوا ریاں آجکل پیش آرہی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ربو کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن (بدقسمتی سے) ہماری فوجہ شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ (مثلاً زمین کی بٹائی (مزارعت) یا مضاربیت۔ یعنی کاروبار میں ایسی شرکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔ یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جاسکے وغیرہ) ہمارے ارباب شریعت اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں۔ اس لئے وہ ربو کی تعریف ایسی کریں گے جس کی رو سے یہ شکلیں ربو کی شق میں نہ آسکیں۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ، بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خواہش رکھتا ہے کہ محنت کے تصور سے انہیں پسینہ آ جاتا ہے۔ اس لئے وہ روپے کے فستردار کی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر فستردار ہے۔ بجائے اس کے

کہ ہم اس نظام کو فستردار کی شکل میں بدل دیں، چاہتے ہیں کہ

پیوند سازی سے کام نہیں چلے گا اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ فستردار ہو گیا ہے۔ لیکن وہ پیوند اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ ترمیم کر کے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ فستردار کی نظام ایک غیر منقسم و ہمت ہے۔ اس میں غیر فستردار پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے۔

(۱) زمین ذریعہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا۔ پانی۔ روشنی کی طرح) نوع انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ امت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے۔ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے لئے خام مال سب آ جاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی۔ اس لئے افراد کے لئے جائیدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کر کے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افراد ملکیت کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی کا دست نہ لگنا پڑتا۔ لہذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حتیٰ کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دوکاندار اشیا کے ضروریات تقسیم کرنے کی کھینچی ہوگا۔ اسے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی طرف سے ملے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں رہو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دو متضاد نظام یہ ہے کہ روپے سود کا نام نہیں۔ یہ تر جان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی

نظام کی یکسر ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے۔ غیر قرآنی نظام میں ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ قرآن نے اس نظام کو ”خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ“ قرار دیا ہے۔ یہ نظام فی الواقع قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ یہ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے رہنے کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کر لیں۔ اس قسم کی کوشش ہم نے اس سے پہلے اپنے جاگیر داری اور زمین داری دور (عبد عباسیہ) میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی۔ مضاربیت تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ جو کوشش اب ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بینکوں کے سود یا صنعتی اداروں کے حصوں پر منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب در فریب میں مبتلا کر لیں گے۔ بینکوں کے سود وغیرہ کے سلسلے میں سود کی مخالفت میں اس وقت جو مخالفت قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات اسے اسلامی نظام معیشت کے خلاف پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کا مسئلہ اس وقت موجود نہیں تھا۔ جب ہماری فقہ مرتب ہوئی ہے۔ اسے اب ”جائزگی فہرست میں داخل کرنا ان کے نزدیک ”بدعت“ ہے۔ اگر یہ شکل اس وقت موجود ہوتی تو جس طرح زمین کی بٹائی اور مضاربیت وغیرہ جائز قرار دی گئی تھیں، لیکن ہے یہ بھی اسی فہرست میں شامل ہو جاتا۔ بینک کا سود تو بٹائی وغیرہ کے مقابلہ میں استحصال (EXPLOITATION) کی بہت نرم شکل ہے۔



لیکن اس سلسلے میں سب سے جبری دشواری ایک اور ہے اور وہ یہ کہ ہمارے اشتراکیت کی آرٹ (زمنہ میں اشتراکیت (کمیونزم) نے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملنے جلتے ہونا) فطری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفہ زندگی اسلامی فلسفہ حیات کی ضد ہے۔ اس چیز کو ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ ایک مؤثر حربے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ۔

(۱) مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کا گھٹتوڑ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت بجائے خویش۔ نظام سرمایہ داری ہی کی ایک شاخ ہے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل دنیاویہ ہے کہ محنت کے بغیر سود حاصل ہو جائے۔ محنت نہ مذہبی پیشوا کرتے ہیں نہ سرمایہ دار، سرمایہ دار تو پھر بھی روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ مذہبی پیشوا غیر روپیہ لگائے دوسروں کی کمائی بٹور لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ لہذا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قرآنی نظام معاشی کی مخالفت قطعی امر ہے۔

(۲) لیکن ان میں اتنی جرات ہے نہیں کہ یہ کھلے بندوں قرآنی نظام کی مخالفت کریں۔ نہ ہی ان پاس ایسے دلائل ہیں جن کی رو سے یہ اس نظام کو خلاف اسلام قرار دے سکیں۔ لہذا یہ کہتے ہیں کہ

(۳) جوں ہی کسی نے قرآن کے معاشی نظام کا ذکر کیا انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے اور چونکہ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے (قرآنی نظام اور اشتراکی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے اس لئے عوام اور سطح میں پڑھے لکھے لوگ فوراً ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ اور ایسا کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس پراپیگنڈے کا اثر یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سینے میں درد مند دل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ملک میں بھوک اور افلاس کا علاج ہونا چاہیے کہ مبادا وہ کمیونسٹ نہ بھڑائیے جائیں۔ قرآنی نظام کی مخالفت کے لئے مذہبی پیشوائیت کا یہ حربہ بڑا کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ عوام کی نگاہیں ظاہری ہوتی ہیں۔ انہیں یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے۔ ان جزئیات کو پیش کرنے والا ضرور نہیں کہ اشتراکی ہو۔ وہ سچا مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی فرق اسلام کے فلسفہ زندگی اور اشتراکی فلسفہ حیات میں ہے۔ اشتراکی فلسفہ حیات کا ماننے والا بیشک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کے کسی جز کا باہم گر مائل ہونا، اسلامی نظام کے پیش کرنے والے کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے تو اس اعتبار سے ہمارے تمام علمائے کرام کمیونسٹ ہیں۔ اس لئے کہ کمیونسٹ میں بھی سود ناجائز ہے اور یہ حضرات بھی سود کونا جائز قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ حضرات تو کمیونسٹ قرار نہیں پاتے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو وہ ان حضرات کے نزدیک فوراً کمیونسٹ قرار پا جائے گا۔ اس لئے نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت کی نفی اسلام کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ حضرات اس پر ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتے ہیں۔

یہ ہے وہ سب سے بڑی دشواری جو اس وقت ان مسائل کے صحیح حل کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔

اسلام اور اشتراکیت اگر اسلام اور اشتراکیت کے نظریہ ملتے جلتے ہیں تو اشتراکیت کے فرق کو پیش نظر رکھ کر ان کے معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے علامہ اقبال

نے جب سرفرانس نیگہ بند لکھا تھا کہ

اشتراکیت کا معاشی نظام + خدا = اسلام

تو اس سے ان کی یہی مراد تھی اور جب انہوں نے قائد اعظم سے کہا تھا کہ اگر ہندو اشتراکیت کا اپنا نام ہے تو اسے ہندومت سے ہاتھ دھوئے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان اسے اپنا نام ہے تو اس کا یہ اقدام اس خالص اسلام کی طرف جانے کے مراد ہو گا جو چودہ سو سال پہلے ظہور میں آیا تھا تو اس سے بھی ان کا یہی مطلب تھا۔

معاشی نظام اور فلسفہ زندگی کے فرق کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ آج یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر ہم نے اشتراکیت کا معاشی نظام اختیار کیا تو اس کی پابندیاں اور اس کا جبر بھی مستبول کرنا ہو گا۔ جس کے لئے شاید ہم میں سے اکثر تیار نہ ہوں۔

یہ ”جبر“ اشتراکیت کی فلسفہ زندگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اس نظام کو اسلامی فلسفہ زندگی کے تابع اختیار کیا جائے تو اس میں جبر و استبداد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کی عمارت انسانی ذات اسے نشو و نما دینے والی مستقل اقتدار کا قانون مکافات عمل اور اخروی حیات پر ایمان کی بنیادوں پر کھٹی ہے اور ایمان میں جبر و اکراہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ اسی ایمان کے تصور کا فقدان

اسلام میں جبر نہیں ہے جس سے اشتراکیت اور جبر و تشدد لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ اشتراکیت + خدا کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشی نظام کو وحی خداوندی کی بنیادوں پر استوار اور ایمان کے ذریعہ قبول اور اختیار کیا جائے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے نزدیک ”ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریقہ نہیں

کہ کبھی ملکیت زمین کے سوال کو زیر بحث لے آئے اور کبھی بینک کاری پر گفتگو کرنے

کرنے کا کام لگ گئے۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے

یہ متعین کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا۔

یہ کام ہمارے قدامت پرست طبقہ کے بس کا نہیں۔ اس لئے کہ

(۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مرتب ہوا تھا عین اسلامی نظام ہے۔

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آرہی ہے اس پر نظر ثانی نہیں کی جاسکتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ

(۳) ان کے نزدیک قرآن کریم، دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآن کریم کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں اور عصر حاضر کے اقتصاد کا تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو۔

جب اس طرح پہلے یہ متعین ہو جائے کہ اسلام کا معاشی نظام کیسا ہے تو اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجودہ نظام سے، اسلامی نظام تک کس طرح تدریجاً پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک بتدریج پہنچنے کے طرق و وسائل پر غور کر کے، چلنا شروع کر دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اسلامی نظام، اس کی حکمت، بالغہ، اس کی افرادیت اور اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کے دعوے کی صداقت کو تعلیم کے ذریعہ آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں اس طرح جاگزیں کیا جائے کہ اس کا مطالبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس طرح مضطرب و بیتاب ہوں جس طرح پھلی پانی میں جلنے کے لئے بے قرار ہوتی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہم ان مسائل کو فرداً فرداً لے کر انہیں اسی طرح بحث و نظر کا موضوع بناتے رہیں جس طرح اب تک بناتے چلے آ رہے ہیں۔ تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم اپنے وقت اور توانائیوں کو ضائع کرتے رہیں، ان لوگوں کی طرح جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ خَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا يَقْضُوا لَهُمْ

يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزَنَاهُمْ... وَهُمْ يَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صَدَقَاتٍ (۱۰۴-۱۰۵) اور اصل

مسئلہ جوں کا توں ہے۔ بینک کے سود کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ اگر آپ اس سود کو جائز قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ "بے محنت کی کمائی" کی اس فہرست میں ایک اور شق کا اضافہ کر دیتے ہیں جو قرآنی اصول معیشت کے علی الرغم ہمارے ہاں پہلے سے رائج چلی آرہی ہے۔ مثلاً زمین کی پیداوار کی بٹائی، مضاربت وغیرہ۔ اور اگر آپ بٹائی، مضاربت وغیرہ کو جائز رکھ کر بینک کے سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو آپ کا بینکنگ سسٹم

ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ اپنا روپیہ بینک کے کاروبار میں لگائے گا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ وتر آج کا معاشی نظام اختیار کر لیتے ہیں تو اس میں اس قسم کی کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئے گی۔ اس وقت افراد کے پاس فالتو دولت (SURPLUS MONEY) رہے گی ہی نہیں جو اس پر نفع کمانے کا سوال پیدا ہو۔ دولت کی تحویل میں رہے گی اور وہیں سے تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ ان ضرورت مندوں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی باقی نہیں رہے گا۔

یہ ہے اس مسئلہ کا اصلی حل۔

(فروری۔ ۱۹۶۷ء)



خدا (۱) سرمایہ دار

شائع شدہ اکتوبر ۱۹۶۶ء

پیریز

”ہشیا را اپنی مند سے پہچانی جاتی ہیں۔۔۔ یہ ایک قدیم سلسلے اور حقائق نہیں کے لئے عمدہ اور موثر طریقے۔۔۔“
 قرآن کریم نے بھی بیض حقائق کو سمجھانے کے لئے اسی طریقے سے کام لیا ہے۔ یعنی وہ دو متضاد اشیاء کو آمنے سامنے رکھ کر حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ مَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمُ وَلَا النُّورُ وَلَا الْخُسُوفُ وَلَا الْغُرُوبُ ياد رکھو! اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے، تاریکی اور روشنی ایک جیسے نہیں ہو سکتے، سایہ اور صوب یکساں نہیں ہو سکتے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ * (۲۱-۳۵)۔ اور مردہ اور زندہ بھی کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے، یعنی اگر آپ نے یہ سمجھا ہو کہ زندہ کے کہتے ہیں تو ایک مردہ پر غور کرو۔ جو جو بات مردہ میں نہیں ہوگی، جس میں وہ باتیں ہوں گی وہ زندہ ہوگا۔ یہی طریقہ اس نے دین کی حقیقت و ماہیت سمجھانے کے لئے اختیار کیا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ اگر تم یہ دیکھنا چاہو کہ دین کا پیغام اور اس کا نظام زندگی کیا ہے، تو اس پر غور کرو کہ دین کی مخالفت کس کس طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی ہو۔ جس طبقہ کی طرف سے دین کی مخالفت کی گئی تھی، دین اس نظام کی ضد تھا جس کا علمبردار وہ طبقہ تھا۔ اس اہم مطالعہ کے لئے اس نے ہمیں انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ کا محتاج نہیں رہنے دیا۔ قرآن کریم نے دین کی تاریخ

خود ہی محفوظ کر کے ہم تک پہنچا دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ خدا کے رسول ان لوگوں تک دین پہنچاتے رہے۔ اس سلسلہ کا آغاز اس نے حضرت نوح سے کیا ہے اور خاتمہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر۔ وہ بتاتا ہے کہ دین اپنی اصل دنیا کے اعتبار سے شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔ دین کے معنی ہیں ان لوگوں کے لئے نظام زندگی۔ اور اس کی مخالفت بھی شروع سے آخر تک ایک ہی قسم کے طبقات کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ یعنی ارباب حکومت، جو اپنی مرضی دوسروں پر چلاتا چلبتے تھے۔ سرمایہ دار جو دوسروں کی کمائی پر تن آسانی اور تعیش کی زندگی بسر کرتے تھے اور مذہبی پیشوا بیت جو خدا کے نام سے بن کر اڈل الذکر و ذول ذکر وہوں کے مفاد کی حفاظت کرتے تھے۔ جب بھی خدا کا کوئی رسول آیا تو ان تینوں گروہوں نے اس کے پیش کردہ دین کی مخالفت کی۔ لہذا اگر آج بھی یہ دیکھنا ہو کہ خدا کا تجویز کردہ نظام حیات (دین) کیا ہے تو تعارف بالمقدّم کے اصول کے مطابق، اس کا معیار یہ ہے کہ جس نظریہ کی مخالفت ان گروہوں کی طرف سے ہو، سمجھ لیجئے کہ وہ دین کے مطابق ہے۔ اور جس کی تائید ان کی طرف سے ہو وہ دین کے خلاف۔

یہ نہایت واضح روشن اور تین اصول ہے۔ اور نہایت آسان اور سادہ طریق کا جس کی تائید خود قرآن کریم کرتا ہے۔ آئندہ اوراق میں یہ بتایا جائے گا کہ سرمایہ داروں کے گروہ نے کس طرح ہر رسول کی مخالفت کی، اور ہر ممکن کوشش کی کہ وہ نظام متشکل نہ ہونے پائے جس کے داعی انبیائے کرام تھے۔

”سرمایہ داروں کے لئے قرآن کریم میں دو اصطلاحات عام طور پر آئی ہیں۔

(۱) الْمَلَائِكَةُ، الْمَلَائِكَةُ، الْمَلَائِكَةُ، ملائکہ کے بنیادی معنی ہیں، کسی چیز کو بھر دینا۔ اس اعتبار سے الْمَلَائِكَةُ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے گھر ضروریات زندگی کی اشیاء سے بھرے ہوئے ہوں۔ جنہیں سامان زیست بڑی فراوانی سے حاصل ہو۔ چونکہ غیر خداوندی نظام میں عزت اور ریاست کا سبب دولت ہوتی ہے اس لئے یہی لوگ قبیلہ یا قوم کے سردار بھی ہوتے تھے۔ اس لئے تبعاً یہ لفظ الْمَلَائِكَةُ سرداران قوم کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بنیادی طور پر مراد سرمایہ دار طبقہ ہی تھا۔

(۲) مُتَرَفِّعِينَ — وہ لوگ جو عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہوں۔ ایسے خوشحال لوگ جن کے پاس کثرت سے دولت ہو، اور اس بنا پر وہ بڑے خود سر ہو جائیں۔ قرآن کریم نے مُتَرَفِّعِينَ کی وضاحت خود ہی کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں قَالُوا هُنَّ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَكْثَرُ

وَ مَا خُنُّ بِمُعَادٍ بَيْنَ - (۳۴) جو کہتے ہیں کہ ہمارے اس بڑی کثرت سے دولت ہے اور ہمارا قبیلہ اور جتنا بھی بہت بڑا ہے۔ ہم جو جی میں آئے کریں میں کون سا لگا سکتا ہے؟

حضرت نوح

قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ دین خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ آسمانی دعوت انقلاب کے داعی اول حضرت نوح کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں کہتا ہے۔

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پیغام بربا کر بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم تو این خداوندی کی حکو اختیار کرو۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی توت نہیں جس کی حکوی اختیار کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے تو مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔ (۴۹)

آپ نے پیغام دیکھ لیا۔ یہ پیغام ساری قوم کے لئے تھا۔ لیکن قوم میں سے بھڑک کر کون سا طبقہ اٹھا؟

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرُكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ - (۵۰)

اس قوم کے دو ائمہ سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو۔ (ہمیں اس روش پر چلنے سے اس قدر مال و دولت حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اسی سے ہم پر تباہی آجائے گی۔)

سورہ ہود میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے جہاں کہا ہے کہ

اس پر قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ تاہم ہم کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو) باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ ہم میں سے نچلے رُج کے لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و منکر کی رو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہوئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں، ہمارے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل ہو۔ لہذا ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوئے میں جھوٹے ہو۔ (۱۱)

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا اور دولتمند اور طاقتور طبقہ نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس دولتمند طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ تم ان غریب اور نادار لوگوں کو دھتکار کر نکال دو تو پھر ہم تمہاری بات سننے کے لئے آمادہ ہو سکیں گے۔ اس پر حضرت نوح نے کہا کہ

تم اس پر غور کرو کہ میں تو کچھ تمہاری بھلائی کے لئے کرنا چاہتا ہوں، اس کے معاوضہ میں تم سے کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لائے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کروں کہ وہ غریب و نادار ہیں اور اس لئے تم انہیں ذلیل سمجھتے ہو۔ میں اگر تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار دوں تو اس سے تم تو بے شک خوش ہو جاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ تانوں خداوندی کی رو سے اس جرم کی جو سزا مجھ پر وارد ہو جائے گی اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور حقیر خیال کرتے ہو، خدا کی نظر میں بھی ذلیل اور حقیر ہیں، اور انہیں اس کے باوجود کوئی خوشگوار سزا مل سکتا ہے غلط ہے قانون خداوندی کی رو سے معیار عزت و تکریم اور استحقاق خیر و برکت انسان کے جوہر ذاتی ہیں، اس کی نگاہ کسی کے مال و دولت پر نہیں، بلکہ انسان کے دل پر ہوتی ہے۔ اگر میں

تمہاری بات مان لوں، تو میں بھی تمہارے ہی جیسا ظالم ہو جاؤں۔ (۱۳۱-۱۳۴)۔
آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا؟ وہی جو ہر ایسا شخص جو دولت و قوت کے نشہ میں بہست ہو، دیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا

اے نوح! ہم نے تم سے یونہی ذرا سی بات کی تھی اور تم ہو کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ تم جس تباہی کی دھمکی دے رہے ہو، اسے لے آؤ۔ ہم دیکھیں کہ وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہے۔ (۱۳۳)۔

سورۃ الشعراء میں ہے کہ ان امرائے قوم نے کہا کہ
اے نوح! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا بیدار تسلیم کر لیں اور اس طرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہو جائیں جس میں سوسائٹی کے وہ لوگ شامل ہیں جو بنائیت پست اور ذلیل ہیں اور ادنیٰ درجے کے کام کاج کرتے ہیں۔ وہ مزدور اور محنت کش ہیں۔ کیا ہم اس جماعت میں شامل

ہو کر ان لوگوں کو اپنا ہمسر بنالیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ (۲۳۱)۔

اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں معلوم کروں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ صداقت کو کس قدر تسلیم کرتے ہیں اور اس نظام کے قیام کے لئے کیا کرتے ہیں، جسے میں پیش کرتا ہوں۔ یہی ہمارے ہاں قدر و قیمت کے پیمانے ہیں۔ میرے نزدیک یہ غریب و نادار لوگ جو اس نظام کے قیام کے لئے میرے رفیق کار بنے ہیں، ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ (۲۳۲)۔

سورۃ المؤمنین میں ہے کہ ان رؤسائے قوم نے، اپنے طبقہ کے دیگر افراد سے کہا کہ یاد رکھو! اس شخص سے بڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہم پر بلا لادستی (SUPERIORITY) حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنا نظام مسلط کر دے۔ اس کا (معاذ اللہ) دماغ چل گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے جو کہتا ہے کہ امیر و غریب سب ایک جیسے ہیں۔ تم چند دنوں تک انتظار کرو۔ اس کی یہ تحریک خود بخود ناکام ہو جائے گی۔ (۲۳۳)۔

لیکن آخر الامر ہوا یہ کہ انہی ناداروں اور غریبوں کی جماعت محفوظ رہی اور وہ جو سامانِ زیست کی فراوانیوں سے اس قدر بدست ہو رہے تھے خرق ہو گئے۔

حق و باطل کی کشمکش کی اس پہلی کڑی کو بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ:-
اس سرگذشت میں تمہارے لئے، ہمارے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری کی نشانیاں ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم غلط نظام کو کس طرح الٹا کر رکھ دیا کرتے ہیں۔ (۲۳۴)۔

حضرت ہودؑ

قوم نوحؑ کے بعد ہمارے سامنے قوم عاد کا تذکرہ آتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی قوم کے سامنے اسی انقلابِ آفرین نظامِ زندگی (دین) کو پیش کیا جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَأُوا الذِّنْبَانَ كَهَؤُلَاءِ مِنْ قَوْمِهِ..... اس قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی، اور جو اس دعوت کی مخالفت کے لئے

اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہا کہ

ہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو۔ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں بتا رہی

کی طرف سے جارہی ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ (۲۶/۲۳ نیز ۲۳/۲۶)۔

اس قوم کو رزق کی کس قدر فراوانیاں حاصل تھیں اور اس کے بل بوتے پر انہوں نے خلق خدا پر کس طرح گویا عافیت تنگ کر رکھا تھا۔ اس کے ضمن میں قرآن کریم میں ہے کہ

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ تمہیں اس وقت سامانِ زینت کس قدر فراوان حاصل

ہے۔ ملل مویشی کی کثرت، افراد قبیلہ کی بہتات، لہلہاتے باغ، اُن کی سیرابی کے لئے رواں

دواں چشمے۔ یہ سب خدا کے عطا کردہ ذرائعِ رزق ہیں جسے اس نے تمام انسانوں کی پرورش

کے لئے پیدا کیا تھا، لیکن تم اسے کمزوروں اور ناداروں پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہو

تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اونچی اونچی پہاڑیوں پر اس قسم کے

میسوریل بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں۔ ان سے بھلا نوعِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا

ہے؟ اور تم بڑے بڑے ساز و سامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو۔ اس لئے نہیں کہ اس سے

ظلم کی روک تھام کرو۔ بلکہ اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے

پائے اور تمہارا غلبہ و تسلط ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ تم اس روش کو چھوڑ دو اور

قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ (۲۳/۲۳-۲۳/۲۶)

اس طبقہ کی طرف سے اس کا ردِ عمل کیا تھا؟ قرآن بتاتا ہے کہ

(انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور نہایت طنز اور تمہارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ!

ہمیں اس کی ضرورت نہیں) ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا، نہ کرنا، یکساں ہے (خدا ادا

اس کا تو فائدہ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب، جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ سبب)

لگے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ ہم پر کوئی تباہی نہیں آ سکتی۔ (۲۳/۲۶-۲۳/۲۷)

وہ کوئی جاہل اور گنوار قوم نہیں تھی۔ ان کے پاس

سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں، اور سمجھنے سوچنے کے لئے دل و دماغ تھے۔

لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کی تو ان کی سماعت و

بصارت و قلب ان کے کسی کام نہ آیا۔ ان کا علم و عقل انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (پہلے)۔

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا تھا کہ ”اگر تم نے اس غلط روش کو نہ چھوڑا، تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آجائے گی جن کا نظام، تمہارے نظام کی ضد ہوگا“ (چھٹے)۔ یہ ہے خدا کے قانون مکافات کی رو سے قوموں کے استبدال و استخلاف (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کا اصول جس کی رو سے وہ قوم جو غلط نظام حیات کی حامل ہو، تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو صحیح نظام کی حامل ہو۔

حضرت صالحؑ

قوم عاد کے بعد ہمارے سامنے قوم ثمود آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ، دعوت انقلاب لے کر آئے تھے۔ وہ زبانہ گلہ بانی کا تھا۔ معیشت کا مدار مویشیوں پر تھا۔ اور ان مویشیوں کی زندگی کا مدار چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر تھا۔ اس قوم کے بالادست طبقہ نے ان ذرائع پرورش کو اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے جانوروں کو ان میں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی پانی کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ عائدانی اعتبار سے حضرت صالحؑ کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی اس باطل روش کے خلاف اعلان انقلاب کیا تو انہوں نے کہا کہ:-

يٰصَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا (پہلے)

اے صالح! ہماری تو تمہارے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ تم تو ہماری امیدوں

کے مرکز تھے۔ تم یہ کیا کرنے لگ گئے؟

یہ کہنے والے کون تھے؟ وہی اَہْلَکُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ۔ (پہلے) اس کی قوم کا وہ دو تہہ طبقہ جس نے دھاندلی بجا رکھی تھی۔

اور حضرت ہودؑ نے ان سے کیا کہا تھا جس پر یہ ان کی طرف سے اس قدر بایوس ہو کر بھڑکیے تھے؟۔ انہوں نے کہا تھا کہ

دیکھو! خدا نے تمہیں اس ملک میں کس قدر ملن عطا کیا ہے۔ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو۔ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں کو اپنے پیش نظر رکھو اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ (۱۲۶)۔

پھر انہوں نے کہا کہ

فرما سوچو کہ اگر تم نے اپنا معاشی نظام اسی قسم کا رکھا جس سے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا ہو جائیں، تو کیا یہ آسائشیں اور فارغ البالیاں اسی طرح رہنے دی جائیں گی۔ کیا تم — ان ہلکے باغات اور چشموں میں، ان زرخیز زمینوں میں، ان نخلستانوں میں جہاں درختوں پر پھلوں کے نرم اور خوشگوار خوشے تہ بہ تہ لٹک رہے ہیں۔ اور ان تلخ نامحلوں میں جنہیں تم پہاڑوں کو تراش کر بڑی صنعت کاری سے بناتے ہو اور پھر اترتے ہو کہ یہاں تہاں کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح رہو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس غلط معاشی نظام کے باوجود یہ تمام خوشحالیاں علیٰ حالت قائم رہیں گی؟ (۱۲۶ — ۱۲۷)

اس پر انہوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو ایلمیسی سیاست کے علمبردار اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے حضرت ہود سے تو کچھ نہ کہا۔ کیونکہ ان کا خاندان بڑا تھا۔ لیکن ان کے تقسیمین کو جو غریبوں اور کمزوروں پر مشتمل تھے، دھچکنا شروع کر دیا۔

اس پر اس توہم کے سرکش اکابرین نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدست کر رکھا تھا، جماعت مومنین سے کہا۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین ان کے افلاس کی وجہ سے بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے۔ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالح خدا کا رسول ہے؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو متنبہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اسے اب تسلیم نہیں کرتے۔ (اس لئے تم خود سمجھ لو کہ جس روش کو ہم صحیح نہیں سمجھتے اس پر چلنے سے تمہارا کیا حشر ہوگا) (۱۲۷ — ۱۲۸)

جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو انہوں نے حضرت صالحؑ سے مصالحت کی کوشش کی۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کے سوا اور کیا چاہتا ہوں کہ خدا نے جو رزق تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے، اسے تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھا جائے۔ ہر ایک کے مویشی چراگا ہوں میں چریں اور اپنی اپنی باری چشموں سے پانی پیئیں۔ اس پر وہ راہنی ہو گئے تو حضرت صالحؑ نے کہا کہ مجھے ہر

عملی ثبوت ملنا چاہیے کہ تم اس معاہدہ پر کاربند رہتے ہو۔ اس وقت تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے خدا کی زمین پر لکیریں کھینچ کر — یہ میری اور یہ تیری — کی تفریق پیدا کر رکھی ہے۔ اور پھر ”میری زمین میں میرے موشی چر سکتے ہیں اور تیری زمین میں تیرے“ حالانکہ زمین میری اور تیری ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لئے میرے اور تیرے موشیوں کی تفریق — یہ ایک اذیتنی ہے جسے یوں سمجھو کہ یہ نہ میری ہے نہ تیری

هَذَا نَاقَةُ اللَّهِ — تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ (۱۳)

یہ خدا کی اذیتنی ہے — جو خدا کی زمین میں چرے گی۔
اگر تم نے اسے اس طرح چرنے دیا، تو سمجھ دیا جائے گا کہ تم میرے تجویز کردہ معاشی نظام پر کاربند نہ رہے۔
لیکن اگر تم نے اسے اس سے روکا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم اس تبدیلی کو توارا نہیں کر سکتے اور اپنی رو پر قائم رہنا چاہتے ہو۔

سترآنی نظام کی اساس

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ سترآن کریم نے اپنے معاشی نظام کو کس طرح چار فطلوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے — هَذَا نَاقَةُ اللَّهِ — تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ — خدا کی زمین مخلوق خدا کی پرورش کے لئے — قرآن کریم میں جس چیز کی نسبت خدا کی طرف کی گئی ہے یعنی یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی ہے، اس سے مراد یہی ہے کہ وہ عام انسانیت کے لئے کھلی ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ مثلاً اس نے کعبہ کو بَنِيَّتُ اللَّهِ (یا بَنِيَّتِي) — میرا گھر کہا کر پکارا ہے تو اس کی تشریح خود ہی یہ کہہ کر کر دی ہے کہ — بَنِيَّتٌ وَغَيْرُهَا لِلنَّاسِ — (۱۴) وہ گھر جسے تمام نوع انسان کے لئے بنایا گیا ہے — مَثَابَةُ النَّاسِ — (۱۵) عالمگیر انسانیت کا اجتماعی مرکز — بَنِيَّامَا لِلنَّاسِ — (۱۶) تمام نوع انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ — جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً ۖ وَالْعَالِيَتِ وَ الْبَادِ (۱۷) جس کے دروازے تمام انسانوں کے لئے — خواہ وہ دہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے ہوں — یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ اسی طرح جب اس نے ارض اللہ کہا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام نوع انسان (بلکہ ساری مخلوق کے لئے) ذریعہ پرورش ہے۔ معاشرہ کو

ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ خدا کے رزق سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ "خدا کی مخلوق اور خدا کی زمین"۔ یہ ہے دین کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد جس کا اعلان حضرت صالحؑ نے کیا۔

تو م کے سرمایہ داروں نے ملنے کو تو اسے مان لیا لیکن جب دیکھا کہ غریبوں کے مویشی اور ان کے جانور سب ایک جیسے بنا دیئے گئے تو ان کے سینوں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔

فَعَصَوْا وَكَانَ اٰیٰتُہُمْ اَنْہُمْ لَمْ یَمْلِكُوْا اَنْ یَّجْعَلُوْا لِحٰثَتِہُمْ اَوْ اَنْ یَّجْعَلُوْا لِحٰثَتِہُمْ اَوْ اَنْ یَّجْعَلُوْا لِحٰثَتِہُمْ (۲۶)۔ اور اپنے ہی سامان معاشی نظام کی طرف لوٹ گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اُنہوں نے کو مار ڈالا۔ (۲۷)۔ اور فَسَوَّھا۔ (۲۸) خدا کا قانون مکانات عمل ان پر روڈ رولر (ROAD ROLLER) کی طرح پھر گیا۔ اور انہیں زمین کی سطح کے ساتھ ہوا کر کے رکھ دیا۔

حذر لے چہرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

قوم مدین

اسی طرح قوم مدین کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ اس قوم کی معیشت گلہ بانی بھی تھی اور کاروباری بھی۔ ان کے زرعی نظام کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے لگائیے جو اس بستی سے باہر میاں پڑپیش آیا تھا۔

حضرت موسیٰؑ جب مصر سے بھاگ کر مدین کے قریب آئے تو وہ سستانے کے لئے ایک چشمے کے قریب درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چشمے پر مویشی غٹا غٹ پانی پی رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو پیادے سے دوڑ کھڑی ہیں۔ ان کے مویشی پیاس کے مارے قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں لیکن وہ انہیں چشمے کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ انہیں پانی کی نظر جانے سے روکتی کیوں ہیں؟ چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر لڑکیوں نے جواب دیا کہ

جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتے۔

اس لئے کہ یہ لوگ بڑے بڑے جتوں کے مالک اور صاحب قوت ہیں۔ اور ہمارے ہاں کوئی مرد نہیں۔ صرف ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے۔

(۲۹)۔

حضرت موسیٰ نے دل میں کہا کہ — بہرِ مینے کہ فرستیم آسمان پیدا ست — مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں فرعونوں کی بالادست قوم نے بنی اسرائیل پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں پہنچا تو معاملہ ہل سے بھی زیادہ الم انگیز نظر آیا۔ وہاں ایک قوم دوسری قوم کو تنگ کرتی تھی۔ یہاں ایک ہی قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو پانی کے چشمے کے قریب نہیں آنے دیتا۔ یہ جی میں کہا اور اٹھ کر ان غریب لڑکیوں کی کبریاں کو خود پانی پلا دیا۔ اور پھر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ (۲۴)۔ کہ

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

یہ تھی قوم مدین کی زرعی معیشت کی حالت۔ جہاں تک ان کی کاروباری زندگی کا تعلق ہے، ان کی کثیت وہی تھی جو ہر سرمایہ دار قوم کی ہوتی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ تمہیں چاہیے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ باپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے ہی بھلے کے لئے ہے، اگر تم یقین کر دو۔

دیکھو! ایسا نہ کرو کہ زندگی کے ہر راستے پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ جو لوگ صحیح نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اٹھیں، انہیں دھمکیاں دے دیکر اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپے رہو۔ (۵۵-۵۶) (۱۸-۱۹)

شروع شروع میں انہوں نے حضرت شعیبؑ کی اس دعوت کو (SERIOUSLY) نہ لیا۔ اور ان سے صرف اتنا کہا کہ — اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُنْصَحِرِیْنَ (۲۱) "ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے، جو اس فریب میں مبتلا ہو کر کہ خدا ان سے باتیں کرتا ہے، قوم کے مصلح بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا تھا کہ یہ ایک مذہبی ریفارمر ہے اس لئے اسے جس طرح یہ چاہتا ہے، اسی طریق پر صلواتی (پوجا پاٹ) ادا کرنے دو۔ اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہدیا کہ ہم تمہاری صلوات میں مزاحمت نہیں کریں گے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ شعیبؑ کے نزدیک صلوات سے مفہوم پرستش نہیں، کچھ اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ

يٰشُعَيْبُ اَصْلُوْكَ تَاْمُرُكَ اَنْ تَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْ اَمْوَالِنَا مَا نَشَآءُ (۲۲)

تم جو کچھ کہتے تھے، اس سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ لے کر آئے ہو اس لئے ہم نے تجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے طریق پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا نہیں تیری صلوٰۃ صرف پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں خلل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبود کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور نہ ہی ہم جس طرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں اور جس طرح ہمارا جی چاہے اسے خرچ کریں۔ ہماری معاشی زندگی تمہاری مرضی کے تابع چلے۔ یہ انوکھی صلوٰۃ ہے!

خدا آپ نے غور فرمایا کہ "مذہب" میں صلوٰۃ (نماز) کا کیا مفہوم ہوتا ہے اور "دین" میں صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ دین کی رو سے صلوٰۃ کا نظام، قوم کے معاشی نظام کو بھی اپنے دائرے کے اندر لئے ہوتا ہے۔ اسی نظام کے تمام کرنے کا حکم قرآن نے دیا تھا۔

بہر حال، جب قوم نے دیکھا کہ معاملہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ تحریک ہی کچھ اور ہے تو انہوں نے دھمکیاں دینی شروع کیں۔ قَالَ الْمَلَأُوا الذِّنْنَ

اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے، جو قوت کے نشہ میں بدمست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شیعیہ!

دونوں باتوں میں سے ایک ضرور ہوگی۔ یا تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی قدیم

مسک اختیار کرنا ہوگا جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہوئے ہیں، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے

ساتھیوں کو بستی سے نکال دیں گے۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ (۲۹)

قوم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا اور اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی۔ (۳۰)



صاحبِ ضربِ کلیم

اور داستانِ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ تو ہے ہی۔ ملکیت، مذہبی پیشوائیت، اور نظامِ سرمایہ داری، تینوں کے خلاف بیک وقت دعوتِ مبارزت۔ فرعون، ملکیت کے استبداد کا مجسمہ۔

ہامان، مذہبی پیشوائیت کی رو باہ بازیوں کا نمائندہ — اور تارون، نظام سرمایہ داری کی ہوس خون آشامی کا پیکر۔ لیکن جہاں تک فرعون کا تعلق ہے، اس نے بھی اپنی ملکیت کے استحکام کے لئے قوم کو معیشت کے نام پر ہی اپیل کیا تھا جب کہا تھا کہ

اے میری قوم کے لوگو! سوچو کہ کیا یہ نہیں جو میرے انتظام کے ماتحت جاری ہیں، اور جن پر تمہارا

معیشت کا دار و مدار ہے، میری نہیں؟ (۲۳)۔

یہ درحقیقت قوم کو بہت بڑی دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس داعی انقلاب کا ساتھ دیا

تو اس پر ہندوں کا پانی بند کر دیا جائے گا۔

فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰ کے تصادم کی داستان الگ ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ جہاں تک نظام سرمایہ داری کے خلاف کشمکش کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کے تذکرہ کی ابتدا ہی بڑے رمز آفریں انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ **إِنَّا قَارِؤُنَ کَانَ مِنْ قَوْمٍ مُّؤْمِنٍ** **فَبَنٰی عَلَیْہِمْ**۔۔۔۔۔ (۲۴) فرعون تو ایک دوسری قوم کا آدمی تھا جس نے بنی اسرائیل کو اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، لیکن تارون خود قوم موسیٰ کا فرد تھا۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی خون آشامی کی یہ حالت ہے کہ اس میں کوئی باہر سے آکر قوم کا خون نہیں چوستا۔ خود قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی غلامی کی لعنت ہر ایک محسوس کرتا ہے اور کسی بدترین غدار کے علاوہ کوئی ان کا مہنہ انہیں ہوتا۔ لیکن سرمایہ داروں کی عیش سامانیوں اور تر آسانیوں کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ان جیسا بن جانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ

ایک طرف وہ لوگ تھے جو تارون کو زندگی کی صحیح روش اختیار کرنے کی نصیحت کرتے تھے، اور دوسری طرف وہ تھے جن کے پیش نظر زندگی کی عمیش سامانیاں تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب تارون کو زور و ارشاد و شوکت سے باہر نکلتا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ اے کاش! جو کچھ تارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی مل جاتا۔ یہ بڑا ہی خوش نصیب ہے (۲۵) جب تارون سے کہا جاتا کہ تم جو دوسروں کی محنت کی کمائی کو اس طرح غصب کر کے اتنی دولت اکٹھی کر رہے ہو، تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تو معلوم ہے وہ اس کا کیا جواب دیتا؟ وہی جواب جو ہر دلو

اور ہر قوم کے سرمایہ پرست کی طرف سے ملتا ہے۔ وہ کہتا۔ اِنَّمَا اُوتِيتُهُ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِي۔ (۲۵) یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے حاصل کی ہے۔ اس لئے اس میں کسی دوسرے کا کیا حق ہے اور اس کی بابت مجھ سے کون باز پرس کر سکتا ہے؟

کیشکش جاری رہی۔ اس کے بعد۔

جب قارون کی بدکرداریوں کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا۔ تو ہم نے اسے، اور اس کے مال و متاع سے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا۔ اور اس وقت کوئی گروہ ایسا نہ نکلا جو قانون خداوند کے مقابلہ میں اس کی مدد کر سکتا، نہ ہی اس سے خود ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا (سرمایہ دار کی اقبال مندی کے زلمے میں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک لشکر ہے جو اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دے گا لیکن جب اس پر ادبار آتا ہے تو ایک شخص بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی اپنی ہنرمندی اسے اس تباہی سے بچا سکتی ہے۔) (۲۶)



عدل داوڑی

حضرت داؤدؑ کے زلمے میں عام معاشی نظام کس قسم کا تھا، اسے قرآن کریم نے ایک قصہ کی شکل میں بیان کیا ہے۔ نظام سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ بڑا سرمایہ چھوٹی پونجی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس طرح امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہونا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤدؑ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں۔

۱۔ مستغیث نے کہا کہ منقری ثانی میرا اپنا بھائی ہے۔ لیکن دیکھو یہ بھائی ہو کر میرے ساتھ کڑا کیا چاہتا ہے۔ اس کے پاس نہ نافر سے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بھلے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ امداد کرے مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دُنبی مجھے دید۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحب اثر بھی۔ اس نے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ یہ ہے

میرے اس بھائی کا میرے ساتھ برتاؤ۔ اب بتاؤ کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے؟ (۳۳)

یہ ننھا وہ غلط معاشی نظام جس کی اصلاح کے لئے حضرت داؤدؑ مامور ہوئے تھے۔ چنانچہ آپؑ

کہہ دیا گیا کہ

”تم بلا خوف و خطر اطمینان سے معاشرہ کی اصلاح کرو، ہم نے تمہیں حکومت عطا ہی اس لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کیا کرو۔ اور کسی کے خیالات اور جذبات کے پیچھے مت لگو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں راہِ راست سے بہکا دیں گے۔“ (۳۴)



حضرت عیسیٰؑ

”سچ انسانیت، حضرت عیسیٰؑ کی تو دعوت ہی ایک طرف ”سود خوار یہودیوں“ کے خلاف چلیج اور دوسری طرف رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ لیکن سود خوار یہودی خود سلسلے میں نہیں آتا تھا۔ جس طرح فرعون نے مذہبی پیشوائیت (ہامان) کو حضرت موسیٰؑ کے خلاف اٹھا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح سریسٹ پر یہودی ہیکل کے احبار اور ہامان (علما و مشائخ) آپ کے سلسلے آئے تھے۔ اس آسمانی دعوت کی زد خود ان مذہبی پیشواؤں پر کس طرح پڑتی تھی اس کے متعلق انجیل برنباس کا ایک اقتباس دیدینا کافی ہو گا۔ اس انجیل کی فصل ۱۲۲ میں ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے خلاف مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ ہم پر یہ بہت بڑی مصیبت ہو گی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنی چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت جہاں بھی ہو اس کا سلسلہ ہی نہیں ہوتا، معاشی ہوتا ہے۔ اور چونکہ دین خداوندی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو تعمیری کام کئے بغیر دوسروں کی کمائی پر

عیش اڑائے، اس لئے مذہبی پیشوائیت کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہ وجہ تھی کہ ہیکل کے احبار و سیکڑے حضرت عیسیٰ کی اس انقلاب آفرین دعوت کی اس شدت سے مخالفت کرتے تھے۔

آخری دور

جب حضور خاتم الانبیاءؐ کی وساطت سے دین اپنی آخری اور مکمل شکل میں نوع انسانی کو دیا گیا تو نظام سرمایہ داری کے حاملین کی طرف سے اس کی مخالفت بھی انتہائی شدت تک پہنچ گئی۔ ہمارے ہاں کے مروجہ اسلام کی رو سے، جو ہمارے دورِ ملوکیت اور جاگیر داری کا وضع کردہ اور مذہبی پیشوائیت کے سہارے قائم ہے، نبی اکرمؐ کی بعثت مقدسہ کا مقصد صرف اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ عہد جاہلیت میں عربوں میں شراب خوری، بوائے بازی، باہمی جنگ و جدال، توہمانہ رسومات عام تھیں۔ حضور ان نبیؐ کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ لوگ بُت پرست تھے اور آپؐ سے شرک قرار دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قریش مکہ اور ان کے ساتھ جملہ قبائلِ عرب نے جو اس دعوت کی مخالفت میں جانوں کی بازی لگا دی تھی تو کیا اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہ ان عادات و رسومات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جو عام اخلاقی اصولوں کی رو سے بھی قابلِ مذمت اور درخورِ نفرت تھیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بت پرستی کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ ان کے معبودوں کو گالی مت دیں۔ لہذا ان کے اذکارِ تبلیغ میں استعمال انگیزی کا عنصر موجود ہی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کو ان کے مذہب سے (خواہ وہ بُت پرست ہی کیوں نہ ہو) زبردستی روک نہیں سکتے تھے۔ تو پھر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے یہ سارا ملک اس دعوت کے خلاف میدان کا زار میں اتر آیا تھا۔ بالخصوص جب یہ جماعتِ مومنین مکہ چھوڑ کر مدینہ چلی آئی تھی تو پھر قریش کو کس بات کا خطرہ تھا جو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور چھ سات سال تک مسلسل معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اس سوال کا جواب، ہمارا مذہبی طبقہ دے نہیں سکتا۔ اس کا جواب، البتہ، ایک غیر مسلم نے دیا ہے جس نے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا تھا۔

بات یوں ہوئی کہ جب چین میں امریکہ کے پٹھو، چیانگ کانگ کانگ، کوکینوٹوں کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی تو اس سے امریکہ کو جس قدر غصہ اٹھانی پڑی وہ ظاہر ہے۔ اہل امریکہ حیران اور متعجب تھے کہ ان کی اس قدر امداد کے باوجود چیانگ کانگ اس طرح خاسر و نامراد کیوں رہ گیا۔ اس کی ریا خود اپنی سیاست کی، اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اکثر امریکی دیدہ و در چین پہنچے۔ ان میں ایک نامور جرنلسٹ (JACK BELDEN) بھی تھا۔ اس نے وہاں کی سیاحت کے بعد ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (CHINA SHAKES THE WORLD) وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ

تاریخ کے اس تحیر انگیز واقعہ (یعنی انقلاب چین) کے سبب و علل دریافت کرنے کے لئے نہ تو حکومت امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمائندے جو مشرق بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی ادارے اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جاتے ہیں تاکہ وہ اہل چین کے بردا گئیں اور جذبات سے لبریز قلوب تک پہنچ سکیں۔

اس کے بعد، بیلڈن اس انقلابِ عظیم کی حقیقی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔
ان تمام لوگوں کو جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں، محمد کے ان الفاظ کی یاد دلادینا چاہیے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ

كَلَّا بَلْ لَّا تَشْكُرُونَ الْيَتِيمَ ۚ وَ لَا تَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۚ

نہیں! تمہاری تباہی کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم اس شخص کو واجب التکریم نہیں سمجھتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے اور ایک دوسرے کو اس امر کی تکفین نہیں کرتے تھے کہ جس کی چلتی گاڑی ٹرک جائے اس کی ردی کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔

یہ تھا آپ کا وہ انقلاب آفرین پیغام جس کی وہ لوگ مخالفت کرتے تھے۔ آپ ان کے پورے کے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ قریش بہت بڑے تاجر تھے۔ اتنے بڑے کہ (قرآن کے الفاظ میں)۔

رَحْلَةُ الشَّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۳)

ان کے کاروان تجارت سردی، گرمی، سارا سال۔ رواں دواں رہتے تھے۔

ایک طرف تجارت، اور دوسری طرف کعبہ کی تولیت۔ اس سے ان کا پورا معاشی نظام سرمایہ داری پر متفرع تھا۔ اور اس داعی انقلاب کا پیغام، اس نظام کو ختم کرنے کا مدعی تھا۔ وہ اس کی بس طرح مخالفت نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ ان سرمایہ داروں کے سب سے بڑے نمائندہ، ابو جہل نے، جب خلافت کعبہ کو تھا کر اس تحریک جدید کے خلاف اپنے معبودوں سے فریاد کی ہے تو اس میں اس نے کہا یہ تھا کہ یہ پیغام وہی ہے جو فارس میں ابھی ابھی مزدک لایا تھا۔ محمد کو یہ سبق (معاذ اللہ) سلمان پارسی نے پڑھ لیا ہے۔

ایں مسادات، ایں مواخات عجیبی است

خوب می دامنم کہ سلمان مزدکی است

انہوں نے حضور کے ساتھ مفاہمت کی صورت پیدا کرنے کے لئے اپنا جو نمائندہ بھیجا تھا اسکی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وَ جَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا (۱۴) اسے بڑی فراوان دولت حاصل تھی۔ ان مخالفین سے جب کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم نے اپنی روش نہ چھوڑی تو تمہارا حشر کبھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے تمہاری جیسی قوموں کا ہوا تھا۔ وہ تم سے بھی زیادہ مال و دولت اور قوت و حشمت کی مالک تھیں ان کی بڑی بڑی بستیائیں تھیں (۱۵) جن کے اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ (۱۶) اس لئے تم جو اپنے مال و دولت پر اتراتے ہو، تو تمہارا انجام بھی انہی جیسا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے کہ

جو شخص مال اور دولت جمع کرتا ہے اور پھر ننانویں کے پھیر میں پھنس جاتا ہے تو اس کا انجام

تباہی ہوتا ہے۔ (۱۷)

تم رتبہ کعبہ کی طرف نسبت رکھنے سے اس قدر مفاد حاصل کرتے ہو کہ نہ نہیں بھوک کا ڈر سنا تا ہے، نہ کسی قسم کا خوف و خطر لاحق ہے۔ تو بہتیں چاہیئے کہ حکومت بھی اسی رتبہ کی اختیار کر دو (۱۸) لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی مخالفت میں تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جب ان کی بلاکت پر ان کے انجام کی ہر تصدیق ثابت ہو گئی تو قرآن کریم نے ان کے نمائندہ (ابولہب) کا نام لے کر ان کی تباہی

سلسلہ میں کہا کہ مَا آغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ ۚ وَمَا كَسَبَ (۱۱۱) اس کا اس قدر مال و دولت جو اس نے حاصل کر رکھا تھا، اس کے کسی کام نہ آیا۔

”قرآن کا معاشی نظام“ سر دست میرا موضوع نہیں۔ میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ (نظامِ ربوبیت، اس موضوع پر میری مستقل تصنیف ہے)۔ قرآن کریم کا مطالعہ اس نگاہ سے کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔ اور جو دین (نظامِ زندگی) و پیش کرتا ہے، اس کی مخالفت کے اقنوم ثلاثہ (ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری) ہیں سرمایہ داری کو برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے دغخ الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ

اس باب میں ایک اصولی حقیقت کو ہمیشہ سلسلے رکھو۔ اور وہ یہ کہ کوئی قوم اور سبقتی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہو جو انہیں ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔ اور وہاں کے آسودہ حال دولت مند سرمایہ دار طبقہ (مترفین) نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

وہ کہتے یہ تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے اور ہمارا جتنے بھی بہت بڑا ہے۔ اس لئے کس کی مجال ہے جو ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔ (۱۱۲)۔

یعنی اس وقت تک جو بات جزو جزو بیان ہو رہی تھی، قرآن کریم نے اسے ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کر کے، دین اور نظامِ سرمایہ داری کے باہم متضاد اور نقیض ہونے کی حتمی شہادت ہم پہنچا دی۔ یعنی خدا کی طرف سے جہاں اور جب بھی دین آیا، مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی استثنا نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی ہوا۔ ان کے پاس ان کی اس مخالفت کی دلیل فقط یہ ہوتی تھی کہ نظامِ سرمایہ داری ہمارے آباد و اجداد سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ ہم اس سے ہٹنا نہیں سکتے۔

اور ہی طرح ہم نے کسی سبقتی میں اپنا رسول نہیں بھیجا کہ وہاں کے دولت مند طبقہ (مترفین) نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے سلاطین کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے، ہم اس راستے سے ایک قدم بھی ادھر ادھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ (۱۱۳)۔

سورۃ انبیاء میں ان لوگوں کے انجام کو بڑے ڈرامائی انداز میں سامنے لایا گیا ہے، جہاں قرآن کی مخاطب قوم سے کہا گیا ہے کہ

اگر تم اپنی زندگی کا نقشہ قرآن کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں عظمت اور بلندی حاصل ہو جائیگی۔ اگر اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ ہو جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے کتنی ایسی قومیں تباہ ہو گئیں جنہوں نے ظلم اور نا انصافی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اس روش سے باز آجائیں۔ لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ اس تباہی سے بچنے کے لئے لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کون سا موقع تھا۔ چنانچہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو۔ اب لئے پاؤں اپنی اپنی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَا أَشْرَفُ تَحَرُّ فِیْهِ) جن کی سرشاریاں ہمیں اس قدر مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ اور اپنے ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔ ؟ (۱۱۱-۱۱۲)

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جب کسی قوم کی بربادی کے دن قریب آجائے ہیں۔ تو

اس کا سرمایہ پرست طبقہ ہوس زراں دوزی میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت اس قوم پر بری طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ صحیح روش زندگی کو بھوٹ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے۔ تو پھر وہ اس طرح ہلاک ہو جاتی ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ (۱۱۶) سورہ ہود میں ہے کہ تم اقوام گذشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس سے تم کس نتیجہ پر پہنچتے ہو۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے ان میں سے بعد میں مدد دے چن لیا رہ جاتے جو اپنے مفاد کو تو انہیں خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور لوگوں کو نا ہمواریاں پیدا کرتے

روکتے۔ ورنہ باقیوں کا تو یہ مال ہو جاتا کہ وہ اپنی تن آسانی اور مفاد پرستی کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لیجاتے، تاکہ ان کی عیش سامانیوں میں فرق نہ آنے پائے۔ (خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے) یہ کہتے ان کے وہ جرائم جن کی بنا پر ان کی بربادی ہوتی۔ (۱۱۶)۔

قوموں کی تباہی کے وقت سب سے زیادہ عذاب اسی سرمایہ دار طبقہ پر وارد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے عیش کے لئے کا انہیں ڈر ہو۔

حَتَّىٰ إِذَا أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِمْ بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجُؤُونَ ۝ (۲۳)
تاکہ اس قوم کا مرفہ الحال سرمایہ دار طبقہ عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور وہ کس
بری طرح سے جینچتا چلاتا ہے

— عیسیٰ —

قول فیصل

قرآن کریم کی تصریحات آپ کے سامنے آچکیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دین خداوندی کی رو سے سرمایہ پرستی کی پوزیشن کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اب بھی کسی قول فیصل کا انتظار ہے تو اسے بھی سن لیجئے جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے لوگ چیخ چلا رہے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے کیا جرم کیا تھا جو یہ اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ کہا کہ

إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ۔ (۲۵)

یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

— عیسیٰ —

ہم نے دیکھ لیا کہ جو دین (نظام زندگی) خدا کی طرف سے آتا تھا۔ ہر دور اور ہر قوم میں سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی تھی۔ اس آئیہ جلیلہ کو ایک بار پھر سامنے لائیے جسے قرآن کریم نے

بطور کلی بیان کیا ہے کہ

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ (۲۴)

کوئی بستی بھی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنا رسول بھیجا ہو اور اس کے سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

مذہب اور سرمایہ داری

جب تک وہ دین اپنی شکل میں باقی رہتا، نظام سرمایہ داری کے حاملین کی پیش نہ چلتی۔ لیکن اس کے بعد وہ دوسرا حربہ اختیار کرتے۔ وہ اسی دین کے نام لپواؤں میں سے مفاد پرست گردہ کو اپنے ساتھ ملا لیتے۔ وہ اس دین کو مسخ کر کے اسے مذہب کی سطح پر لے آتے اور یہ مذہب، نظام سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی بن جاتا۔ یوں سادہ لوح انسان (عوام) خدا کے نام پر اس مذہب میں آجاتے جس طرح نظام سرمایہ داری دین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا، اسی طرح نظام سرمایہ داری، مذہب کی حمایت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، محنت کش طبقہ کو معاشی طور پر کتنا ہی مجبور و معذور کیوں نہ کر دیا جائے وہ ”بطیب خاطر“ کبھی بھی اس پر رضامند نہیں ہو سکتا کہ اس کی محنت کی کمائی دوسرے لوٹ کر لے جائیں۔ یہ فرضیہ مذہب پرست طبقہ انجام دیتا ہے۔ وہ غریبوں کو یہ کہہ کر انہیں پلاتا رہتا ہے کہ یا درکھو! رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے جو جسے چاہے لاکھوں کرڑوں کو جسے چاہے فقیر بے نوا کر دے۔ امیر دل کی دولت پر حسد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم خدا کی تقسیم کے خلاف خنجر جھکاتے ہو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ انسان کو ہمیشہ راضی برضا رہنا چاہیے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہ مال و دولت یہ جائیدادیں اور محلات، سب آتی اور فنا فی ہیں، اصلی زندگی آخرت کی ہے، اور آخرت کی جنت غریبوں کے لئے ہے۔ خود حضور شہنشاہِ دو عالم نے اپنے لئے غریبی پسند کی تھی اور الفقر فخریٰ فرمایا تھا۔ یعنی یہ کہ غریبی میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ آپ خدا سے ہمیشہ دعا کرتے رہتے تھے کہ مجھے غریبوں میں رکھو اور غریبوں میں اٹھائیو! اسلام غریبوں میں پیدا ہوا اور غریبوں ہی میں باقی رہے گا۔ مذہب پرست طبقہ یہ اور

لہٰذا یہ طبقہ اس قسم کی روایات (بلکہ آیات) کو ان کے حقیقی مفہوم سے الگ کر کے اپنے مطلب کے مطابق پیش کرتا ہے۔

اس قسم کی اور مقدس باتیں دن رات غریبوں اور محنت کشوں کے کان میں ڈالتا رہتا، اور اس طرح انہیں ان کی حالت پر شاکر رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ یوں نظام سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ مذہب پرست طبقہ خود کو کوئی کمائی کرتا نہیں۔ ان کی اس "خدمتِ جلیلہ" کے معاوضہ میں، سرمایہ دار طبقہ ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔

اسلام کے ساتھ کیا ہوا؟

جو کچھ سابقہ انبیائے کرام کے لائے ہوئے دین کے ساتھ ہوا، وہی اسلام کے ساتھ ہوا۔ حضور نبی اکرم نے جس دین کو پیش کیا، سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ دین عملی شکل میں قائم ہو کر رہا۔ اور اس طرح ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کے ابلیس شکست کھا کر پہاڑوں کے غاروں میں جا چھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے وہاں سے پھر سر نکالا، اور اسی سازش کہن کے مطابق جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، مذہبی پیشوائیت نے اس دین کو خود ساختہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اب بادشاہوں کے لئے مساجد کے منبروں سے اُتار دیا کہ اللہ پناہ اور خلد اللہ مُلک کی دعائیں مانگی جانے لگیں اور سرمایہ داروں کو یہ کہہ کر بد لگام چھوڑ دیا گیا کہ اگر تم بادشاہ کو اس کا شکیں اور ہمیں ہمارا شکیں (زکوٰۃ) دیدیا کرو تو پھر ہمیں احکامات ہے کہ جس قدر جی چاہے دولت جمع کر لو اور جہنمی جی چاہے جائیدادیں کھڑی کر لو۔ اس مذہب کی تائید میں روایات وضع کی گئیں اور تاریخ کو مسخ کر کے اور تو اور خود صحابہ کبار کو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی شکل میں دکھا دیا گیا۔ یہی مذہب اس وقت تک ہمارے ہاں مردِ ج چلا آ رہا ہے جو دین کی ضد ہے۔ سرمایہ دار طبقہ نے ہمیشہ دین کی مخالفت کی تھی۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے مروجہ مذہب کا سب سے بڑا حامی یہی سرمایہ دار طبقہ ہے۔ کہیں عظیم الشان مسجدیں بنوا رہے ہیں۔ کہیں ان مساجد کی تزئین و آرائش پر ہزاروں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ ملک کے ہزاروں دارالعلوم اور مکتب انہی کے روپے سے چلتے ہیں اور ائمہ مساجد اور علمائے کلم کی روزی کے یہی کہیں ہیں۔ مذہب کے نام پر بڑی بڑی جائعین انہی کے بل بوتے پر بڑھتی اور کھلتی پھولتی چلی جاتی ہیں نقطہ یہ ایک بات کہ سرمایہ دار طبقہ ہمارے مروجہ اسلام کی حمایت کرتا ہے، اس حقیقت کے اثبات کے لئے دلیلِ محکم ہے کہ یہ اسلام بہر حال وہ دین نہیں، جو خدا کی طرف سے بوساطتِ محمد رسول اللہ

دنیا کو ملا تھا۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ یہ دہی دین ہے تو اس سے (معاذ اللہ) خدا کی یہ شہادت جھوٹی ثابت ہوتی ہے کہ

دین جہاں بھی ہوگا، سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا۔

سرمایہ دار طبقہ ہمارے مروجہ اسلام کی اس قدر حمایت کرتا ہے اور اس اسلام کے علمبردار اسے اس کی حق خدمت کے عوض جنت کے پروانے عطا کرتے رہتے ہیں۔ مروجہ اسلام کی دوسری جنت کس قسم کے کاموں کے عوض ملتی ہے؟ تعمیر و ترمیم مساجد، اشاعت دین کے لئے مالی امداد، صدقات و خیرات، زکوٰۃ، حج۔ بڑی بڑی رگاہوں کی تعمیر و آرائش۔ نذر نیاذ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ثواب کے یہ کام صرف دو لمحدہ طبقہ ہی سرانجام دے سکتے ہیں، غریبوں میں اتنی استطاعت ہی نہیں ہوتی اس لئے اس مذہب کی دوسری دنیا بھی سرمایہ داروں کے لئے ہوتی ہے اور آخرت بھی سرمایہ داروں کے لئے۔ یہی ہے وہ ذہنیت جسے نمایاں طور پر سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے سورہ کہف میں اپنے تمثیلی انداز میں، دو آدمیوں کا ایک فقہ بیان کیا ہے۔ اس میں سرمایہ دار کو اس کا دوست سمجھاتا ہے کہ تم ساز و سامان حیات کی اس فراوانی پر اتراؤ نہیں۔ اس وقت تو تم بے شک اپنے آپ کو محفوظ و مصنون سمجھتے ہو، لیکن قیامت میں تمہارا انجام کیا ہوگا۔ کبھی اسے بھی سوچا ہے؟ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ

میرے بھائی! تنہا یہ باتیں محض داہمہ ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کی گھڑی جس سے تو مجھے ڈرتا ہے، کبھی آئے گی۔ لیکن بفرض حال، اگر ایسا ہوا بھی اور مجھے خدا کے حضور جانا ہی پڑا تو مجھے وہاں بھی اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا۔ (۱۱)

”میں نے کئی مسجدیں تعمیر کرائی ہیں۔ ہر مسجد کے عوض مجھے جنت میں ایک مکان ملا۔ اور وہ بھی یاد ہے اور زمرہ کا۔ آلات ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ، صدقہ و خیرات کے اکثر کام کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کئی حج کئے ہیں۔ اور یہ تو تم جانتے ہو کہ حج کرنے سے انسان ایسے ہو جاتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ یعنی اس کے تمام سابقہ گناہ دھل جاتے ہیں۔ میں زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ اور زکوٰۃ سے باقی مال بالکل پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے قیامت میں نجات اور بخشش میرے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ جس کی قسمت میں خدا نے یہاں عیش لکھا ہے وہ وہاں بھی عیش ہی کرے گا۔“ یہ ہے جنت کی وہ ضمانت جو سرمایہ دار کو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ملتی رہتی ہے اور جس کے لئے انہوں نے وضعی روایات کا ایک انبار اپنے ہاں

محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔

لیکن **يَتَذَكَّرُ الْاِحْسَانُ** کہ خدا کی کتاب ہمارے پاس اپنی پہلی شکل میں محفوظ ہے۔ لہذا ان لوگوں کا فوجی مذہب اور اس کی تائید میں وضعی روایات و تفاسیر و تشران کی اس شہادت کو کہاں تک چھپا سکیں گی کہ سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے ہمیشہ دین کی مخالفت ہوگی۔

یعنی دین اور نظام سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ داروں کی اس جنت میں باریابی ہو سکے جو اتباع دین کا فطری نتیجہ ہے۔ "دینداری" کے وہ کام جن کے عوض، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داروں میں جنت کے پروانے تقسیم کرتی رہتی ہے، دین کی میزان میں ان کا وزن کیا ہوتا ہے؟ اسے بھی مسترآن کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کے "ثواب" کے کام — مثلاً حاجیوں کے لئے سبیلیں لگا دینا، یا خانہ کعبہ کی ترمیم و آرائش کا سامان مہیا کر دینا — اس شخص کے اعمالِ حیات کے برابر ہو جائیں گے جو نظامِ خداوندی کی بنیادی حقیقتوں (خدا اور آخرت) پر ایمان رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے (جسے سبیل اللہ کہا جاتا ہے) مسلسل جدوجہد کرتا ہے؟ اگر تم اپنے ذہن میں ایسا خیال کئے ہو، تو کہتے رہو۔ خدا کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے؟ (۹)

اس قسم کے عبادت گزاروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ان ریاکار نمازیوں کا انجنام تباہی ہے جو اس طرح کی پرستش سے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور دین کی عملی تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی وہ ایک طرف نمازیں پڑھ کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے دیندار ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کا عمل یہ ہے کہ وہ اس رزق پر جسے بیٹے پانی کی طرح ہر ایک ضرورت مند کے لئے کھلا رہنا چاہیئے تھا، بند لگا کر اسے اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ (۱۰)

ان کا انجنام کیا ہوگا؟ — اس کے متعلق واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

جو لوگ دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی عام منفعت (فی سبیل اللہ)

کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول! تو ان کے لئے ایک الم انگیز عذاب کا اعلان کر دے۔ جب وہ انقلاب آئے گا تو ان کی اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے انکی پشیمانی، ان کے پہلو، اور ان کی پشت کو داغاً جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم محض اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ اب اپنے سرمایہ کا مزہ چکھو!

(۹/۳۸)

(اکتوبر ۱۹۶۶ء)



زکوٰۃ

قرآن کریم کی روشنی میں

(شائع شدہ جولائی ۱۹۶۶ء)

۱۔ جبکہ پاکستان میں یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ زکوٰۃ کیا ہے۔ اس کا نصاب اور شرح کیا ہے۔ اور مصارف کیا۔ کیا ان میں تبدیلی کی جاسکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اس موضوع پر متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں، لیکن اس بحث کے چل نکلنے پر ہمارے پاس استفسارات آنے شروع ہو گئے ہیں اور تقاضا کیا جا رہا ہے کہ ہم بتائیں کہ مسترآن کریم کی رو سے اس کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے زکوٰۃ کے متعلق مروجہ مسلک کو سمجھ لیا جائے جسے ہمارا قدامت پرست طبقہ پیش کرتا ہے۔ ان کے مسلک کے مطابق، جب کسی شخص کے پاس ایک خاص مقدار کے مطابق مال جمع ہو۔ اور اس پر ایک سال گزر جائے۔ تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک خاص حصہ بطور خیرات دیدے۔ مال کی اس مقدار کو جس پر ان کے مسلک کے مطابق زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، نصاب کہتے ہیں اور جس نسبت سے اس میں سے زکوٰۃ نکالی جائے اسے شرح کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نصاب حسب ذیل بتایا جاتا ہے۔

(۱)	چاندی	$\frac{1}{50}$ تولہ
(۲)	سونہ	$\frac{1}{4}$ تولہ
(۳)	اونٹ	(۵) پانچ
(۴)	گائے	تیس

(۵) بکریاں چالیس۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہو تو اسے چاہیے کہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے۔ اگر ایسی حکومت نہ ہو، تو لوگ اپنے اپنے طور پر زکوٰۃ خرچ کر دیں۔ لیکن حکومت ہو یا افراد زکوٰۃ خرچ کی جائے گی انہی مصارف پر جن کا تعین کر دیا گیا ہے۔

(۶) قرآن کریم میں "زکوٰۃ" دینے کا حکم تو آیا ہے جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے، لیکن جن باتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں سے کوئی بات بھی قرآن مجید میں نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ (کم از کم) مصارف زکوٰۃ کی تصریح تو خود قرآن کریم نے کر دی ہے اور اس کے لئے قرآن کی آیت پیش کی جاتی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغُرَمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۴۰)

شاہ رفیع الدین اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

سوائے اس کے نہیں کہ خیرات واسطے فقیروں کے اور محتاجوں کے اور عمل کرنے والوں کے اور تحصیل اس کی کے۔ اور جن کو کہ الفت دلائے جاتے ہیں دل ان کے۔ اور بیچ آزاد کرنے گزروں کے۔ اور قرضداروں کو۔ اور بیچ راہ اللہ کے۔ اور مسافروں کو۔ فرض ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ مصارف صدقات کے بتائے ہیں جس کا ترجمہ شاہ صاحب "خیرات" کرتے ہیں۔ یہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں۔ قرآن کریم نے "زکوٰۃ" کے لئے زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے مصارف کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ لہذا ہم نے جو کہا تھا کہ زکوٰۃ کے متعلق ان امور کا جنہیں ہمارا تہ امت پرست طبقہ پیش کرتا ہے، قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں آیا، تو یہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔

۳۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ تمام تفصیل نبی اکرمؐ کی متین فرمودہ ہیں اس لئے یہ ہمارے غیر متبدل قوانین شریعت ہیں۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے) ہو سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے انہیں متعین فرمایا ہو۔ لیکن

بادنی تمتع یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اگر انہیں حضورؐ نے متعین فرمایا تھا تو آپؐ نے ایسا اپنے زمانے کے خصوصی حالات کے ماتحت کیا ہوگا۔ حضورؐ کا یہ منشاء نہیں ہو سکتا کہ یہ تفصیل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح رہیں۔ اس کی دلیل واضح ہے۔ مثلاً

۱، نصاب میں چاندی۔ سونے کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں نقدی، چاندی اور سونے ہی کی شکل میں ہوتی تھی۔ لیکن اب نقد مال چاندی سونے میں اول تو ہوتا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں سادرن کی شکل میں ہوتا بھی ہے تو شاذ۔ (روپیہ بھی خالص چاندی کا نہیں ہوتا)۔ اب نقد مال، نوٹوں کی شکل میں ہوتا ہے یا بینک کی ہنڈیوں وغیرہ کی شکل میں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس کچھ روپیہ نوٹوں کی شکل میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں۔ اور اگر ہوگی تو کس شرح سے؟ چاندی کی شرح سے یا سونے کی شرح سے۔ اور ایسا کرنے کے لئے کیا سند ہوگی؟

(۲) مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آجکل چاندی کا بھاؤ تین روپے فی تولہ ہے اور سونے کا نرخ ایک سو تیس روپے فی تولہ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مرد جب نصاب کے مطابق، جس شخص کے پاس قریب ڈیڑھ سو روپے کی مالیت کے چاندی کے زیورات ہوں گے اس پر تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ لیکن جس کے پاس آٹھ سو روپے تک کی مالیت کے سونے کے زیورات ہوں گے وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگا؛ یعنی ڈیڑھ سو روپے رکھنے والے پر تو زکوٰۃ پڑ جائے گی لیکن آٹھ سو روپے رکھنے والے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یہ تو پھر بھی کم فرق ہے۔ اس نصاب کی رو سے جس شخص کے پاس ڈیڑھ سو روپے کی مالیت کا چاندی کا زیور ہوگا اسے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی لیکن اگر اس کے پاس اسی قیمت کا سونے کا زیور ہوگا اسے تو زکوٰۃ دینی نہیں ہو سکتی۔ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یعنی غریب پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اس سے نسبتاً امیر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

آپؐ نے غور فرمایا کہ خود یہ نصاب بتا رہا ہے کہ اگر اسے نبی اکرمؐ نے مقرر فرمایا تھا تو یہ حضورؐ کے اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ہو گا جب چاندی سونے۔ ادنیٰ۔ گلے کی قیمتوں کا تناسب ایسا ہوگا جس کی رو سے سب کے لئے نصاب یکساں ہو جائے۔ آج یہ صورت باقی نہیں رہی۔ آج اگر کسی کے پاس آٹھ سو روپے کے چاندی کے زیورات ہوں اور وہ سال ختم ہونے سے پہلے ان کی جگہ سونے کا زیور بولے۔ یا

چار گائے ذبیحے، تو شریعت کی رو سے وہ زکوٰۃ دینے سے بچ جائے گا۔ شریعت کے غیر متبدل (ابدی) قوانین ایسے نہیں ہوا کرتے۔ اس لئے یہ نصاب یا شرح حضور کی طرف سے ابدی طور پر متعین فرمودہ نہیں ہو سکتی تاریخ اس پر کبھی شاہد ہے کہ بعض چیزیں جن پر رسول اللہ کے زمانے میں زکوٰۃ نہیں پڑتی تھی، خلافت راشدہ کے زمانے میں انہیں زکوٰۃ کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ مثلاً تجارتی گھوڑوں اور سمندر سے برآمد شدہ چیزوں کو مد زکوٰۃ میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں شامل کیا گیا۔

لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ زکوٰۃ کی شرح بھی مستقل طور پر خدا اور رسول کی مقرر کردہ ہے اور اس کے مصارف بھی اپنی کے متعین فرمودہ۔ ظاہر ہے کہ اس مقرر شدہ شرح سے آمدنی بھی مقررہ حد تک ہو سکے گی۔ اب اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ وہ ضروریات جنہیں مد زکوٰۃ سے پورا کیا جانا مطلوب ہے، زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہوں تو اس وقت کیا کیا جائے گا؟ اس صورت میں یا تو آپ کو بعض ضروریات کو دیکھ کر دیکھا دینا پڑے گا۔ اور یا آمدنی زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور مد سے حاصل کرنی پڑے گی۔ غور کیجئے کہ ان دونوں صورتوں میں نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہی ناکہ خدائے اور اس کے رسول نے ایک نکل دینا ہے۔ اور اس دین کی کیفیت یہ ہے کہ جو آمدنی اس میں تجویز کی گئی ہے وہ ان ضروریات کو پورا نہیں کرتی۔ جنہیں پورا کرنے کے لئے وہ آمدنی تجویز کی گئی تھی۔ تو سوچئے کہ غیر مسلم اس دین کے متعلق کیا اندازہ کریں گے جس کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا آخری کلمہ۔ اور غیر متبدل دین ہے!

(۴) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ہمارے قدامت پرست طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں زکوٰۃ کی تکفیل اور اس کا صرف کرنا حکومت کے فرائض میں ہوتا ہے۔ لیکن جب ایسی حکومت نہ ہو تو پھر زکوٰۃ انفرادی طور پر دی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادی زکوٰۃ، ایک خاص شرح کے مطابق خیراً ہی ہوگی (جیسا کہ یہ اب ہے)۔ لیکن پاکستان میں کیفیت عجیب ہے۔ زکوٰۃ ابھی تک انفرادی طور پر دی جاتی ہے۔ اور خود حکومت بھی یہ طے نہیں کر پائی کہ زکوٰۃ کا وصول کرنا اور صرف کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے یا نہیں۔ وہ اس مقصد کے لئے کبھی کوئی زکوٰۃ کمیٹی مقرر کر دیتی ہے کبھی اس کی وصولی کی کوئی اور صورت تجویز کر دیتی ہے لیکن وہ بھی اس انداز سے کہ جس کا جی چاہے اسے (گدا گروں کی خیرات کی طرح) حکومت کی جھولی میں ڈال دے اور جس کا جی چاہے اسے خود خرچ کر دے۔ اس میں سے جس قدر روپیہ حکومت کی تحویل میں آ جاتا ہے (ہمیں معلوم نہیں کہ اب کچھ آتا بھی ہے یا نہیں) اس کے متعلق یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ

اسے، حکومت کی باقی آمدنی سے بالکل الگ رکھ کر صرف انہی عداوت پر صرف کیا جائے گا جنہیں مصارف زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

زکوٰۃ — قرآن کریم کی روشنی میں

آئیے اب ہم دیکھیں کہ قرآن کریم کی رُو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے۔ الزکوٰۃ کے بنیادی معنی ہیں نشوونما، بڑھنا، پھولنا، پھلنا۔ یعنی (GROWTH) اور (DEVELOPMENT)

قرآن کریم میں "اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ" کا حکم متعدد بار آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہ دو ستون ہیں۔ "اقامتِ صلوٰۃ" سے کیا مفہوم ہے اس کے متعلق ہم اس وقت گفتگو نہیں کرتے۔ آیتائے زکوٰۃ کے معنی ہوئے نشوونما دینا۔ کسی کے بڑھنے، پھولنے، پھلنے کا انتظام کرنا۔ اس کی (DEVELOPMENT) کا سامان ہیا کرنا۔

اب آگے بڑھتے۔ اسلامی نظامِ مملکت (جسے حکومت خداوندی کہا جاتا ہے) کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے جنہیں انسانوں کے متعلق خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ وہ حکومت جب خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے تو اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ان واجبات کو پورا کرے جن کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے۔

خدا نے قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت میں اپنے آپ کو رَبُّ الْعَالَمِينَ کہا ہے۔ یعنی وہ ربوبیت عالمینی کا ذمہ دار ہے۔ ربوبیت کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کو اس کے نقطہ آغاز سے نشوونما دیتے ہوئے اس کی تکمیل تک پہنچا دینا۔ اس سے واضح ہے کہ دیگر اشیائے کائنات کے علاوہ، نوع انسان کی مالک نشوونما کا ذمہ بھی خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ اس ذمہ داری کے سلسلے میں اس کا ارشاد ہے کہ
وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۶)
زمین میں کوئی حیوان ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔
اور خود انسانوں کے سلسلے میں فرمایا۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاَهُمْ (۱۷)

ہم ان کے اور ان کی اولاد کے رزق رسالین زیت کے ذمہ دار ہیں۔

خدا کی یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے جماعتِ مومنین (اسلامی نظام) کو متشکل کیا گیا تھا۔ یعنی انکی ذمہ داری تھی کہ وہ ایسا نظام قائم کریں جس سے تمام افرادِ انسانیہ کو ان کی نشوونما کا سامان ملتا رہے۔ اسے اس نے "ایتائے زکوٰۃ"۔ سامانِ نشوونما دینے کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھتے اس حقیقت کو قرآن کریم کس قدر وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ سورہ الحج میں ہے۔

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَكَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (۲۲)

یہ مومنین، وہ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں حکومت مل گئی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی حکومت کا فرضیہ "ایتائے زکوٰۃ"۔ زکوٰۃ دینا — ہے۔ یعنی نوعِ انسان (یا افرادِ معاشرہ) کو سامانِ نشوونما عطا کرنا۔ اس اعتبار سے حکومت کی ساری آمدنی (REVENUE) کو "زکوٰۃ" (یعنی سامانِ نشوونما) کہا جائے گا، جسے وہ افرادِ معاشرہ اور اس کے بعد عالمگیر انسانیت کو دینے کے لئے حاصل کرے گی۔ اس کے لئے وہ کیا انتظام کرے گی۔ لوگوں کی کمائی میں سے کس قدر لے گی۔ اس کا تعین ضروریات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ زکوٰۃ کسی خاص ٹیکس کا نام نہیں۔ اسلامی حکومت کی پوری کی پوری آمدنی زکوٰۃ کہلا سکتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ان لفظی پیچیدگیوں میں الجھنے کے بجائے ہمیں قرآن کے مفہوم کے مطابق یوں کہنا چاہیئے کہ

اسلامی ملک کا ایک بنیادی فرضیہ "ایتائے زکوٰۃ" ہے۔ یعنی تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما ہم پہنچانا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس کی تمام آمدنی زکوٰۃ۔ یعنی ذریعہ نشوونما کہلا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سال میں بعض ہنگامی حالات ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لئے بجٹ میں گنجائش (PROVISION) نہیں ہوتی۔ مثلاً۔ سیلاب۔ زلزلہ۔ وبا۔ جنگ وغیرہ۔ ان کے لئے ملک سے خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے۔ انہیں قرآن کریم نے "صدقات" سے تعبیر کیا ہے۔ سورہ توبہ کی آیت ۹۰ میں جو پہلے درج کی گئی ہے، جن "مصارف" کا ذکر ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں۔ زکوٰۃ کے نہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(۱) جو کچھ آجکل زکوٰۃ کے نام سے دیا جاتا ہے، اسے زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے آپ خیرات کہہ سکتے ہیں۔

(۲) زکوٰۃ کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسلامی حکومت "زکوٰۃ" دیتی ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے سامان نشوونما ہم پہنچاتی ہے۔

(۴) اس فریضہ کی ادائیگی کے پیش نظر اسلامی مملکت کی ساری آمدنی زکوٰۃ (یعنی ذرائع نشوونما) کہلا سکتی ہے۔ اس آمدنی کی نہ کوئی غیر متبادل شرح ہے نہ خاص نصاب۔ حکومت اسے ضروریات کے مطابق خود متعین کرتی ہے۔ (نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ نے اسے اپنی ضروریات کے مطابق مقرر کیا ہوگا)۔

(۵) جنگی حالات کے عطیات کو صدقات کہا جاتا ہے۔

اصطلاحی طور پر بھی دیکھا جائے تو قرن اول میں حکومت کی آمدنی کی تین ملات سامنے آتی ہیں: غیر مسلموں سے جزیہ، زمین کا لگان (خراج)۔ اور باقی تمام آمدنی کو زکوٰۃ کہا جاتا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ لگان کے لئے اصطلاح انتظامی سہولت کے لئے رکھی گئی ہوگی۔

سزاؤں

(۶) ہم نے اس گفتگو کو زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے۔ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور مملکت اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے افراد سے کس حد تک لے سکتی ہے۔ ان نکات کا تعلق معاشی نظام سے ہے جسے ہم شرح و بسط سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور کردی جائے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی رو سے، حکومت اور امت دو الگ الگ ادارے نہیں ہوتے۔ ساری کی ساری امت، حکومت میں شریک ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ امت اپنے اجتماعی نظم و ضبط کے لئے جو مشینری وضع کرتی ہے اسے حکومت کہتے ہیں۔ اس لئے جب یہ کہا جائے گا کہ اسلامی حکومت زکوٰۃ دیتی ہے۔ تو اسے یوں بھی کہا جاسکے گا امت مسلمہ (جماعت المؤمنین) زکوٰۃ دیتی ہے۔ یعنی نوع انسان کی نشوونما کا سامان ہم پہنچاتی ہے۔

نہج

(۷) باقی رہا یہ کہ شریعت کے جو احکام، فقہا تو ایک طرف خود رسول اللہؐ کے مقرر کردہ ہیں حالات کی تبدیلی سے ان میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق مودودی صاحب تفہیمات (جلد دوم) کے

صفحہ ۳۲ پر رقمطراز ہیں :-

یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کچھ جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالت اور عہد صحابہ میں عرب اور دنیا سے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہ ہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کی ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روح اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔

وہ قرآن کریم نے زکوٰۃ کا اصول دیدیا ہے۔ اس اصول کی جزئیات اور طریق کار امت اپنے اپنے زمانے میں اپنے حالات کے مطابق خود طے کرے گی۔



کمیونزم اور اسلام

۸ دسمبر ۱۹۶۵ء کو پروفیسر صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پبلک ایڈمنسٹریشن کے رایم کے طلباء سے خطاب کیا۔ موضوع تھا۔ اسلام کا معاشی نظام۔ اس خطاب کو بعد میں ٹیپنگ کارڈز سے مرتب کر کے۔ طلوع اسلام میں شائع کیا گیا تھا۔

عزیزانِ من! آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ اسلام زندگی کا ایک کُلّی نظام پیش کرتا ہے۔ اور سیاسی، معاشرتی، معاشی، عمرانی نظام سب اس کُلّی نظام کے مختلف اجزاء ہیں۔ لیکن ان اجزاء اور ان کے کل میں باہمی تعلق۔ ابتدائی سائنس کی اصطلاح میں۔ مکسچر یا آمیزہ کا سا نہیں۔ کمپونڈ یا مرکب کا سا ہے۔ سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ مکسچر کے تمام اجزاء اپنی اپنی خصوصیات اسی طرح برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن مرکب میں ان کی کیفیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً پانی مرکب ہے ہائیڈروجن اور آکسیجن کا۔ ہائیڈروجن بڑی تیزی سے جلتی ہے اور آکسیجن ہر شے کے جبنے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن دونوں کے مرکب (پانی) کی خصوصیات ان سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ہائیڈروجن اور آکسیجن کی الگ الگ خصوصیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہے کہ اس نے پانی کی خصوصیات کو سمجھ لیا ہے۔ تو وہ ایک بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہوگا۔ اس سے آگے بڑھنے اور خود ان کو سمجھنے۔ اگر کوئی شخص علم تشریح الابدان (اناٹومی) کی رُو سے انسانی جسم کے مختلف اجزاء۔ دل، گردہ، پھیپھڑے، جگر، حتیٰ کہ دماغ تک کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ کہے کہ اس نے "انسان" (یا اُس فرد) کے متعلق سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ تو وہ کس قدر غلط فیصلے پر پہنچے گا! یہی کیفیت اسلام کے

منتخب کردہ نظام کلی کے ان اجزاء کی ہے۔ اگر ان اجزاء کا الگ الگ مطالعہ کرنے کے بعد، یہ تصور کر لیا جائے کہ ہم نے اسلام کے نظام کلی کو سمجھ لیا ہے تو ایسا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسلام کے نظام حیات کا صحیح تصور سامنے رکھا جائے۔ اور اس کے بعد دیکھا جائے۔ کہ اس کلی نظام میں یہ اجزاء کیا کام کرتے ہیں۔ اور اس نصب العین کے حصول میں کس طرح مدد و معاون ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ بالفاظ دیگر، یہ مختلف نظام، مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یہ مقصد کیا ہے اور مختلف نظام — یا کم از کم معاشی نظام — اس مقصد کے حصول میں کس طرح مدد و معاون ہوتے ہیں، یہ وہ سوال نہیں جن کا جواب ایک نشست میں دیا جاسکے۔ اسے تو ہماری درسگاہوں کا نصاب تعلیم ہونا چاہیے تھا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آسکتی تھی۔ کہ اسلام کیا ہے۔ اسلامی معاشرہ کسے کہتے ہیں۔ اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں۔ اور مقصود و مطلوب کیا — میں بہر حال کوشش کروں گا۔ کہ اس مختصر سے وقت میں اس امر کی وضاحت کروں کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور اس کے پیش کردہ کلی نظام میں اس کا مقام کیا۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

معاشی نظام کی اہمیت

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی میں معاشیات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ سورۃ اہل کی ایک آیت سے لگائیے۔ جس میں اس نے ایک مثال سے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کریم کا یہ عالم انداز ہے۔ کہ وہ مجرد حقائق کو محسوس تمثیلات سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس آیت جلیلہ میں کہا گیا ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاتِيُهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔ ایک بستی تھی بڑی مطمئن اور خوشحال۔ چاروں طرف سے سامانِ زیت بڑی فراوانی سے اس کی طرف چلا آتا تھا فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ۔ لیکن اس کے باشندوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ جس مقصد کے لئے انہیں یہ سب کچھ

۱۴ اس خطاب میں بیشتر باتیں ایسی سلسلے آئیں گی جو معاشی نظام کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں۔

اس میں وہ امور زیادہ وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔

دیا گیا تھا۔ اُسے اس کے لئے استعمال نہ کیا۔ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا۔ اور رہی نہیں بلکہ خود اس قوم کی ہستی خطرے میں پڑ گئی۔

یہ کچھ کیوں ہوا۔ اس کا جواب قرآن کریم نے ایک لفظ میں دیدیا ہے۔ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۳۱)۔ کہا۔ کہ یہ کچھ یونہی نہیں ہو گیا۔ خدا کسی قوم کو یونہی بیٹھے بٹھائے مبتلائے عذاب نہیں کر دیتا۔ یہ اس لئے ہوا۔ کہ انہوں نے رزق کی تقسیم کے صحیح نظام خداوندی کو چھوڑ کر، ایک (غلط) نظام خود وضع کیا۔ رزق تو دی ہوتا ہے۔ اگر اس کی تقسیم خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق کی جائے تو اس کا نتیجہ ہر ایک کی خوش حالی ہوتا ہے۔ اگر اس کی جگہ انسانوں کا خود ساختہ نظام لے لے، تو اس کی تقسیم نامہوار ہو جاتی ہے اور نامہوار یوں کا نتیجہ غربت، افلاس اور برائی خطرات ہوتے ہیں۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی کہ اگر کسی قوم میں رزق کی قلت ہے۔ اور یہ قلت ہنگامی طور پر پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اس قوم کا ہیج زندگی ہی ایسا ہو چکا ہے۔ یا اس قوم کو ہر وقت اپنی جد آگاہی ہستی اور آزادی کے متعلق خطرہ لاحق رہتا ہے۔ تو اس قوم کو کسی خوش حالی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے۔ کہ وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہے۔

قانون خداوندی سے اعراض

اس حقیقت کو سورہ طہ کی ایک آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ جو قوم ہمارے قوانین سے اعراض برتی ہے۔ ان سے پہلو تہی کرتی ہے۔ گریز کی راہیں نکالتی ہے تو اس کی میشت تنگ ہو جاتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جو قوم غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہی ہو، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی تو انہیں خداوندی کے مطابق نہیں۔ وہ ان سے اعراض برت رہی ہے۔

ہمارے ہاں اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی اس دنیا کی زندگی ذلت اور پستی میں گذرتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی ہے۔ کامیابی اور کامرانی تو اس کی ہے جس کی آخرت سنور جائے۔ یہ دنیا مومنین کے لئے ہے ہی نہیں۔ ان کے لئے آخرت کی زندگی ہے۔

بلکہ خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں غربت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کھلنے کو روٹی، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان۔ یہ ہیں اللہ کے بندوں کی نشانیاں آخرت میں یہی لوگ جنت کی آسائشوں کے مالک ہوں گے۔ یہ ہمارے ہاں کا عام عقیدہ ہے اور اسے محراب و منبر سے ہمیشہ دہرایا جاتا ہے۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ سورہ طہ کی جو آیت ابھی ابھی میں نے پیش کی ہے وہ پوری آیت نہیں آدھی ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔

وَمَنْ أَغْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَخَشَرًا يَوْمَ
الْقِيَمَةِ اَعْمٰی ۝ (۲۱)

جو ہمارے قوانین سے اعراض برتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور اسے قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔

دوسری جگہ ہے

وَمَنْ كَانَ فِي حِزِّهِ اَعْمٰی فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاصْنُ لِنَفْسِكَ سَبِيلًا ۝ (۲۲)

جس میں دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی گزرا۔

آپ نے غور فرمایا عزیزان! کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے؟ یہ کہ

(۱) جو قوم قوانین خداوندی سے اعراض برتی ہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور

(۲) جس قوم کی روزی خداوندی میں دنیا میں تنگ ہو۔ سمجھ لو کہ اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی درخشاں و تابناک نہیں، آخر دی زندگی میں بھی اس کا کچھ حصہ نہیں۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں۔

جو آج جگر سوز و خود امروزی نہیں ہے!

جس قوم کی تقدیر میں امروزی نہیں ہے!

وہ کل کے غم و غیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا

وہ قوم نہیں لائق ہنس گامہ فردا!

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آگے بڑھیے۔

رزق کا معاملہ

یہ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تمدنی زندگی میں جس میں انسان کو مل جل کر رہنا ہوتا ہے، رزق

کا معاملہ کسی ایک فرد کا ذاتی معاملہ نہیں رہتا۔ یہ مسئلہ معاشرتی اور اجتماعی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے موجودہ معاشرہ میں ایک مزدور دن بھر مزدوری کی تلاش میں مارا مارا پھرے اور کہیں کام نہ مل سکے، تو وہ اور اس کے بچے رات کو بھوکے سوئیں گے۔ یا اگر اسے مزدوری ملی ہے۔ لیکن اس کی اجرت اتنی نہیں جس میں اس کا، اور اس کے بال بچوں کا گزارا ہو سکے۔ تو انہیں اسی طرح دن کاٹنے ہوں گے۔ اس مزدور نے اپنی طرف سے حصولِ رزق کی پوری پوری کوشش کی لیکن اس کے باوجود اس کی بھوک کا علاج نہ ہو سکا۔ یہ اس لئے کہ رزق کا معاملہ پورے معاشرہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ کسی فرد کا الگ معاملہ نہیں۔ کسی جنگل یا صحرا میں ایک فرد تنہا نہ امیر ہو سکتا ہے نہ غریب، اس کی یہ پذیرش معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم، افراد کے رزق کے لئے معاشرہ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ یعنی اسے انفرادی مسئلہ کے بجائے معاشرتی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسی کو نظام کہتے ہیں۔ غلط نظام میں رزق کی تقسیم ناہموار ہوتی ہے۔ ایک کے کتوں کو دودھ اور گوشت ملتا ہے اور دوسرے کے بچے بھوکے سوتے ہیں۔ صحیح نظام میں ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری نظام معاشرہ پر ہوتی ہے جسے عصر حاضر کی اصطلاح میں ملکیت (سٹیٹ) کہا جاتا ہے۔ جو ملکیت تو ان خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے اسے حکیمتِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ یہ ملکیت لوگوں سے خدا کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے، اس لئے یہ ان تمام ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتی ہے جنہیں ان قانون کے سلسلے میں، خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ رزق کے متعلق خدا کی ذمہ داری ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (۱۴)

روئے زمین پر کوئی مستفصل ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ یہ ذمہ داری اسلامی ملکیت اپنے سر پر لیتی ہے۔ اور افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی

ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّا هُمْ (۱۵)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ان راویانہی جیسی دیگر آیات سے عام طور پر یہ عقیدہ پیدا کیا جاتا ہے کہ جب رزق کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے سر لے رکھی ہے تو اس کے لئے پریشان

ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ جس انسان کو پیدا کرتا ہے اس کے لئے رزق بھی ساتھ ہی بتیا کر دیتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ رزق کی پیدائش اور تقسیم کے لئے خاص نظام کی ضرورت ہے۔ مشیتِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔

یہ عقیدہ غلط ہے اور اس کا ازالہ خود قرآن کریم نے کر دیا ہے۔ سورہ یٰسین میں ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا اللَّهَ مَا رَزَقَكُمْ اللَّهُ - جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق خدا نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی دو۔ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ أَنْطَعِمُ مَنْ كُيْ يَشَاءُ اللَّهُ اَطْعَمَهُ قَطْعًا کہ کیا ہم ان رعما جوں کی روٹی کا انتظام کریں۔ جنہیں اگر روٹی دینا مقصود ہوتا تو خدا خود روٹی دیتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۲۳)۔ ان سے کہو کہ تم کسی کھلی ہوئی گمراہی میں ہو جو یہ کہتے ہو کہ جنہیں رزق دیا جانا مقصود ہو، انہیں خدا خود براہِ راست رزق پہنچاتا ہے۔ اس نے صفحہ ارض پر رزق بکھیر دیا ہے۔ ہر ایک ضرورت مند تک پہنچاتا، انسانی معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ جو معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے وہ مشیتِ خداوندی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ لہذا قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ رزق کی بہم رسانی خدا کے ذمے ہے اس نظامِ مملکت کو اس کی ذمہ داری سے آگاہ کرتی ہیں جو خدا کے نام پر متشکل ہوتا ہے۔

معاشرہ، مملکت، نظام

میں نے یہاں معاشرہ، مملکت، نظام، افرادِ معاشرہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا قرآنی مفہوم بھی سمجھ لیا جائے۔ کہ جب تک ان کا صحیح تصور سامنے نہیں آئے گا۔ معاشی مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

اگر آج کوئی غیر مسلم مسلمان ہونا چاہے تو اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لے۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ (ہم پیدائشی مسلمانوں کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں)۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے مسلمان ہونے کے لئے کچھ اور ہی شرط ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جب آپ کسی انجن، کسی سوسائٹی، کسی کلب کا ممبر بننا چاہیں تو آپ کو اس کا فارم رکنیت پُر کرنا ہوتا ہے۔ فارم رکنیت

پُر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس انجن، اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط کی پابندی کا اقرار کرتے ہیں۔ اسلام بھی ایک برادری، ایک سوسائٹی متشکل کرتا ہے۔ اس سوسائٹی کی رکنیت کے لئے ایک معاہدہ ضروری ہے اس معاہدہ کی رو سے ایک اقرار اس نمبر کی طرف سے ہوتا ہے اور دوسرا اقرار اس سوسائٹی کی طرف سے۔ وہ معاہدہ یہ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآَنٍ لَهُمُ
الْجَنَّةُ ۖ (۹۱)

اس معاہدہ کی رو سے اس سوسائٹی کا ممبر اپنا جان اور مال، خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں، خدا اس کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ اُسے جنت عطا کر دے گا۔
یہ معاہدہ، افراد اور اسلامی ملک کے درمیان ہوتا ہے جو خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔

جنت، کے متعلق ہمارے ذہن میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ یہ مرنے کے بعد، دوسری زندگی میں جا کر ملے گی۔ مرنے کے بعد، دوسری زندگی کی جنت اپنے مقام پر برحق اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن جنت اور جہنم کی زندگی کا نقشہ اس دنیا میں بھی سامنے آتا ہے۔ غلط (غیر شرعی) معاشرہ، جہنم کا نمونہ ہوتا ہے اور صحیح (شرعی معاشرہ) میں زندگی جنت بد اماں گزرتی ہے۔ اس جنت کے متعلق جو اس دنیا میں شکل ہوتی ہے اور جس کی ذمہ داری، اسلامی ملک لیتی ہے۔ کہا گیا ہے۔

إِنَّ لَكَ أَلًا تَجُوعُ فِيهَا وَلَا تَعْرِىٰ ۚ وَأَنكَ لَا تَعْمَلُونَ فِيهَا
وَلَا تَضْمَعُونَ (۹۲)

اس میں ہمیں نہ بھوک کا خوف ہوگا، نہ کپڑوں کی فکر، نہ اس میں پیاس کی تکلیف ہوگی نہ مکان کی تنگی۔

دوسری جگہ ہے کہ اس جنت کی کیفیت یہ ہوگی کہ

وَكُلَا حَيْثُ شِئْتُمَا (۹۳)

انسان جہاں سے جی چاہے، نہایت فراوانی سے کھا پی سکے گا۔

آپ نے غور کیا، عزیزان! کہ یہ معاشرہ، تمام افراد معاشرہ کو ان کی بنیادی ضروریات زندگی

خوراک، لباس، مکان، وغیرہ) کی ضمانت دیتا ہے۔ جو نظام معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا، اسے اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی طرف منسوب کرے۔ اسی لئے حضور نبی اکرم (صلعم) نے فرمایا تھا کہ

”جس بستی میں کسی شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔“ (مسند امام احمد)

اور حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتابھی بھوک سے مر گیا، تو خدا کی قسم عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے رزق کے مسئلہ کو، فرد کی انفرادی ذمہ داری کے بجائے طرح معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری بنا دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ جس دامن کا ایک ایک تار ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے مفاد کے ساتھ بندھا ہو۔ جس کا تانا بانا پورے معاشرے میں باہم گروہ پیوست ہو۔ جو معاشرہ کے مختلف النوع مسائل کے ساتھ اس طرح گتھا اور گندھا ہوا ہو کہ کسی ایک کی حرکت باقی تمام عناصر کو متاثر کر دے۔ اس مسئلہ کو انفرادی قرار دینا، حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ قرآن کریم نے اسے اجتماعی مسئلہ قرار دے کر اس کی اصل دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے نظام معاشرہ کا اولین فریضہ یہ قرار دیا کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے۔

ملکیت زمین

سوال یہ ہے کہ معاشرہ اپنی اس عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح کرے گا؟ اس کے لئے ایک چیز بالکل واضح اور بدیہی ہے اور وہ یہ کہ معاشرہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برام ہو نہیں سکتا جب تک وسائل پیداوار پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ وسائل و ذرائع پیداوار میں، بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے (ہشیاے خورد و نوش کے علاوہ، جملہ صنوعات کے لئے خام مصالحہ ہیں سے ملتا ہے) اس کے متعلق قرآن کریم نے کہہ دیا۔ کہ اس پر انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ۔

وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ۝ (۴۵)

زمین کو ہم نے تمام مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جو چیز تمام مخلوق کی پرورش کا ذریعہ بنائی گئی ہو اسے کسی فرد کی ملکیت میں کیے دیا جاسکتا ہے؟ خدا نے ہوا کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ تمام جانداروں کی زندگی کا ذریعہ بنے۔ اگر ہوا کو انفرادی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس سے جس طرح بے شمار مخلوق دم گھٹ گھٹ کر مر جائے گی اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ بعینہ ہی پورشن زمین کی ہے۔ اس لئے اس نے کہا کہ اسے انفرادی ملکیت کے بجائے سَوَاءً۔ لِلْسَّائِبِ لِیْنِ۔ (۱۴۵)۔ رہنا چاہیے۔ یعنی اس کا انتظام ایسا کرنا چاہیے کہ یہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر چلی رہے۔ یہ مَتَاعًا لِلْمُقْوِیْنَ (۴۶) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے متاع حیات۔ اس میں رِزْقًا لِلْعِبَادِ (۴۷) ہے۔ یعنی خدا کے تمام بندوں کے لئے رزق۔

ستران کریم کی اپنی آیات کی تشریح کرتے ہوئے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے، اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیے۔ (ابوداؤد)

لہذا، زمین کو ایسی حیثیت دے دینا، جس سے یہ تمام مخلوق کے لئے مشترک ذریعہ پرورش رہنے کے بجائے کسی فرد یا افراد کی ملکیت اور جاہیدان بن جائے، اس مقصد کے خلاف ہو گا جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ یہ معاشرہ کی تحویل میں رہے گی اور معاشرہ ایسا انتظام کرے گا۔ جس سے ہر فرد کو اس کی فوٹا کے مطابق رزق ملتا جائے۔

زمین اور ہوا میں رزق

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زمین یا ہوا (یا سورج کی روشنی) میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہوا، روشنی وغیرہ فطرت کی طرف سے تیار شدہ حالت میں ملتی ہے۔ لیکن زمین سے، محنت کر کے، رزق حاصل کرنا پڑتا ہے اس لئے اس کی پیداوار ہوا اور روشنی کی طرح عام نہیں کی جاسکتی۔ ستران کریم اس سوال کا بھی جواب دیتا ہے اور نہایت شگفتہ اور دل نشین انداز میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم محنت کر کے زمین کو قابل کاشت بنا لیتے ہیں۔ اس میں ہل چلاتے ہیں۔ تخم ریزی کرتے ہیں۔ پانی

دیتے ہیں۔ اس طرح اس سے پیداوار ہوتی ہے۔ لہذا اس پیداوار کے ہم واحد مالک ہیں۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ذرا غور کرو کہ اس تمام کاروبار میں، تمہارا حصہ کس قدر ہے اور ہمارا (خدا کا) کس قدر۔ با دنی تدبیر یہ بات سامنے آئے گی کہ یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار تھا۔ اس میں سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ پیداوار کا بنیادی ذریعہ (زمین) ہماری پیدا کردہ تھی۔ تمہاری نہیں تھی۔ اب اس سے آگے بڑھو۔ اَفَرَاءَ بَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُونَ ۝ (۲۴۹-۲۵۰)۔ جو کچھ تم بوتاے ہو، کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے؟ اَمْ تَنْزِلُ عَلَیْکُمْ الْمَآءُ اَمْ غَنَیْنَا عَنْکُمُ الْمَآءُ ۝ تم فقط زمین میں بیج ڈالتے ہو۔ کہو کہ اس بیج سے فصل تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ اَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنٰہُ حُطًا مَّا فَلَکُمْ تَفْکَهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمَعْرِضُونَ ۝ اَمْ یَنْتَظِرُوْنَ اَمْ یَنْتَظِرُوْنَ ۝ اگر ہمارا اتنا نون زراعت ایسا نہ ہوتا تو فصل کا پروان چڑھنا تو ایک طرف یہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی۔ اور تم ششدر اور حیران رہ جاتے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ہم بے ہمتی میں چٹی پڑ گئی۔ ہمارا بیج بھی ضائع ہو گیا۔

پھر آگے بڑھو۔ اَفَرَاءَ بَیْتُمْ الْمَآءَ الَّذِی تَسْرُبُوْنَ ۝ کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا ہے۔ جو تمہارے لئے وجہ زیست اور تمہاری کھیتی کے لئے ذریعہ پیداوار ہے؟ اَمْ تَنْتَظِرُوْنَ ۝ اَمْ تَنْتَظِرُوْنَ ۝ اَمْ تَنْتَظِرُوْنَ ۝ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ اَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنٰہُ اُحْجَابًا فَلَوْلَا تَشْکُرُوْنَ ۝ اگر ہمارے نظام ربوبیت کا یہ تقاضا نہ ہوتا کہ نوع انسان کی پرورش ضروری ہے، تو ہم اسے ایسا کھاری بنادیتے جسے نہ تم پی سکتے۔ نہ اس سے تمہاری کھیتیاں اگ سکتیں۔ تم اس کے سپاس گزار کیوں نہیں ہوتے۔

اور آگے بڑھو۔ اَفَرَاءَ بَیْتُمْ النَّارَ الَّتِی تُورِدُوْنَ ۝ کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم روشن کرتے ہو۔ اَمْ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَ تَہْآ ۝ اَمْ غَنَیْنَا عَنْکُمُ الْمُنْشَوْنَ ۝ کیا ان درختوں جن سے آگ کا سامان حاصل ہوتا ہے۔ تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔

تم ان دفع بدیہی اور محسوس حقائق پر غور کرو کہ یہ سامان زیست جسے تم اپنی واحد ملکیت تصور کرتے ہو۔ اس میں ہمارا حصہ کس قدر ہے۔ اور تمہارا کس قدر؟ غَنَیْنَا لَجَعَلْنٰہَا شٰنًا ۝ ہم تمہیں اس حقیقت کی یاد دہانی کرانا چاہتے ہیں جسے تم فراموش کر چکے ہو۔ اس مشترکہ کاروبار سے جو کچھ حاصل ہوا ہے اس میں سے تم اپنا حصہ لے لو۔ اور ہمیں ہمارا حصہ دیدو۔ تم پوچھو گے کہ آپ کا حصہ کسے دیدیں؟ ہمارا جواب یہ ہے

کہ ہم نے اسے مَتَاعًا تَلْمُوقُونَ ۵ (۳، ۵۶) بنایا ہے۔ یعنی اسے بھوکوں کے لئے سامانِ زینت۔ اسے تم ان کے حوالے کر دو۔ یوں ہمارا حصہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی قرآنی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

پالتا ہے جج کو مٹی کی تاریکی میں کون

کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب

کون لایا کھینچ کر پھپھم سے باد ساز گار؟

خاک یہ کس کی ہے کس کا یہ نورِ آفتاب

کس نے بھری موتیوں سے خوشہ گندم کی تیر

موسموں کو کس نے سکھائی ہے خوں انقلاب

وہ خدا یا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں سیری نہیں

کمانے کی استعداد میں فرق

قرآن کریم نے جو کچھ ان آیات میں زمین کے متعلق کہلے وہی کچھ وہ خود انسانی صلاحیتوں کے متعلق کہتا ہے۔ تارون گوستران نے نظامِ سرمایہ داری کے نمایندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اُس کی ذہنیت یہ تھی کہ اِنَّمَا اُوْتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (۱۰۵)۔ میری تمام دولت، میری اپنی ہنرمندی اور قابلیت کی بنا پر مجھے ملی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی اور دخل نہیں دے سکتا۔ وستران کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۱۰۶)۔ یہ ذہنیت بڑی غلط تھی اور گڑھی پر مبنی ہے۔ لیکن لوگ اکثر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ جو کچھ کوئی کماتا ہے وہ اس کی تنہا، واحد قابلیت یا کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں بالواسطہ اور بلاواسطہ پورے معاشرہ کی تگ و تاز بھی شامل ہوتی ہے۔ اس میں متعدد عناصر ایسے ہوتے ہیں جن میں اسے انفرادی طور پر کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت، ماحول، معاشرہ کا نظم و نسق، مناسب مواقع کا حصول دیگر افراد کا تعاون وغیرہ۔ اس لئے جو کچھ ایک فرد کماتا ہے وہ بھی اس کی واحد ملکیت نہیں قرار پاسکتا۔ وہ حاصل ہوتا ہے

بہت سے دیگر عناصر کا۔ لہذا اسے بھی اسی نسبت سے بننا چاہیے۔ اس نے، اسے سورہ بخل کی ایک آیت میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ **وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ** ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ بعض افراد میں، دوسروں کے مقابلہ میں، اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ صلاحیت بنیادی طور پر ہماری عطا کردہ ہوتی ہے۔ مگر یہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ **فَمَا آتَيْنَا بَرَّآؤِی رِزْقًا قَلِیْلًا عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ** جن لوگوں کو اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت حاصل ہوتی ہے وہ اس فاضلہ کمائی کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ درحقیقت انہیں کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ رزق ہوتا ہی ان کا ہے اس لئے اسے ان کی طرف ہی لوٹا دینا چاہیے۔ لیکن لوگ ایسا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ **فَلْھُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ** واہ! اس طرح تو گدھا گھوڑا سب برابر ہو گئے۔ اگر یہ کمائی انہیں دیدی جائے تو پھر ہم میں اور ان میں سترق کیا رہا؟

اب سنئے ان کے اس اعتراض کا جواب۔ کہا **اَفَیَنْعَمْتَ اللّٰہُ یُجْعَلُ ذُوْنٌ ۙ** (۱۶)۔ یہ لوگ اس سے انکار کرتے ہیں کہ جو کچھ انہیں زائد حاصل ہوا ہے وہ ان اسباب کی وجہ سے ہے جو ان کے پیدا کردہ نہیں، بلکہ انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ وہ اس کمائی کے واحد مالک ہیں ان کا اس حقیقت سے انکار ہے کہ اس میں کتنا کچھ ایسا ہے جو ان کا اپنا پیدا کردہ نہیں۔ یہ عناصر وہ ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا کہ **وَمَا یُکْفُرُوْنَ بِرُحْمَةِ رَبِّہِمْ اِنَّہُمْ یَاۡدُرُوْنَ** (۱۷)۔ یاد رکھو! یہ تمام سبب و ذرائع، انعامات خداوندی ہیں۔ تمہارے پیدا کردہ نہیں۔ اس لئے ان کا حاصل تمہاری واحد ملکیت نہیں ہو سکتا۔

اصل یہ ہے کہ یہ کم اور زیادہ کمائی کا تصور بھی سکے کا پیدا کردہ ہے۔ ایک مزدور اور ایک انجینئر دن بھر کام کرتے ہیں۔ ہم مزدور کو شام کو تین روپے دیتے ہیں اور انجینئر کو تیس روپے۔ یوں مزدور کی کمائی

مزدور کا معاملہ تین بدیہ اور انجینئر کا معاملہ تیس بدیہ طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا مقرر کردہ ہے۔ اگر مزدور انجینئروں کی طرح کمیاب ہوں تو ان کا معاملہ بھی تیس روپے ہو اور اگر انجینئر مزدوروں کی طرح عام ہو جائیں تو ان کا معاملہ تین روپے ہو جائے۔ غلط معاشرہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں مزدور عام ہیں تاکہ سرمایہ دار کو ان کی محنت کا معاملہ زیادہ نہ دینا پڑے۔

انجیر کی کمائی سے کم ہوتی ہے۔ لیکن یہی مزدور اور انجیر (دو بھائی) اپنا مکان تعمیر کر رہے ہوں تو اس وقت ان کی کمائی میں کمی اور مٹشی کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ دونوں کے ذمے کچھ کام ہوتا ہے اور وہ اس کام کو محنت سے سرانجام دیتے ہیں۔ لہذا کمائی میں کمی اور مٹشی اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم کام کے معاوضہ کا معیار سکے قرار دیں۔ جب صرف کام سامنے ہو تو کمائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال ضروریات کا ہوتا ہے جسے معاشرہ پوری کرتا ہے۔

اسلامی نظام میں معاشرہ پوری کی پوری ملت کا اپنا گھر ہوتا ہے جس کی تعمیر اور تنہا تمام افراد کا فریضہ ہوتا ہے۔ وہ سب اپنے اپنے مفوضہ کام کو فریضہ سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں اس لئے ان کے ہاں اس کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں قرآن کے معاشی نظام میں، جب وہ اپنی مکمل شکل میں قائم ہو کمائی کم اور مٹشیں ہوتی ہی نہیں۔

دولت

عربی زبان میں "دولت" کے معنی گردش کرنے والی چیز کے ہیں۔ اور یہ بیشتر مشتمل ہوتی ہے سونے اور چاندی کے سکوں (یا ان کے بدل، کرنسی نوٹوں) پر۔ ان سکوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ شروع شروع میں، جب انسان کی تمدنی زندگی اس قدر وسیع اور پیچیدہ نہیں تھی، لوگ اپنی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لئے، اشیاء مستعملہ کا تبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ اسے انگریزی زبان میں بارٹر سسٹم سے تعبیر کیا جاتا ہے، بعد میں جب زندگی پھیل گئی اور اشیاء کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا وقت طلب ہو گیا تو سکے رائج کئے گئے۔ یہ تبدیلی کی گئی تھی ان کی سہولت کی خاطر، لیکن مفاد پرست گروہ نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اشیاء مستعملہ کا درجہ اس زمانے میں بیشتر کھانے پینے کی چیزوں پر مشتمل ہوتی تھیں، زیادہ عرصہ تک ذخیرہ کرنا مشکل تھا۔ اس لئے وہ بہر حال لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے گردش میں رہتی تھیں۔ لیکن روپیہ پیسہ کو جب تک جی چاہے دبا کر رکھا جاسکتا تھا۔ اس طرح اس گروہ نے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیا اور دولت، گردش میں رہنے کے بجائے، مالداروں کے دھنوں میں بند ہوتی گئی۔ دولت کی گردش رک جانے سے جو مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دولت کو جس قدر گردش سے روکا جائے گا اسی قدر لوگوں کی ضروریات رُک رہی گی۔ قرآن کریم

دولت جمع کرنے اور روک رکھنے کو سنگین جرم اور تباہی کا موجب قرار دیا ہے۔ اس نے کہا تباہی اور بربادی ہے اس کے لئے۔

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَ عَدَدًا (۱۱۱)

جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اس کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ رتنا نوے کے پھیر میں پڑ کر اسے گنتا رہتا ہے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ اس روش زراذذی سے اس جہنم کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ ”سورہ معارج میں ہے کہ جہنم اس شخص کو آوازیں دے دے کر بلاتی ہے جس کی کیفیت یہ ہو کہ جَمَعَ فَأُدْغَىٰ (۱۱۲) وہ دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ سورہ ماعون میں ہے کہ دولت اور دیگر ذرائع رزق کو چشمہ جاریہ کی طرح بہتے رہنا چاہیے تاکہ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے بہرہ یاب ہو سکے۔ لیکن لوگ يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔ ان چیزوں کے آگے بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور یوں انسانیت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر دیندار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو ان کا یہ دعوے بھوٹا ہے۔ یہ دین کی تکذیب کرتے ہیں یہ اگر اپنے آپ کو نمازی کہتے ہیں تو ان کی نمازیں ان کے لئے تباہی کا موجب ہیں۔ (۱۱۳)۔ اور عذاب جہنم کا باعث۔ سورہ توبہ میں ہے اَلَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۱۱۴)۔ جو لوگ چاندی اور سونے کے کے جمع کر رکھتے ہیں اور انہیں نوع انسان کی بیود کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ (۱۱۵)۔ ان کے لئے ایک الم انگیز عذاب کا اعلان کر دو۔ يَوْمَ نَحْجِي عَلَيْهِمْ فِيْ ذٰلِكَ جَهَنَّمَ فَتَكُوْنُ بِهَا جِبَابُهُمْ وَ يَحْبُوْهُمْ بِهَا وَ ظُھُوْرُهُمْ ۚ هٰذَا مَا كُنْتُمْ تَرْفُؤْ اَنْفُسَكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۱۱۶)۔ جس دن ان سگوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور ان سے ان کی پیشانیوں۔ پہلوؤں اور پشتوں کو دایا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ سگے ہیں جنہیں تم نے صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر روک رکھا تھا۔ لہذا آج تم اس الم انگیز عذاب کا مزہ چکھو جو تمہاری غلط روش کا فطری نتیجہ ہے۔ واضح رہے کہ مترآن کریم نے دولت کے روک رکھنے کے مقابلہ میں ”اتفاق“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نفق اس سڑگ کو کہتے ہیں جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ اس سے دولت کے متعلق

قرآن کریم کا نقطہ نگاہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بخل کا لفظ ہے۔ یعنی دولت کو عالمگیر انسانیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اپنی ذات کے لئے روک رکھنا۔ جو قوم اپنے ہاں اس قسم کا معاشی نظام رائج کرے جس میں اس روش کو جرم نہ قرار دیا گیا ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے وَ يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۱۱۳)۔ اور اس کی جگہ اسی قوم لے لیتی ہے جو جیسی نہیں ہوتی۔ یعنی اس قوم کا معاشی نظام اس قسم کا نہیں ہوتا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے قوموں کے عروج و زوال میں ان کے معاشی نظام کا کس قدر بنیادی دخل ہے۔

دولت کی گردش

اتنا ہی نہیں کہ دولت گردش میں رہے۔ بلکہ اس کی گردش ایسی ہو کہ وہ معاشرہ میں اس طرح رواں دواں رہے جس طرح جسم کی رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ادھر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ كَيِّ لَا ذُوْلَةَ بَيْنِ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۱۱۴)۔ وہ تم میں سے امیروں کے گھروں میں ہی نہ پھرتی رہے۔

رِئَاسَات

دولت کیوں جمع کی جاتی ہے؟ اس لئے کہ انسان کو محنت کر کے کما مانہ پھرے، بلکہ خود دولت کمائی کا ذریعہ بن جائے۔ بیان سے وہ سوال سامنے آتا ہے جو نظام معیشت کی اصل اور بنیاد ہے۔ یعنی یہ معاوضہ محنت کا ہونا چاہیے یا سرمایہ کا۔ قرآن کریم اس باب میں کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے۔ کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۱۱۵)۔ "ان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے" معاوضہ محنت کا ہے۔ سرمایہ کے معاوضہ کو وہ رِئَاسَات سے تعبیر کرتا ہے۔ ہمارے ہاں رِئَاسَات ترجمہ عام طور پر سود کیا جاتا ہے اور اس سے پھر اس قسم کی بحثیں چھڑ جاتی ہیں کہ سود کس قسم کا جائز ہے اور کس قسم کا ناجائز۔ سوال سود کا نہیں رِئَاسَات کا ہے اور رِئَاسَات کے معنی ہیں سرمایہ پر بڑھوٹی۔ خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ ہے رِئَاسَات جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ رِئَاسَاتِ الرِّبَا (۱۱۵)۔ چونکہ ایسا معاشی نظام جس میں، سرمایہ کا معاوضہ جائز قرار دیا جائے

قرآن کے معاشی نظام کی یکسر نفیض ہے اس لئے قرآن کریم نے اسے اسلامی نظام کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے۔ (۲۴۸)۔

بیع (تجارت)

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَزَمَ الْرِبَا (۲۴۹)**۔ خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بیع (تجارت) میں بھی تو سرمایہ پر منافع لیا جاتا ہے اس لئے کیسے طرح جائز ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ اصول صحیح نہیں کہ فتراتی نظام معیشت میں خالی سرمایہ پر منافع جائز نہیں۔ یہ سوال آج کی ذہنیت کا پیدا کردہ نہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں بھی ایسے لوگ تھے جو اس ذہنیت کے حامل تھے اور کہتے تھے کہ **اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا (۲۵۰)**۔ بیع (تجارت) بھی تو ربا ہی کی مثل ہے۔ پھر یہ کیوں ہے کہ بیع حلال ہے۔ اور ربا حرام۔

اس سلسلہ میں، پہلے تو بیع کے لفظ پر غور کیجئے۔ یہ لفظ خریدنے اور فروخت کرنے، دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ یعنی ایسی شکل جس میں ایک شخص بیک وقت کچھ بیچتا ہے اور کچھ خریدتا ہے۔ یہ شکل بارٹر سسٹم ہی میں ممکن العمل ہے۔ اس میں ایک شخص اپنی ایک جنس بیچتا ہے اور اس کے بدلے میں دوسری جنس خریدتا ہے۔ اس سے ایک ہی سودے میں دونوں طرف سے، خریدا اور فروخت عمل میں آجاتی ہے۔ جب سکوں کے عوض کسی شے کو خریدا جائے تو خریدار دوسرے کی شے کو خریدتا ہے۔ اس کے بائقوں کچھ بیچتا نہیں۔ اس لئے بیع (بارٹر سسٹم) میں ربا سرمایہ پر بڑھوتی کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

اب رہی بیع (تجارت) کی موجودہ شکل جس میں کاروبار سکوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جب فتراتی معیشت کے یہ اصول واضح ہیں کہ

(۱) معاوضہ محنت کا ہے۔ اور

(۲) خالی سرمایہ پر منافع حرام ہے۔

تو تجارت کی صرف وہ شکل جائز قرار پائے گی جس میں تاجر اپنی محنت کا معاوضہ لے سکے۔ جو سرمایہ اس نے لگایا ہے اس پر منافع نہ لے۔ یعنی اس میں اصول یہ ہو کہ

قیمت فردخت • لاگت + محنت کا معاوضہ
اور "محنت کا معاوضہ" نظام ملکیت کی طرف سے متعین ہو۔

کارگیر اور دوکاندار

تجارت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کاریگر کوئی چیز بنا لے۔ دوکاندار اسے خریدتا ہے اور پھر اپنے منافع کے ساتھ آگے بچھلے۔ غلط نظام معیشت میں، دوکاندار کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کاریگر کو کم از کم دے اور گاہک سے زیادہ سے زیادہ لے۔ قرآن کریم نے اس ذہنیت کو فاسقانہ اور اس قسم کے نظام کو جس میں بیرونی مام ہو بھرانہ قرار دیا ہے اور اس کا نتیجہ قوم کے لئے تباہی بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے
وَلَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ﴿٢٣٥﴾ تَبَاهِي بے ایسے لوگوں کے لئے جن کی کیفیت یہ ہو کہ إِذَا الْكُتَالُ
عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ﴿٢٣٦﴾ جب وہ دوسروں سے لیں تو پورا پورالیں۔ وَإِذَا كَالُوهُمْ
أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ﴿٢٣٧﴾ اور جب انہیں دیں تو ماپ اور تول میں کمی کر دیں۔
ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی عامہ کردہ شرائط کو پورا کرنے کے لئے بیع کی وہ شکل زیادہ مناسب ہوگی جس میں اشیائے مستعملہ خود نظام ملکیت کے زیر تحویل تیار ہوں اور وہی ان کی تقسیم کا انتظام کرے۔

فاضلہ دولت

عَزَّوَجَلَّ میں نے جو کچھ اس وقت تک کہا ہے وہ ایک صحیح (مسترائی) نظام معاشی کے اصول و مبادیات ہیں۔ درنہ قرآن کریم نے، ایک مختصر اور سادہ حکم سے پورے نظام سرمایہ داری کو اس کی جڑ اور بنیاد سے اکھڑ کر رکھ دیا ہے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) اگر افراد معاشرہ کے پاس فاضل دولت نہ رہے تو نظام سرمایہ داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں سنئے کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ
لے رسول! یہ کچھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت، دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلی رکھیں قُلِ
الْعَفْوُ ﴿٢٣٨﴾ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، سب کی سب۔ آپ نے غور کیا کہ اس ایک حکم سے کس طرح نظام سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

ضروریات کا تعین کون کرے گا؟

اس مقام پر ایک دلچسپ اعتراض سامنے لایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ان ضروریات کا تعین کون کرے گا؟ اگر اسے لوگوں کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اپنی ضروریات ہی اتنی بتائیں گے جن کے پورا ہونے کے بعد کچھ باقی نہ بچے۔ اور اگر ان ضروریات کا تعین حکومت کی طرف سے ہوگا۔ تو یہ زندگی، جیل خانے کے قیدیوں کی سی ہوگی جس میں ان کی ضروریات کا تعین جیل کے قواعد کی بُرد سے ہوتا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ ہم نظام تو اسلام کا سامنے لیتے ہیں اور اس کا اطلاق اپنے آپ پر کرتے ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ نہ ہمارا ذہن متراستی، اور نہ ماحول متراستی۔ ظاہر ہے کہ متراستی کے اصول و احکام قرآنی ذہنیت و تصورات کے حامل افراد کے لئے ہیں۔ اور وہ متراستی ماحول اور نظام کے اندر فٹ ہو سکتے ہیں اگر ہم ان کا اطلاق اپنے آپ پر کرنے لگیں گے۔ تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی ٹیڑھے پاؤں میں سیدھا جوتا پہنانے کی کوشش کی جائے۔ جن مسلمانوں نے اس نظام کو عملاً متشکل کیا تھا، ان کی ضروریات اور ضروریات کے تعین کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگائیے۔ جب حضرت ابو بکر خلیفہ منتخب ہوئے تو سوال یہ پیدا ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ کیا مقرر کیا جائے۔ بحث و تھمیس کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ اسے خود خلیفہ پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی ضروریات کے لئے کتنا وظیفہ کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے دریافت کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم آمدنی کیا ہے۔ وہی آمدنی آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کی۔ جب پوچھا گیا کہ اس میں آپ کا گزارہ کیسے ہوگا تو آپ نے فرمایا۔ کہ اتنی آمدنی میں جس طرح اُس مزدور کا گزارہ ہوتا رہا۔ اسی طرح میرا گزارہ ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مزدور کی آمدنی بڑھتی جائے تاکہ اس طرح میرے وظیفہ میں بھی اضافہ ہوتا جائے۔

اب رہا ضروریات کا تعین۔ ایک دن کھانے کے بعد آپ نے بیوی سے کہا کہ کوئی سیٹھی چیز نہیں؟ اس نے کہا کہ بیت المال سے قرآن آتا ہے اس میں سیٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ سات آٹھ روز کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ دسترخوان پر تھوڑا سا حلوہ بھی رکھا ہے آپ نے اُسے کھایا۔ اور پھر پوچھا کہ یہ حلوہ آج کیسے بن گیا؟ بیوی نے کہا کہ میں نے اُس دن آپ کی خواہش کو محسوس کر کے یہ کیا کہ ہر روز آٹا گوندھتے وقت ایک مٹھی بھر آٹا الگ رکھ لیتی تھی۔ سات آٹھ روز کے بعد

وہ آگاہنا ہو گیا کہ بازار سے اس کے عوض تھوڑا سا شیرہ مل گیا۔ اس سے اس نے یہ حلوہ تیار کر لیا۔
آپ گھر سے نکلے اور سیدھے رشن ڈپو پر گئے اور مودی سے کہا کہ ہمارے ہاں جتنا آٹا ہر روز
جاتا ہے آئندہ اس سے ایک سٹھی بھر کم جائے گا کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ سٹھی بھر کم آئے
میں بھی ہو جاتا ہے۔

یہ تھا معیار ان کا اپنی ضروریات کے تعین کے لئے۔ اپنی ضروریات کا پورا کرنا تو ایک طرف قرآن کریم
نے ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ یُوْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهٖمْ خَصَاصَةٌ (۹۴)
وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس
دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینے کی کیفیت یہ تھی کہ ایک دن مصر کا گورنر باب خلافت میں آیا۔ اس نے
دیکھا کہ امیر المؤمنین (حضرت عمرؓ) زیتون کے تیل کے ساتھ جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اب
مصر سے کافی گیہوں آ رہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے کہا کہ اس وقت مجھے
یقین ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو جو کی روٹی مل جاتی ہے۔ جس دن تم اس کا یقین دلا دو گے کہ مملکت
کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھاؤں گا۔
قرآن کا معاشی نظام، قلب و نظر میں کس قسم کی تبدیلی چاہتا ہے۔ اس نکتہ کے متعلق میں
تفصیل سے ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی معاشرہ میں
ضروریات کا تعین اس طرح ہوتا ہے۔

حاصل بحث

اس وقت تک میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ قرآن کریم کے
معاشی نظام کی رو سے۔

(۱) تمام افراد مملکت کو ان کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانا، مملکت کا فرض ہے۔ بلکہ
اس کی ہستی کی وجہ جواز ہے، ان بنیادی ضروریات میں، کھانا، پینا، لباس، مکان، علاج، تعلیم
وغیرہ سب شامل ہیں انہیں اس طرح پورا کیا جائے گا کہ (REGIMENTATION) کے بجائے افراد کے

ذاتی ذوق کی تسکین بھی ہوتی ہے۔

(۲) مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ براہو سکتی ہے کہ ذرائع رزق اس کی تحویل میں رہیں۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے، ذرائع رزق پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب نظام معاشرہ کے کنٹرول میں رہیں گے۔ ملکیت اس پر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔

(۳) ہر فرد اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے گا۔ اس سے مستثنیٰ دی ہوں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ معذور ہوں۔ کام کی تقسیم، افراد کی صلاحیت اور امکانی استعداد کے مطابق ہوگی۔

(۴) اگر ہم قرآن کے اصولوں کو دورِ حاضر کے معاشی تصورات کی روشنی میں سمجھنا چاہیں تو کہا جائیگا۔

کس اس میں معاوضہ محنت کا ہوگا سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ خالی سرمایہ پر بہتر کامنا منع ہوگا۔ فاصلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے گی اور جب فاصلہ دولت ہی نہ ہوگی تو روپیہ جمع کرنے یا جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

کیونترزم اور اسلام

میں یہ کہہ رہا ہوں، اور میری نگاہیں اس سوال کو بھانپ رہی ہیں جو آپ کے افق قلبی سے اٹھ کر آپ کے ذہن کو متاثر کر رہا ہے۔ آپ کے دل میں سوال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ یہ تو پھر کیونترزم ہو گیا۔ اس سوال کا جواب ضروری ہے اسے غور سے سنئے۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ اگر قرآن کا معاشی نظام اور کیونترزم کا معاشی نظام ایک ہی ہیں یا ان دونوں میں مماثلت ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ دنیا کی کسی قوم نے اسلام کے معاشی نظام کو اپنا یا ہے۔ قرآن کریم نے یہ نظام چودہ سو سال پہلے دیا تھا اور کیونترزم کا نظام بیسویں صدی کی پیداوار ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ کیونترزم نے یہ نظام، اسلام سے لیا ہے نہ یہ کہ اسلام اس نظام کو کیونترزم سے مستعار لے رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے اور مجھے اس کا اکثر تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ جو لوگ موافق یا مخالف کہتے ہیں کہ اسلام اور کیونترزم ایک ہی ہے، وہ نہ اسلام کو سمجھتے ہیں نہ کیونترزم کو۔ کیونترزم اس معاشی نظام ہی کا نام نہیں جو روس یا چین میں رائج ہے۔ کیونترزم ایک مخصوص فلسفہ زندگی یا نظریہ حیات ہے جس پر

اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کسی معاشی یا سیاسی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک فلسفہ زندگی اور نظریہ حیات ہے جس کی بنیادوں پر اس کے تمام نظام استوار ہوتے ہیں۔ کمیونزم کا فلسفہ زندگی یا نظریہ حیات، اسلام کے فلسفہ زندگی یا نظریہ حیات کی یکسر نقیض ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وقت نہیں کہ میں آپ کو تفصیل سے بتا سکوں کہ اسلام کا فلسفہ حیات کیا ہے اور کمیونزم کا فلسفہ زندگی کیا۔ اس وقت میں ان کے صرف نمایاں اصولوں پر اکتفا کروں گا۔ کمیونزم کا فلسفہ زندگی یہ ہے کہ (۱) زندگی صرف یہی طبعی زندگی ہے جو انسانوں اور حیوانوں دونوں میں مشترک ہے۔ انسان طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ جزا ہے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح ایک حیوان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۲) دنیا میں ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب تک پہنچتا ہے تو اس پر زوال آنا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک اور نظام برآمد ہونا شروع ہو جاتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ جب پوچھا جائے کہ وہ کون سی قوت ہے جس سے یہ گردش دو لابی اس طرح جاری ہے تو اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رو سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نظام سرمایہ داری کا دور تھا۔ اب اس کی جگہ (اس کی ضد) اشتراکی نظام کی باری ہے (اس فلسفہ کی رو سے) اشتراکی نظام کے بعد پھر نظام سرمایہ داری کا دور آجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی شکل سابقہ نظام سرمایہ داری سے قدرے مختلف ہوگی۔

(۳) اس نظام کی تشکیل اور انسانی زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق ہر فیصلہ مملکت کی مصلحت کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کوئی ایسے مستقل اصول و اقدار نہیں جن کی پابندی ضروری ہو۔

(۴) اس فلسفہ زندگی کو ماننے والے، نہ خدا کے وجود کے قائل ہوتے ہیں نہ وحی کے، نہ (طبعی جسم سے ماوراء) انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کو تسلیم کرتے ہیں نہ حیات آخر کو۔ ان کے نزدیک

موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب

- اس کے برعکس، قرآن کا عطا کردہ فلسفہ زندگی ہے جس کی رو سے:
- (۱) انسانی زندگی، محض طبیعی جسم کی زندگی کا نام نہیں۔ انسان میں طبیعی جسم کے علاوہ، ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔
- (۲) انسانی زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ نشوونما یافتہ ذات، فرد کی موت کے بعد زندہ رہتی ہے اور زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔
- (۳) انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو انسان کو وحی کی رو سے عطا ہوئی ہیں۔ ان اقدار میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔
- (۴) چونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر انسانی ذات کی نشوونما جسم کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے اس لئے انسانی جسم کی پرورش نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے ایک ایسا معاشی نظام دیا گیا ہے جس میں جسم انسان کی پرورش اس انداز سے ہوتی چلی جاتی ہے کہ حصولِ رزق کی جدوجہد، انسانی ذات کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی، بلکہ یہ اس کے نشوونما کے لئے مدد و معاون ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ یہ نظام، افراد معاشہ کو روٹی کی منگی سے آزاد کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے وقف کر سکیں۔ ان مقاصد کے حصول کی جدوجہد سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

جذبہ محرکہ

اس مقام پر شاید آپ کہہ دیں کہ کسی فلسفہ زندگی کا معاشی نظام سے کیا تعلق ہے؟ اس کا تعلق بڑا گہرا ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ انسان کا ہر عمل، اس کے جذبہ محرکہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جذبہ محرکہ کے بغیر عمل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ (۱) انسان کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے (۲) اس مقصد کے حصول کے لئے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ (۳) جب وہ خواہش مستحکم اور شدید ہو جاتی ہے تو وہ ارادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی کو جذبہ محرکہ کہتے ہیں۔ اور (۴) جب یہ جذبہ، انسان کی طبیعی قوتوں کی رو سے، محسوس شکل میں سامنے آتا ہے تو اسے انسان کا عمل کہا جاتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسان کے عمل کی بنیاد اس کے پیش نظر مقصد پر ہوتی ہے۔ اور

مقصد کا تعین، وہ فلسفہ حیات کرتا ہے جسے انسان بطور ایمان اپنے لئے اختیار کرتا ہے۔ "ایمان" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس فلسفہ زندگی کو اس قدر سچا اور گراں بہا سمجھتا ہے کہ وہ اس کی خاطر ہر ترہ بانی کئے کے لئے تیار رہتا ہے۔

یہ فلسفہ حیات (آئیڈیالوجی) کا تعلق معاشی نظام کے ساتھ۔ اب آپ پوچھیں گے کہ کیونترزم کے فلسفہ حیات میں وہ کیا خرابی ہے جس کی بنا پر اسے انسان کے معاشی نظام کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ نکتہ بھی اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ صحیح معاشی نظام کی بنیاد اس اصل الاصول پر ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی رقم از کم، ضروریات کے بعد، جو کچھ فاضل ہو اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام کر دے۔ سوال یہ ہے کہ انسان ایسا کیوں کرے؟ وہ کیوں زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کمائے اور اس محنت کے ماحصل کو دوسروں کے لئے عام کر دے؟ دوسرے یہ کہ اگر کسی انسان کو اس کا یقین ہو کہ اس کی بنیادی ضروریات ہر نوع پر دی ہوتی رہیں گی تو وہ کام ہی کیوں کرے گا۔ اور اگر وہ کام کرے گا تو بڑی بے دلی سے کرے گا۔ جان مار کر کبھی نہیں کرے گا بالخصوص جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کی زائد از ضروریات کمائی دوسرے لوگ لے جائیں گے۔ کیونترزم کے فلسفہ حیات کی رو سے، اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جو زیادہ کمائے وہ اپنی فاضلہ کمائی ان لوگوں کو دیدے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تو خالص جذباتی دلیل ہے۔ اس کا تعلق کیونترزم کے فلسفہ حیات سے کچھ نہیں۔ کیونترزم کا فلسفہ حیات اس قسم کا جذبہ محرکہ پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فلسفہ حیات کی وجہ سے کیونترزم کے ساتھ ہو گیا ہے؟ روس نے مظلوم و مقہور مزدوروں کو آواز دی کہ اٹھو اور ان دولت مندوں کو لوٹ کر انہیں ختم کر دو۔ وہ لٹھے اور انہیں ختم کر دیا۔ انکا یہ عمل انتقام کے جذبہ کی پیداوار تھا جبکہ دولت مند طبقہ باقی نہ رہا۔ توجہ! انتقام بھی باقی نہ رہا۔ اور جب یہ جذبہ ہی باقی نہ رہا تو پہلے ہی ہوئی عمارت کس طرح قائم رہتی؟

اے کیونترزم کے فلسفہ حیات کی رو سے جب یہ مان لیا جائے کہ سابقہ نظام سرمایہ داری کی جگہ اب تاریخی وجہ کی قوت سے، نظام اشتراکیت آکر رہنا ہے اور اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ تو اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے کسی کوشش اور سعی و کاوش کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس نظام نے تو ہر حال آکر رہنا ہے خواہ اس کے لئے کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

نتیجہ یہ کہ لینن کے زمانہ تک تو کمیونزم کا معاشی نظام چلا۔ اس کے بعد اسٹیلن کو اسے چلانے کے لئے ڈنڈے کی ضرورت پڑی۔ لیکن ڈنڈے کے زور پر کوئی نظام زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اسٹیلن کے بعد اس کی گاڑی رک گئی۔ اور روس کو اس نظام میں خاصا رد و بدل کرنا پڑا۔ اس وقت چین اور روس میں جو تنازع چل رہا ہے وہ یہی ہے کہ روس میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا اور چین اس پر متصر ہے کہ اسے اس شکل میں باقی رکھا جائے۔ چین میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں اس لئے قائم ہے کہ اس وقت ان کے ہاں وہ پارٹی موجود ہے جس کے ہاتھوں یہ انقلاب عمل میں آیا تھا۔ اس اعتبار سے، چین اس وقت اس مقام پر ہے جس مقام پر روس لینن کے زمانہ تک تھا۔ جب چین کی موجودہ نسل کے بعد اگلی نسل آئے گی تو ان کے سینوں میں بھی وہ جذبہ باقی نہیں رہے گا جو اس نظام کے قیام کے لئے اس قدر ترقی پزیر ہے۔ اس وقت وہاں بھی پیپے اسٹیلن کے ڈنڈے کی ضرورت پڑے گی۔ اور اس کے بعد اس نظام کی گاڑی آگے چلنے سے رک جائے گی۔

یہ بنیادی نقص کمیونزم کے فلسفہ حیات کا جس کی وجہ سے ان کا معاشی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

اسلام کا فلسفہ حیات

اس کے برعکس، اسلام کے فلسفہ حیات کو لیجئے۔ میں نے بتایا ہے کہ اسلام کے فلسفہ حیات کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشو و نما ہے۔ اور یہ نشو و نما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہو سکتی ہے جو ان کو وحی کی رُو سے عطا ہوئی ہیں۔ ان اقدار میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ

اَلَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۝ (۹۲)۔ جو شخص اپنی کمائی دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیتا ہے، اس کی ذات کی نشو و نما ہو جاتی ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ قرآن کے فلسفہ حیات کی رُو سے۔

(۱) انسانی زندگی کا مقصد پھر، انسانی ذات کی نشو و نما۔ اور

(۲) انسانی ذات کی نشو و نما اس طرح ہوتی ہے کہ انسان پوری محنت سے کمائے اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بطیب خاطر دیدے۔

جس شخص کا اس فلسفہ حیات پر ایمان (یقین) ہوگا اس سے کام کرانے کے لئے نہ کسی ڈنڈے کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی اس کی زائد کمائی کو اس سے زبردستی چھیننے کی حاجت۔ وہ خود اپنی ذات کی بھلائی کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا اور اس میں سے کم از کم اپنے لئے رکھ کر باقی سب، اپنے دل کی کامل رضامندی سے دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے دیدے گا۔ یہ ہے کمیونزم کے فلسفہ حیات اور اسلام کے فلسفہ حیات کا اثر ان کے معاشی نظام پر۔ پروفیسر ہاٹری (HAWTREY) نے لکھا ہے کہ جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام پر آمادہ کرتا ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ (جزئیات میں اس قدر مماثلت کے باوجود) قرآن کا معاشی نظام کمیونزم کے معاشی نظام سے کس قدر متمیز ہے۔ کمیونزم کے معاشی نظام کے پاس وہ بنیاد نہیں جس پر اس قدر عظیم عمارت قائم رہ سکے۔ اور قرآن کا معاشی نظام اسی محکم بنیادوں پر استوار ہے کہ لَا اِفْصَامَ لَهَا۔ وہ کبھی منہدم نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے روس کی توجہ خاص طور پر مبذول کر لائی تھی۔ انہوں نے پہلے کمیونزم کے فلسفہ حیات کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ

کردہ ام اندر متا ماتش نگاہ
لا سلاطین۔ لا کلیسا۔ لا الحج

یعنی ان کا جذبہ محرکہ سارے کا سارا تخریبی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب آپ کسی غلط نظام کہنے کی جگہ دوسرے نظام لانا چاہیں گے تو آپ کو (سب سے پہلے) اس نظام کو اوپر سے نیچے تک منہدم کرنا پڑے گا۔ یہ عمل یکسر تخریبی ہوگا۔ لیکن یہ اس پروگرام کی پہلی کڑی ہوگی۔ اس تخریب کے بعد تعمیر شروع ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ

در مقام لایبیا سایہ حیات
سوئے آلا می حنرا مد کائنات

لا (تخریب) کے بعد آلا (تعمیر) لاینفک ہے۔ اگر آلا (تعمیر) نہ ہو تو زندگی کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے روس کو مخاطب کر کے کہا کہ

کردہ کار حنرا مدنا تمام
بگذرا ز لا۔ جانب آلا حنرا م

تو نے باطل کے ہر خدا کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ تو نے ملوکیت کو جڑ بنیاد سے اکھڑ دیا۔ تو نے نظام سرمایہ دار کا جنازہ نکال دیا۔ تو نے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا۔ تو نے یہ کچھ تو کر دیا۔ اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو تیرے ہاتھوں میں انجام پایا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بعد وہ مثبت بنیاد کونسی ہے جس پر تو اپنے نظام نو کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔

اے کہ می خواہی نظام عالمی

جستہ اور اساس عکس!

یہ اساس محکم جو نظام سرمایہ داری کی شکست و ریخت کے بعد ایک صحیح معاشی نظام کی بنیاد بن سکنے کے قابل ہے، صرف قرآن کے عطا کردہ فلسفہ حیات سے مل سکتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے فلسفہ میں، سرفرائس ینگ کے نام، اپنے خط میں لکھا تھا کہ

(BOLSHEVISM PLUS GOD IS ALMOST IDENTICAL

WITH ISLAM.)

اگر بالشوزم کے ساتھ خیر اکو شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام کے قائل ہو جاتا ہے۔ خدا کو شامل کرنے سے ان کی مراد یہی تھی کہ اس نظام کو خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انہیں امید تھی کہ روس جب اپنے جذباتی بحران سے نکل جائے گا تو اس "اساس محکم" کی تلاش ضرور کرے گا۔ لیکن روس نے اپنا مقام ہی چھوڑ دیا۔ اب وہی پوزیشن چین کی ہے۔ اس نے بھی ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ لیکن اس حصہ لڑکے کے بعد، حصہ لڑا اس کے پاس بھی نہیں۔ اے کاش! آج کوئی اقبال، چین کو بتا سکے کہ وہ اساس محکم کونسی ہے جس پر اس کے نظام کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ جو کچھ روس کے ساتھ ہوا ہے، وہی کچھ ایک نسل کے بعد، چین کے ساتھ بھی ہو گا۔ آؤ اگر ایسا ہوا تو یہ دنیا کی انتہائی قسمت ہو گی۔ دنیا کی قسمت کے ستارے تو قرآن کے سر اجاؤ منیر اُبی سے جگمگا سکتے ہیں۔

ایک اعتراض

نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے اور یہی اعتراض اس نظام کے حق

میں بطور دلیل محکم پیش کیا جاتا ہے کہ ذاتی مفاد ہی وہ جذبہ محرکہ ہے جس کے ماتحت انسان محنت و مشقت کرتا ہے اگر اس جذبہ کو نکال دیا جائے تو کوئی شخص جان مار کر محنت نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو پیش کیا جاتا ہے اور پھر روس کی مثال دے کر کہا جاتا ہے کہ دیکھ لیجئے! اس جذبہ کو نکال دینے سے ہشتر کی نظام کس طرح ناکام رہ گیا۔

یہ اعتراض کمیونزم کے فلسفہ حیات کے پیش نظر واقعی بڑا دقیق ہے اور جیسا کہ میں نے بھی اگلی بتایا ہے۔ روس کے ناکام تجربہ نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے انسان کے لئے کام کرنے کا جذبہ محرکہ کوئی نہیں رہتا۔ لیکن شترآن کریم کی آئیڈیالوجی کے مطابق اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ اور ذاتی مفاد ہی کام کے لئے جذبہ محرکہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ انسان بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر دیتا ہے۔ (مثلاً) انسان مال سے محبت رکھتا ہے اسے محنت سے کماتا اور بڑی احتیاط سے جمع کرتا ہے، لیکن جب وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اپنی جان بچانے کے لئے بے دریغ مال خرچ کر دیتا ہے (جو ایسا نہیں کرتا اس پر سب لعن طعن کرتے ہیں)۔ یہ اس لئے کہ اس کے نزدیک، اس کی جان کی قیمت مال کی قیمت سے زیادہ ہے۔ وہ زیادہ قیمتی متاع کو بچانے کی خاطر کم قیمت کی متاع صرف کر دیتا ہے۔

شترآنی آئیڈیالوجی کی رو سے مال کی بھی ایک قیمت ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمت انسانی ذات کی ہے۔ لہذا جب وہ اپنی ذات کے استحکام کی خاطر مال دوسروں کو دیتا ہے تو وہ اپنے بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر دیتا ہے اور اسے نفع کا سودا سمجھتا ہے۔ لہذا اس فلسفہ حیات کے مطابق انسان اپنے فائدے کو چھوڑتا نہیں بلکہ کم فائدے کو چھوڑ کر زیادہ فائدے کی طرف لپکتا ہے۔ اس لئے نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کا جواب کمیونزم کے فلسفہ حیات کی رو سے تو واقعی نہیں مل سکتا۔ لیکن شترآنی نظریہ زندگی کی رو سے اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ اور اس کا اعتراف تو خود اس نظام کے علمبردار بھی کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے عجیبے نصب اور ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں جنہوں نے بڑی محنت سے مال کمایا اور اسے نوع انسان کی سہو کی خاطر وقف کر دیا۔ دنیا میں آج تک کسی شخص یا کسی قوم نے کسی ابدی آدمی کی یادگار قائم نہیں کی جس نے

کر دروں روپے کئے لیکن اس دولت کو اپنے یا اپنی اولاد کے لئے مخصوص رکھا اور اسی حالت میں مر گیا۔
دنیل نے ایسے افراد پر ہمیشہ لعنت بھیجی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے بقا اور دوام کا اصول یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فِيمَا كَفُّوا فِي الْأَرْضِ (۱۳۱)

دنیا میں باقی رہتا ہے جو عالمگیر انسانیت کیلئے منفعت بخش ہو۔

دیگر اقوام میں اس قسم کے افراد مستثنیات میں سے ہوتے ہیں، قرآن کریم ہر مومن کو اسی خصوصیت کا حامل بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے جس کی ممبر شپ رکینیت کی اولین شرط وہ معاہدہ ہے جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے یعنی — إِنْ أَنْتُمْ اشْتَرَيْتُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآتٍ لَّهُمْ الْجَنَّةُ (۱۳۲) — وہ عہد کرتا ہے کہ میں نے اپنا مال حتیٰ کہ اپنی جان اس نظام کے ماتحتوں فروخت کر دی ہے جو نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہوا ہے۔ اس معاہدہ کے بعد ایک شخص، اسلامک سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے۔ اسے مسلمان کہتے ہیں لہذا مسلمان کی تو کوئی شے بھی ذاتی ملکیت کی نہیں ہوتی۔ وہ دن رات محنت کرتا ہے اور اس کے ماحصل کو اس نظام خداوندی کی تحویل میں دیدیتا ہے۔ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور عند الضرورت اپنی جان تک بھی اس مقصد عظیم کی خاطر قربان کر دیتا ہے — يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (۱۳۳) — وہ خدا کی راہ میں جنگ کرنے کی خاطر سر بکھ میدان میں نکل آتے ہیں پھر یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا میدان میں سر دیہتے ہیں۔ یوں وہ ایک بڑے فائدے کی خاطر کم فائدے کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ سوسائٹی جو دنیا میں اس معاشی نظام کو قائم کرتی ہے جس کی تباہی اس نے (قرآن کریم کی آیات کی رو سے) آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ اس قسم کا نظام، یہی سوسائٹی قائم کر سکتی ہے۔ اس سوسائٹی نے عہدِ محمدی رسول اللہ والذین معہ میں اس نظام کو قائم کر کے دکھادیا۔

اور یہی ہے وہ نظام جو دنیا میں آخر الامر قائم ہو کر رہے گا خواہ ملکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشواؤں کی قوتیں اس کے رستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیدا کریں قرآن کریم کو قیامت تک محفوظ ہی اس لئے رکھا گیا ہے کہ اسے نوع انسان کا عالمگیر ضابطہ حیات بنتا ہے۔ جس قوم نے بھی اسے اپنا ضابطہ حیات بنالیا، اس کے ماتحتوں یہ نظام قائم ہوگا۔

واضح رہے کہ قرآن کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی اسے استعمال نہیں کئے دیتا

جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں۔ اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے یوگوسلاویہ کے مشہور اشتراکی، ڈاکٹر جیلاس نے (جسے اسی اختلاف کی بنا پر دہاں کے اشتراکیوں نے قید کر دیا تھا) ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

تاریخ میں کسی ایسے مثالی معاشرہ کی مثال نہیں ملتی جو غیر مثالی اور غیر فطری طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، بالکل ایسے ہی جیسے غلاموں نے کبھی کوئی آزاد معاشرہ قائم نہیں کیا۔ نصب العین کی عظمت اور حقیقت کا اظہار صرف اس سے ہوتا ہے کہ اس کے حصول کے لئے طریقے کیا اختیار کئے گئے ہیں۔

آپ قرآن کریم پر غور کیجئے۔ وہ ”صحیح راستہ“ کا سراغ دیتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ ہدایت یعنی ”راہِ نمائی“ عطا کرتا ہے۔ وہ ”سبیل اللہ“ (خدا کی طرف لیجانے والے راستے) کو اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ کہ جس نے صحیح راستہ اختیار کر لیا وہ صحیح منزل تک ضرور پہنچ جائے گا۔ لیکن جب راستہ ہی غلط ہو تو پھر صحیح منزل کیسے سامنے آئے گی؟

یہ ہے عزیزانِ سن! میری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کا معاشی نظام۔

سوالات

و خطاب کے بعد سامعین کی طرف سے بعض نکات کی وضاحت کے لئے کچھ سوالات کئے گئے۔ ان میں سے دو ایک سوالات کے جواب تو اسی دفت میں دیئے گئے لیکن دفت کی کمی کی وجہ سے باقی دعوہ فردا پر رکھ دیئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل ہیں۔ ان سے نفسِ ممنون کے ضروری مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

پہلا سوال — اقوامِ مغرب

آپ نے کہا ہے کہ جس کی اس دنیا کی زندگی ذلت اور پستی کی ہوگی اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی کی ہوگی وہ عاقبت میں بھی سرخرو ہوگا۔ اقوام مغرب کی اس دنیا کی زندگی بڑی خوش حالی کی زندگی ہے۔ کیا وہ آخرت میں جنت میں جائیں گی؟

جواب

میرے عزیز! میں نے جو کچھ کہا ہے اور آپ نے اس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ میں کہتا ہوں کہ جو طالب علم اپنی کلاس (ATTEND) نہیں کرے گا وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس پر آپ کہتے ہیں کہ [اس کے یہ معنی ہوئے کہ] جو طالب علم کلاس میں حاضر رہے گا وہ امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ آپ نے غور کیا کہ آپ کا یہ نتیجہ کس قدر غلط ہے۔ جو طالب علم کلاس میں حاضر ہوگا اسے امتحان میں کامیابی کے لئے کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔ جو کچھ پڑھایا جائے اسے غور و فکر سے سننا اور سمجھنا۔ اسے یاد رکھنا۔ اس کے اظہار کی قابلیت پیدا کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جو طالب علم ان تمام شرائط کو پورا کرے گا وہ امتحان میں کامیاب ہوگا، نہ کہ وہ طالب علم جو کلاس میں حاضر تو رہے لیکن دیگر شرائط کو پورا نہ کرے۔

دین وہ پر دگر ارم دنیا ہے جس سے انسان کی اس دنیا کی زندگی کامیابی و کامرانی کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی سرفرازی و سرخروئی کی زندگی۔ اگر ایک فقرہ میں کہنا چاہیں تو اس کا پر دگر ارم یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے اس دنیا کی زندگی مرفہ الحالی کی زندگی ہو جاتی ہے۔ اور ان قوتوں کے ماحصل کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے سے عاقبت سنور جاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دنیا میں تین قسم کی قومیں ملیں گی۔

(۱) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرے۔ اس قوم کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشاں ہوگی اور عاقبت بھی تابندہ۔ اسے جامع مومنین کہا جاتا ہے۔

(۲) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر لے لیکن انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف نہ کرے۔ اس قوم کو اس دنیا میں مرفہ الحالی نصیب ہو جائے گی لیکن اس کی عاقبت تاریک رہے گی۔ اور

(۳) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اس کی اس دنیا کی زندگی پستی اور ذلت کی ہوگی۔ اور جب وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی۔ تو ان قوتوں کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے اس قوم کا آخرت کی زندگی میں کیا حصہ ہو سکتا ہے؟ یہ قوم کونسی ہے؟

اس کے متعلق آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی،

دوسرا سوال۔ مغرب کے خدا پرست

مغرب کی جمہوری تو میں خدا پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور روس اور چین کے کمیونسٹ خدا کے منکر و دھڑکے ہیں۔ آپ اسلام کے نقطہ نگاہ سے ان دونوں میں سے کسے ترجیح دیں گے۔

جواب

جہاں تک تشرانی نقطہ نگاہ سے خدا کو ماننے کا تعلق ہے، مغرب کے (مزعومہ) خدا پرست اور روس اور چین کے دھڑکے، دونوں ایک جیسے ہیں۔ تشران کریم کی رو سے خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس کی متعلقہ اقتدار اصول و احکام کو اپنے معاملات کے فیصلوں کا معیار اور حکم بنایا جائے۔ جواب یہ نہیں کرتا وہ اس کے نزدیک خدا پرست نہیں کا فر ہے۔ اس کا واضح اعلان ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۴۸)

جو کتاب اللہ کے مطابق زندگی کے معاملات کے فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ کافر ہیں۔

لہذا، قرآنی فلسفہ زندگی کے مطابق، مغرب کی قوموں اور روس و چین میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ جہاں تک ان کے معاشی نظام کا تعلق ہے، مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، قرآن کے معاشی نظام کی یکسر نقیض ہے اور تشران کی نظام تشران کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ اشتراکی نظام میں اگر (بقول اقبال) خدا شامل کر لیا جائے تو اسلامی نظام ہو سکتا ہے۔ لیکن مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں خدا کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔

یہ انسانیت کی قسمی تھی کہ کارل مارکس کے سامنے جو خدا آیا وہ مذہبی پیشوائیت کا تراشیدہ خدا تھا۔ اس خدا کا تصور واقعی نظام ملکیت و سرمایہ داری کا پیدا کردہ اور عوام کے لئے "افیون" تھا۔ وہ اس خدا سے انکار نہ کرتا تو کیا کرتا؟ اگر اس کے سامنے کہیں تشران کے پیش کردہ خدا کا تصور ہوتا تو وہ اسے اپنا ہادی و مرشد مانتا۔ مارکس زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ذرائع پیداوار ہر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ اور تشران کے خدا کا اعلان ہے کہ کائنات کی کسی شے پر کبھی کسی انسان کی

ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ سوچئے کہ اس خدا کو ملنے والے سے بڑا "کیلنٹ" اور کون ہو سکتا ہے۔ کارل مارکس درحقیقت اس مذہبی پیشوائیت کا انکار کرنا چاہتا تھا جس کے ہاتھوں انسانیت اس قدر زار و نالاں تھی۔ لیکن چونکہ مذہبی پیشوائیت اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ قرار دیتی تھی اس لئے اسے اس خدا بھی انکار کرنا پڑا۔ اس کے دل درومند کی یہی وہ ذہنی لغزش تھی جس کی بنا پر اقبال اسے کبھی "پہنیر بے جڑ" کہتا ہے اور کبھی "قلب اومومن و ماغش کا فر است" سے تعبیر کرتا ہے (جاوید نامہ صفحہ ۹۶)۔ کبھی اسے "کلیم بے تجلی" کہتا ہے اور کبھی "سج بے صلیب" اور — "نیت پیغیر و لیکن در بعل دار و کتاب" سے اس کے نظام کی تعریف اور اس کے فلسفہ کی تردید کرتا ہے۔ (ارمغان حجاز صفحہ ۳۱۹)۔ مغرب کی سرمایہ پر قوموں نے مارکس کی اس اجتہادی غلطی سے فائدہ اٹھایا اور دنیا کے خدا پرستوں اکٹھے ہو جاؤ "کے نعرے اشتراکیت کی مخالفت کے لئے ایک "مقدس متحدہ محاذ" قائم کر لیا اور اس کا ہر اول دستہ خود مسلمانوں کو بنایا۔ ان مسلمانوں کو جن کا دین، سرمایہ پرستی کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ یہ ہے مغرب کی وہ ایسی سیاست جو خدا کا نقاب اوڑھ کر وجہ فریب عالم بن رہی ہے اور بھولا بھالا ریلکیوں کہئے کہ خود فراموش مسلمان اس کا سب سے پہلا شکار ہو رہا ہے۔

تیسرا سوال — مسلمانوں کے ہاں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوتی

آپ نے کہا ہے کہ عہد نبی کریمؐ اور صحابہؓ میں قرآن کا یہ معاشی نظام قائم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی گاڑی اس پٹری سے ہٹ گئی اور سرمایہ دارانہ نظام ان کے ہاں ور آیا۔ یہ کیسے ہوا اور کب ہوا؟

جواب

یہ اس وقت ہوا جب مسلمانوں میں ملوکیت آگئی۔ واضح رہے کہ ملوکیت کے معنی وراثتی بادشاہت ہی نہیں۔ اسلام کی رو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی طرف سے قوانین مرتب کر کے ان کی اطاعت دوسروں سے کرائے۔ انسانوں کی اطاعت کے لئے قوانین ذاتِ خدا نے مقرر کر دی ہیں۔ حکومت اس ایجنسی کا نام ہے جو ان قوانین کو دنیا

میں نافذ کرتی ہے۔ اس کیجیسی کو "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملکیت اس انداز حکومت کو کہتے ہیں جس میں انسانوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اسلام نے ملکیت کو مٹایا اور اس کی جگہ خدا کی حکومت کو قائم کیا تھا۔ خدا کی حکومت میں نظام سرمایہ داری باقی نہیں پاسکتا۔ اسی لئے تو ابو جہل نے اپنے خداؤں کے ہاں فریاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔۔۔ خوب ہی دامن کہ سلمان مزدکی است۔۔۔ (جہادینامہ) جب سلمان میں ملکیت آگئی تو اس کا فطری نتیجہ سرمایہ داری اور جاگیر داری کا نظام تھا۔ ملکیت، عالمگیر انسانیت کے مفاد کا نہیں بلکہ ایک خاص گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتی ہے۔ لیکن اتنی جبری تبدیلی "خدائی سند" کے بغیر کیسے پیدا کی جاسکتی تھی؟۔ یہ خدائی سند مذہبی پیشوائیت نے اپنی خود تراشیدہ شریعت کی رو سے بہم پہنچادی۔ ملکیت سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اسی لئے تو قرآن کریم نے فرعون کے ساتھ قارن امہامان کو بھی ایک ہی صفت میں گھرا کیا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن ملکیت سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، اسلام کے اقنوم ثلاثہ بنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے جو آج اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے یہ نص صریح دولت جمع کرنے کو جہنم کا عذاب بتایا۔ رسول اللہ نے تمام عمر ایک پائی بھی جمع نہ کی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت حضور کو معلوم ہوا کہ گھر میں کہیں سے سات دینا آئے ہیں۔ "آپ نے انہیں ہی وقت بیت المال بھجوا دیا" یہ فرماتے ہوئے کہ میں خدا کے سامنے اس حالت میں نہیں جانا چاہتا کہ میرے گھر میں چاندی اور سونے کے ٹکڑے ہوں۔ یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا اور جس پر اس کے رسول نے عمل کر کے دکھایا۔ لیکن اب ان حضرات کی طرف سے جو اسلام پیش کیا جاتا ہے اس کا فیصلہ یہ ہے کہ

جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس کے تعلق رکھتے والے شرعی حقوق و واجبات

ادا کئے جاتے رہیں بلا حدود نہایت رکھی جاسکتی ہے۔ روپیہ۔ پیسہ۔ جانور۔ استعمالی اشیاء

مکانات۔ سواری۔ غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔

حالت اب یہ ہے کہ یہ حضرات اسے تو بہ شد و مد بیان کریں گے کہ پانچ سو گھنٹوں سے نیچے رکھنا خلافت ہے لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ گھر میں چاندی سونے کے سکتے جمع رکھنا خلافت حکم خداوندی اور خلافت

سنت رسول اللہ ہے۔ یہ اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ نکال دینے کے بعد باقی کروڑوں روپوں کو پاک اور صاف قرار دیدیں گے لیکن اسے کبھی نہیں بیان کریں گے کہ رسول اللہ نے ساری عمر زکوٰۃ ادا نہیں کی کیونکہ آپ نے کبھی روپیہ جمع ہی نہیں کیا تھا۔ یہ حضرات اس اہم مسئلہ پر تو گھنٹوں بحث کریں گے کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے حصہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ وہ یتیم ہے! لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ حضور نبی اکرمؐ نے خود کوئی ترکہ کیوں نہیں چھوڑا تھا اور جو شیلے مسئلہ چھوڑی تھیں اس کے متعلق یہ کیوں نہ فرمایا تھا کہ کسی کو وراثت میں نہیں مل سکتی۔ اس کے لئے یہ حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضورؐ نے نہ فرمایا تھا کہ ہم گروہ انبیاءؑ کا ترکہ وراثت میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔ گویا ان حضرات کے نزدیک حضرا انبیاءؑ کرام کے لئے اسلام کوئی اور ہوتا تھا اور ان کی اُمت کے لئے کوئی اور۔ (یا اللعجب!) یہ حضرات سرقہ چوری، کے نصاب کے متعلق تو پہروں گفتگو فرمائیں گے لیکن یہ نہیں بتائیں گے کہ حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو چوری کا مجرم کیوں قرار نہیں دیا تھا جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کی چیزوں کی چوری کی تھی اور ان کی جگہ ان کے مالک کو یہ کہہ کر سزا دی تھی کہ تم نے انہیں بھوکا کیوں رکھا جس کی وجہ سے یہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ اس لئے نہیں بتائیں گے کہ اس سے ان کے پیش کردہ معاشی نظام (سرمایہ داری) کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔

وہ تھا اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا اور جس پر اس کے رسولؐ اور حضورؑ کے متبعین نے عمل کر کے دکھایا۔ اور یہ ہے وہ اسلام جو ہمارے ددِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔

چوتھا سوال۔ ترکہ۔ صدقہ۔ زکوٰۃ کے احکام

لیکن قرآن مجید میں صدقہ۔ وراثت۔ زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھی تو ہیں۔ اگر روپیہ جمع نہیں کیا جاسکتا تو ان احکام کے معنی کیا ہوں گے۔

جواب

جس طرح اسلامی ملکیت کا قیام ایک دن میں عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ بتدریج عمل میں آتی تھی لہٰذا قرآن کریم میں بعض احکام کے متعلق یہ آیا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی ذات کے لئے مخصوص تھے جیسے حضورؐ کی ازواج مطہرات کے ساتھ کسی اور کا نکاح نہیں ہو سکتا تھا، لیکن معاشی نظام کے سلسلہ میں کوئی ایسا حکم نہیں ہے حضورؐ کی ذات کے لئے مخصوص کیا گیا ہو۔

اسی طرح، اس کا معاشی نظام بھی شباشب وجود میں نہیں آسکتا تھا۔ اسے بھی بتدریج ہی عمل میں لایا جاتا تھا۔ بسترآن کریم نے اسی تدریجی پروگرام کے مطابق اپنے احکام دیئے ہیں۔ صدقہ۔ وراثت وغیرہ احکام اُس دور سے متعلق ہیں جب یہ نظام ہنوز اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا تھا لیکن اسے بتدریج عمل میں لایا جا رہا تھا۔ ان احکام پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان کی رُو سے بھی ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا ہے جو بسترآنی نظام کا منہتی ہے۔ یعنی ان کی رُو سے دولت، افراد کے ہاں مرکوز رہنے کے بجائے معاشرہ میں بکھرتی جاتی ہے۔ عبوری دور میں یہ احکام نافذ العمل رہے تا آنکہ یہ نظام قائم ہو گیا جس میں یہ کہہ دیا گیا کہ۔ یَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (۲۱۹) یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لئے دیدیں ان سے کہہ دو کہ جس قدر ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ واضح رہے کہ رسول اپنی امت کو بتدریج اس منہتی کی طرف لاتا ہے لیکن اس کی اپنی زندگی شروع ہی سے اس آئینہ عمل (منہتی) کے مطابق ہوتی ہے تاکہ وہ لوگوں کے لئے نمونہ بنے۔ یہ وجہ ہے کہ حضورؐ نے ساری عمر نہ مال جمع کیا۔ نہ کوئی جائیداد بنائی۔ اور اس لئے نہ ہی کچھ ترکہ میں چھوڑا رنجیز چند مستغلاشیہ کے اور ان کے متعلق کہہ دیا کہ وہ وراثت میں تقسیم نہیں ہوں گی۔ حضورؐ کا یہ فیصلہ اپنی ذات (یا عرفہ انبیاء کریم) کے لئے نہیں تھا۔ یہ بسترآن کے پیش کردہ مثالی معاشرہ کا آئینہ دار تھا جس تک وہ سب کو بتدریج پہنچانا تھا۔

جب ملکیت آگئی تو اسلام کا معاشی نظام نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا اور یہ عبوری دور کے احکام مستقل احکام بنا دیئے گئے۔ اب یہی احکام ہماری شریعت ہیں۔ یعنی سفر بلا منزل۔



اساس محکم

(شائع شدہ ستمبر ۱۹۶۶ء)

کیونترزم اور اسلام سے متعلق عنوان میں ہم نے کہا یہ تھا کہ روس میں کیونترزم اس لئے ناکام ہو گئی ہے کہ ان کے پاس وہ اساس محکم نہیں جس پر یہ عمارت استوار کی گئی تھی۔ اور چونکہ چین کے ہاں بھی اس اساس کا فقدان ہے اس لئے وہاں بھی یہ کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس سلسلے میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ اساس محکم کیا ہے جس کی عدم موجودگی سے ان کا اس قدر انقلابی پروگرام کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ اور اسلام وہ کون سی اساس ہتیا کرتا ہے جس سے اس کا عالمگیر معاشی پروگرام کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور عمودی ہے۔ لیکن ہم نے اس عنوان میں اس کی وضاحت اس لئے نہیں کی تھی کہ اس موضوع پر طلوع اسلام میں بڑی شرح و بسط سے بہ اصرار و تکرار لکھا جا چکا ہے۔ پیرویز صاحب کے مقالات، خطبات اور تشریحات اور اس موضوع پر ان کی مستقل تصنیف ”نظام ربوبیت“ میں اس سوال کو بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ طلوع اسلام کے قارئین کا حلقہ دن بدن وسیع ہو رہا ہے اس لئے ان نو واردان کی طرف سے اس ستم کے استفسارات فطری اور لازمی ہیں۔ بنا بریں ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی جائے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مسئلہ زیر نظر ہے کیا؟ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کیونترزم محض ایک معاشی نظام کا نام ہے جسے کبھی سوشلزم اور کبھی کیونترزم کہا جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ مارکس نے ایک فلسفہ زندگی دیا تھا جس پر ایک معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ معاشی نظام اپنی ابتدائی

اسٹیج میں سوشلزم کہلاتا ہے اور اس کی انتہائی شکل کا نام کمیونزم ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم میں قدر مشترک یہ ہے کہ وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے ملکیت کی ملکیت میں رہتے ہیں جو مزدوروں اور کاشتکاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ سوشلزم میں ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور کام کا معادضہ دیا جاتا ہے۔

اور کمیونزم میں

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور اس کی ضروریات کے مطابق دیا جاتا ہے۔

جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے، اس میں بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کام کا معادضہ متعین کرنے کا معیار کیا ہے؟ سرمایہ دار ملکوں میں بھی مزدور کو اس کے کام کی اجرت ملتی ہے اور انجینئر کو اس کے کام کی اجرت۔ یہی کچھ سوشلزم میں ہو رہا ہے پھر سوشلزم میں جو کچھ کسی کی ضروریات سے زائد ہوتا ہے وہ اس کی ملکیت میں رہتا ہے۔ یہی کیفیت سرمایہ داری نظام میں ہوتی ہے۔ سوشلسٹ نظام میں البتہ اس فاصلہ دولت سے جائیدادیں نہیں کھڑی کی جاسکتیں، روزمرہ کی اشیائے مستعملہ خریدی جاسکتی ہیں۔ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کا اس کے خلاف اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کو جائیدادیں بنانے (یعنی وسائل پیداوار کو اپنی ملکیت میں لینے) کی اجازت نہ ہو تو اس کے لئے کام کرنے کا جواز یہ عسر کہ (INCENTIVE) نہیں رہتا۔ یہ اعتراض کمیونزم کے نظام میں اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں کام ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق لیا جاتا ہے، لیکن دیا جاتا ہے انہیں ان کی ضروریات کے بقدر۔ ظاہر ہے کہ۔ اس معاشرہ میں کام کرنے والا طبقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک وہ جن کے کام کا حاصل ان کی ضروریات سے زائد ہو۔ اور دوسرا وہ جن کی محنت کی پیداوار ان کی ضرورت پوری نہ کر سکیں۔

کمیونزم کے نظام کی رو سے، اول الذکر طبقہ کی زائد از ضروریات کمائی، ثانی الذکر طبقہ کی ضرورت پوری کرنے کے کام میں لائی جائے گی اور یوں معاشرہ کی ناہمواریاں دور کردی جائیں گی۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول طبقہ کے افراد میں سے جسے یہ معلوم ہو کہ وہ خواہ کتنا ہی کام کیوں نہ کرے اسے اس کی ضروریات سے زائد کچھ نہیں مل سکے گا۔ اور ثانی الذکر طبقہ کو اس کا علم ہو کہ وہ کتنی ہی کم محنت

کیوں نہ کریں، ان کی ضروریات بہر حال پوری ہوتی رہیں گی، تو وہ جذبہ محرکہ کیا ہوگا جس سے یہ سب جان مار کر پوری پوری محنت کریں گے۔ یہ ہے اہل سوال! یہ ہے وہ نقطہ، اس کے گرد اس نظام کی پوری مشینہ گردن کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جذبہ محرکہ اس فلسفہ حیات، اس نظریہ زندگی سے پیدا ہوتا ہے جس پر ان کو ایمان ہے۔ نظام سرمایہ داری میں نظریہ زندگی یہ ہے کہ تم جس قدر کمائی کرو وہ سب کی سب تمہاری ملکیت ہوگی۔ تمہیں اس سے غرض نہیں کہ معاشرہ میں دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ یہ نظریہ، وہ جذبہ محرکہ پیدا کرتا ہے جس سے ان زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور سب کچھ اپنے لئے رکھتا ہے۔ لیکن کمونزم کا نظام نصب العین یہ پیش کرتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو لیکن تمہیں ملے گا اتنا ہی جس سے تمہاری ضرورت پوری ہو سکیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو فلسفہ حیات وہ پیش کرتا ہے، وہ ان کے اندر یہ جذبہ پیدا کر سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اپنی ضروریات سے زائد سب کا سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدے؟

کمونزم کا فلسفہ حیات خالص مادی (MATERIALISTIC) ہے اس فلسفہ زندگی کا حاصل یہ ہے کہ ان کی زندگی، دیگر حیوانات کی طرح، محض طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ جس میں جذبات محرکہ محض حیوانی تعاضے (ANIMAL INSTINCTS) ہوتے ہیں۔ یہ تعاضے جیسا کہ ارباب علم و تحقیق کو معلوم ہے — (i) تحفظ خویش (SELF - PRESERVATION) اس مقصد کے لئے (ii) غلبہ خویش (SELF AGGRESSION) اور افزائش نسل (SELF REPRODUCTION) ہیں۔ ان میں، نہ تو کسی دوسرے کی ضروریات پورا کرنے کا تصور پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی تحفظ خویش کے لئے "جائز اور ناجائز" کی تمیز کا سوال ابھرتا ہے۔ بالفاظ دیگر، مادی نظریہ زندگی میں، بلند اقدار (HIGHER VALUES) کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس میں معاشرہ کا ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے، معاشرتی قوانین و ضوابط کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ چیز وہی ہے جسے حیوانات میں (HERD INSTINCT) کہا جاتا ہے یعنی جب ایک فرد محسوس کرتا ہے کہ گروہ کے ساتھ رہنے میں وہ زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے تو وہ گروہ کے عاید کردہ قواعد و ضوابط کی پابندی کرتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں نظریہ حیات مادی (MATERIALISTIC) کا رواج ہے جس کا نتیجہ

یہ ہے کہ یہ خطہٴ اخلاق انسانوں کی بستی نہیں، درندوں کا بھٹ بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت زمین پر بسنے والے انسان، حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جذبہٴ محرکہ احساس قومیت (NATIONALISM) ہے۔ یعنی (HERD INSTINCT)۔ بلند انسانی اقدار کا تصور کہیں نہیں۔ نظام سرمایہ داری، اس تصورِ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس فلسفہٴ حیات کے تابع کوئی دوسرا نظام بحکموں کا آہی نہیں سکتا۔

لیکن کمیونزم، اس نسیم کے خالص مادی نظریہٴ حیات کے تابع، وہ معاشی نظام متائم کرنا چاہتی ہے جس کی اس نظریہ کے اندر گنجائش ہی نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ مادی نظریہٴ حیات (یعنی حیوانی سطح زندگی) میں، دوسروں کی ضروریات کے احساس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ انسان، اپنا خون پسینہ ایک کر کے، زیادہ سے زیادہ کام کرے، اور اس کے حاصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورے کرنے کے لئے دیدے۔ یہ اجتماع منہین ہے۔ یہ جمع بین النقیضین ہے۔ یہ تصور (SELF CONTRADICTORY) ہے۔ یہ نارمولانا قابلِ عمل ہے۔ مادی نظریہٴ زندگی اس قابل ہی نہیں کہ انسان کو حیوانی سطح زندگی سے بلند لے جا کر اس کے سینے میں کسی بلند انسانی قدر کا احساس پیدا کر دے۔ لہذا، جب کمیونزم کے نظریہٴ حیات کی رُو سے بلند انسانی قدر پیدا ہی نہیں ہو سکتی تو وہ نظام جس کی قوت محرکہ بلند انسانی اقدار ہیں، چل کس طرح سکتا ہے۔

کمیونزم جو ہنگامی انقلاب لاتی ہے (اسے "انقلاب" کی بجائے انتشار کہنا زیادہ مناسب ہے) اس کا جذبہٴ محرکہ نفرت اور انتقام ہوتا ہے۔ یعنی وہ غریبوں اور محنت کشوں سے کہتی ہے کہ دیکھو، یہ سرمایہ دار تمہاری محنت کی کمائی کو کس طرح لوٹ کھسوٹ کر لئے جا رہے ہیں۔ تم اٹھو اور ان سے اپنی عصب شدہ دولت چھین لو۔ اس سے ان کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں اور وہ اٹھ کر ان سے اسباب پیداوار چھین لیتے ہیں۔ جب تک یہ طبقہ باقی رہتا ہے ان کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بھی ابھرتے رہتے ہیں۔ جب اس کا خاتمہ ہو کر کمیونزم کا اپنا نظام قائم ہو جاتا ہے تو یہ جذبات (نفرت و انتقام بھی) ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ابھی (سابقہ) مزدوروں اور محنت کشوں سے کہا جاتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو۔ لیکن اس میں سے تمہیں صرف بقدر تمہاری ضروریات کے ملے گا۔ اس سے زیادہ نہیں ملے گا۔ وہ

سوچتے ہیں کہ اس نظام میں 'اور نظام سرمایہ داری میں' فرق کیا ہے؟ نظام سرمایہ داری میں بھی ہم زیادہ سے زیادہ محنت کرتے تھے اور اس میں سے ہمیں بقدر اپنی ضروریات ہی کے ملا کرتا تھا بلکہ بعض اوقات اس سے کچھ زیادہ ہی مل جاتا تھا، اور اب بھی ہم سے یہی کہا جا رہا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ کہ اس انقلاب کی السابھون الاولون (PIONEERS) کی جماعت کے بعد وہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا جو اس انقلاب کو قائم رکھ سکے۔ اس سے ان کی اگلی نسل محبور ہو جاتی ہے کہ اس نظام سرمایہ داری سے سمجھوتہ کرے جو ان کے فلسفہ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ایک آدھ نسل محض پندار نفس کی بنیاد پر اس قسم کا سمجھوتہ کرتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی نظام سرمایہ داری قائم ہو جاتا ہے۔ مادی نظریہ حیات کے ماتحت اس نظام سے مختلف کوئی دوسرا نظام قائم رہ نہیں سکتا۔ آپ اس نظریہ حیات کے مدعی رہشتر کی، سے کہتے کہ آپ کہتے ہیں کہ میں جان مار کر محنت کروں اور اس میں سے پھر بقدر اپنی ضرورت کے رکھ کر باقی سب دوسروں کو دیدوں۔ میں ایسا کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ اس "کیوں" کا اس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہوگا۔ اسے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ ایسا کرنا انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے۔ لیکن ایسا کہنے سے اس نے کمیونزم کے نظریہ حیات کو خیر باد کہہ دیا۔ کمیونزم کا نظریہ حیات صرف طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کو تسلیم کرتا ہے، اور طبعی قوانین میں کسی سے ہمدردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا "ہمدردی" ایک انسانی جذبہ ہے، فطرت کا طبعی قانون نہیں۔ ایک بیوہ مال جس کے جوان بیٹے کے کپڑوں میں آگ لگ جائے وہ آگ کی ہزار منتیں کیے کرے کہ اس بچے کے مرجانے سے میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔ اسے موت جلاؤ۔ وہ آگ اس کی ایک نہیں سنے گی۔ اس کے سینے میں ہمدردی کی رن تک پیدا نہیں ہوگی۔ چارہ کھانے والا بیل بھوکے بیل کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ طبعی قانون کا فطری نتیجہ ہے۔ لیکن اگر کسی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا بھی ہو جائے، تو یہ فلسفہ زندگی نہیں بن سکتا۔ اس لئے اسے کسی مستقل انقلاب کی اساس قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آج دنیا میں جو انسانی ہمدردی اس طرح مفقود ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا میں مادی نظریہ حیات کا دور دورہ ہے۔ لہذا مادی نظریہ حیات کی قائل بلکہ پرستار، کمیونزم، انسانی ہمدردی کا واسطہ کس طرح دلا سکتی ہے؟ اور اگر وہ اس جذبہ کو اپیل بھی کرے تو یہ اس قدر عظیم انقلاب کی اساس کیسے بن سکتی ہے۔ انقلاب کی اساس سنی جذبات نہیں بن سکتے، کوئی حکم فلسفہ زندگی ہی بن سکتا ہے۔

کیونترزم کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ایمان رکھتی ہے مادی نظریہ حیات پر جس میں بلند انسانی اقدار کا تصور ہی ناپید ہوتا ہے اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے وہ جس کی بنیاد ہی بلند انسانی اقدار پر نہ سکتی ہیں یہ منکرے بودن و ہمزنگ متاں زیستن کی زندگی دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ یہ ہے مطلب ہمارے اس کہنے کا کہ کیونترزم کے پاس وہ اساس حکم نہیں جس پر اس کے اس قدر بلند آہنگ معاشی نظام کی سرفلک عمارت قائم ہو سکے۔



یہ اساس حکم، مترآن کریم بتا کر تا ہے۔ اس کا پیش کردہ تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی، حیوانات کی طرح محض طبعی زندگی نہیں۔ وہ طبعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی رکھتا ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY)۔ یا نفس (SELF)۔ یا خودی کہا جاتا ہے۔ انسان کا جسم تو طبعی قوانین کے تابع زندہ رہتا اور انہی کے مطابق ایک دن مردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ذات، نہ تو طبعی کے تابع ہوتی ہے، نہ ہی جسم کی موت سے فنا ہو جاتی ہے۔ یہ جسمانی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور اگر اس کی مناسب نشوونما ہو چکی ہو تو یہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو کر حیات جاوید حاصل کر سکتی ہے۔ انسانی جسم کی نشوونما، طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے، لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان بلند انسانی اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے، جو عقل انسانی کی پیداوار نہیں ہوتیں، بلکہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں ان کا حشرچہ خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے داخلی (SUBJECTIVE) نہیں ان اقدار (VALUES) میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ انسان جس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے، اسی قدر اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان اقدار پر ایمان، انسان کے اندر یہ جذبہ محرکہ بیدار کرتا ہے کہ وہ جان مار کر زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا چھوڑ دے، تاکہ اس کی اپنی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو سکے۔ ان اقدار پر ایمان وہ اساس حکم ہے جو اس قدر عظیم معاشی نظام کی بلند و بالا عمارت کا بوجھ برداشت کرنے کی تحمل ہو سکتی ہے۔

کیونترزم اپنے نظام کو دو مراحل میں سے گزارتی ہے۔ مرحلہ اول کو سوشلزم کہا جاتا ہے۔ اور مرحلہ دوم کو کیونترزم۔ پہلے مرحلہ میں اصول یہ ہوتا ہے کہ

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو اور کام کے مطابق معاوضہ دو۔

دوسرے مرحلہ میں اصول یہ کارسزا ہوتا ہے کہ

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو اور اس کی ضروریات کے مطابق لے دو۔

و ابھی اشتراکی مالک مرحلہ اول ہی سے گزر رہے ہیں۔ مرحلہ دوم تک ان میں سے کوئی نہیں پہنچا۔ اور ان کے نظام کی شکست و ریخت مرحلہ اول ہی میں ہونے لگ گئی ہے۔ اس مرحلہ کو قابل عمل بنانے کے لئے ضروری تھا کہ وسائل پیداوار ملکیت کی تحویل میں چلے جائیں۔ جذبہ محرکہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اسے بھی برداشت نہیں کر رہے کہ وسائل پیداوار ان کی ملکیت میں نہ رہیں (روس اس وقت اسی بحران سے دوچار ہے۔ اور جب مرحلہ اول ہی میں یہ حالت ہے تو یہ ظاہر ہے کہ مرحلہ دوم میں قدم تک رکھنا بھی اس نظام کی قسمت میں نہیں ہو سکتا۔)

قرآن کریم بھی اپنے معاشی نظام کی انتہائی منزل تک بتدریج لے جاتا ہے۔ اِنَّ اِفْهَمُّ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (۱۱۶)۔ اس کا بنیادی مسلک ہے۔ عدل کا تعلق مرحلہ اول سے ہے جس میں ہر ایک کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ لیکن پورا معاوضہ لے کر یہ لوگ (مومن) اس مال و دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ جاتے کیونکہ انہیں ساتھ ہی "فحشاء و المنکر" سے روکا گیا ہے۔ یعنی بخل اور عقل فریب کاری کی حیلہ جوہیوں سے جو انسان کو صرف مفاد خویش کا تحفظ سکھاتی ہے اس مرحلہ میں افراد معاشرہ دیگر ضرورت مندوں کی مدد کرنے کا کام انفرادی طور پر کرتے ہیں۔

اس ٹریننگ کے بعد قرآن کریم اس کاروان کو دوسری منزل میں لیجا رہا ہے جہاں یہ اجتماعی طور پر احسان پر کاربند ہوتے ہیں۔ احسان کے معنی ہیں دوسرے کی کمی کو پورا کر کے اس کے توازن کو برقرار رکھنا۔ یہاں ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۱۱۹)۔ یہ سچ سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات کے لئے کہاں تک کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ حق تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہو، سب کا سب، چونکہ ان کے اس عمل کی بنیاد ان کے اس ایمان پر ہوتی ہے کہ ہم جس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدیں گے اسی قدر ہماری اپنی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس لئے وہ اس حد سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ يُوْشِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَاَوْكَاۤنَ بِهِمْ مَّصَاصٰتُہُمْ (۱۲۰)۔ وہ خود تنگی میں گداز

کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور چونکہ وہ یہ سب اشیاء اپنی ذات کی نشوونما کے لئے کہتے ہیں، اس لئے وہ جن کی مدد کرتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ۔ لَا تُزِيدُنِي مِنْكُمْ حَرْفًا وَلَا تُكُفِّرُونَّ ۱۔ (۲۴) ہم تم سے اس کا کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ واضح رہے کہ یہ ذہنیت اور اندازِ زیست جماعتِ مومنین کے مستثنیٰ افراد (EXCEPTIONAL INDIVIDUALS) کا نہیں بلکہ اس پوری کی پوری جماعت کا ہوتا ہے، جس کے ہاتھوں یہ انقلاب رونما اور یہ نظام متشکل ہوتا ہے قرآن کریم کی رو سے ہر مومن کا اندازِ نگاہ اور ہنج زندگی یہی ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک جو شخص مسلمان ہونا چاہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرے۔ یعنی اس معاہدہ پر جس میں کہا گیا ہے

إِنَّا اللَّهُ اشْتَرَيْنَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآتٍ لَهُمُ الْجَنَّةِ۔ (۹)

یہ مسلمان ہونے والا فرد، معاہدہ کرتا ہے کہ میں نے اپنا جان اور مال بیچ دیا ہے اور اس کے بدلے میں جنت خرید لی ہے۔ ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے وہ جماعتِ مومنین، جو اس نظام کو قائم کرتی ہے۔ یہ نظام اس قسم کے افراد کے علاوہ، اور کسی کے ہاتھوں قائم نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کے لئے جس جذبہ محرک کی ضرورت ہے وہ اس ایمان کے علاوہ اور کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس معاہدہ کی رو سے ذاتی ملکیت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔

﴿تِلْكَ﴾

تفصیلات بالا سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آگئیں۔

(۱) مادی نظریہ حیات کا لازمی نتیجہ، نظامِ سرمایہ داری ہے۔ جو معاشرہ اس نظریہ حیات کا حامل ہوگا اس میں سرمایہ داری کے علاوہ کوئی دوسرا نظام چل نہیں سکتا۔ کیونکہ سرمایہ داری کی بنیاد پر یہ ہے کہ یہ نظریہ حیات تو رکھتی ہے مادی، اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے ایسا جو سرمایہ داری کے نظام کی ضد ہے۔ یہ اجتماعِ ضدین ناممکن ہے۔

(۲) قرآن کریم مادی نظریہ حیات کا مخالف ہے۔ اس لئے یہ نظام سرمایہ داری کا بھی مخالف ہے جس نظریہ زندگی کا پیا مبر ہے، اس کی رو سے ہر فرد، دوسروں کی ضروریات پورا

کرنے میں خود اپنی ذات کا فائدہ دیکھتا ہے۔ اس لئے اس قسم کا معاشی نظام صرف اس ایمان کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔

کیونکہ ہم کے پروگرام میں صرف حصہ لانا ہوتا ہے۔ یعنی ملکیت۔ نظام سرمایہ داری۔ مذہبی پیشوا کو مٹانا۔ انہیں مٹانے کے بعد وہ سمجھ لیتی ہے کہ بس اب میدان مار لیا۔ اب ہمارا نظام خود بخود قائم ہو جائے گا۔ لیکن کوئی نظام، خود بخود قائم نہیں ہوا کرتا۔ نظام کے قیام کے لئے، مخالفتوں کو مٹانا، بیشک ضروری ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد ایک مثبت اساس کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس پر اس جدید نظام کی عمارت استوار کی جاسکے۔ قرآن کریم نے لا اِلهَ اِلَّا اللهُ کے عظیم انقلابی فارمولے سے ایک مکمل پروگرام عطا کیا ہے۔ دیکھئے۔ وہ اِلهَ کی منزل سر کر لینے کے بعد کہ جب تمام مخالفتوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے کس طرح اس حقیقت کو اجاگر کر کے سامنے لاتا ہے کہ اس سے تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ بس اب کرنے کا کام ختم ہوا۔ اب اس فتح و کامرانی کے ثمرات کو اطمینان سے بیٹھ کر کھاؤ۔ وہ کہتا ہے کہ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ وَ رَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا۔ جب فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے۔ جب مخالفتیں سب سرنگوں ہو جائیں۔ جب لوگ فوج ورنوج، تمہارے نظام میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔ تو اس وقت یہ نہ سمجھ لو کہ تمہارا پروگرام مکمل ہو گیا۔ تم نے کامیابی حاصل کر لی۔ بالکل نہیں اس کے بعد تمہارے پیروگرام کا نیا مرحلہ شروع ہو گا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُ۔ اس کے بعد تمہیں اس نظام کے مستحق حمد و ستائش بنانے کے لئے اور بھی زیادہ سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ اور قدم قدم پر اپنی حفاظت کا سامان طلب کرتے رہنا ہو گا۔ اِنَّكَ كَانَ تَوَّابًا (۱۳۱)۔ یہ ہے وہ طریق کار جس سے خدا تمہاری طرف لوٹ کر آئے گا۔ حصہ لاسے تم نے اس کے آنے کے لئے صرف راستہ صاف کیا ہے اسے لائے کے لئے ابھی بہت کچھ اور کرنا ہو گا۔

دوسری جگہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جس بوجھ نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی وہ بوجھ اٹھ گیا ہے۔ مشکلات کے بعد آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تمہارا پروگرام بھی ختم ہو گیا ہے۔ بالکل نہیں۔ فَاِذَا حَرَغْتَ فَاَنْصَبْ۔ جب تو اس حصہ لاسے فارغ ہو گیا ہے، تو پروگرام کے دوسرے حصے کی تکمیل کے لئے جم کر کھڑا ہو جا۔ اور وہ پروگرام یہ ہے کہ اِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ۔ (۱۳۲)۔ اپنی تمام توجہات، خدا کے نظام ربوبیت کے متشکل اور مستحکم کرنے پر

مركز کرنے۔ یہ ہے اَللّٰہ کا مرحلہ، یعنی مخالفتوں کے ہجوم سے فارغ ہو جانے کے بعد ”خدا کی طرف متوجہ ہو جانے“ کا پروگرام۔!

یہ ہے وہ پیغام جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ اگر اسے چین کے ارباب حل و عقد اور کمیونزم کے ارباب فکر و نظر تک پہنچا دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس پر غور کر کے اپنے نظام کو انسانیت کی ان بلند اقدار پر تشکل کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں جس سے نوع انسان اس عذاب سے محفوظ رہ سکے جو ان کے موجودہ نظام کی ناکامی کے بعد اس پر مسلط ہونے والا ہے اس لئے کہ اس کے بعد نظام سرِ پایہ داری پورے جذبہ انتقام کے ساتھ ابھرے گا اور جن جن رہستوں سے اس نے دیکھا تھا کہ اس کی مخالفت تو انوں نے سر نکالا تھا انہیں اس طرح بند کرے گا کہ اُدھر سے دوبارہ داخل ہونے کا کسی کو یارا نہ رہے۔

کہا جائے گا کہ جو اساس، قرآن کریم تجویز کرتا ہے اس کے لئے مادلئے عقل انسانی سرچشمہ علم (وحی) پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ اور کمیونزم کے حامی کسی ایسے ذریعہ علم کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اس لئے وہ کس طرح وحی کی عطا کردہ اقدار کے تصور کو قابل اعتبار قرار دیں گے۔؟ یہ اعتراض بظاہر بڑا دزنی نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کے حامی ہی نہیں بلکہ مادی نظریہ حیات کے ماننے والے سب کے ب خارج از عقل انسانی سرچشمہ قوانین پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ قوانین فطرت کو مانتے ہیں اور ان قوانین کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نہ تو عقل انسانی کے پیدا کردہ ہیں اور نہ ہی عقل انسانی ان کی کوئی توجیہ پیش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ تاؤن کہ پانی اتنے درجہ حرارت پر پہنچ کر کھولنے لگ جاتا ہے، عقل انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ اور نہ ہی انسانی عقل یہ بتا سکتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود، مادی نظریہ حیات کے قائلین ان قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ نظریہ قائم ہی اس بنیاد پر ہے کہ فطرت کے قوانین اہل ہیں اور عقل انسانی کے پیدا کردہ نہیں۔!

اور کمیونزم کے حامی تو صرف فطرت کے طبیعی قوانین ہی کو خارجی (OBJECTIVE) نہیں جانتے، وہ اپنے معاشی نظام کے اصولوں کو بھی خارجی تسلیم کرتے ہیں۔ مگر کس کا نظریہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) عقل انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ اس کا وجود خارجی ہے!

اسی بنا پر مائوزے تنگ نے کہا ہے کہ

طبقاتی جنگ ایک خارجی حقیقت ہے جس کا مدار لوگوں کے چاہنے یا نہ چاہنے پر نہیں۔

ریکنگ ریویو - مورخہ ۱۹۶۱ء - صفحہ ۱۰

اور اس پر اس اخبار کا مدیر اپنے مقالہ افتتاحیہ میں تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ
کہ یہ امر بالکل معمول کے مطابق اور حرجی قوانین (OBJECTIVE LAWS) کے
موافق ہے کہ (ایسا ہو)

اب ظاہر ہے کہ جو لوگ (OBJECTIVE LAWS) کے قائل ہوں انہیں یہ سمجھانا ممکن
نہیں ہو سکتا کہ بلند اقدار انسانیت، خارج سے ملتی ہیں (اسی کو وحی کہا جاتا ہے) ان لوگوں نے وحی کا
انکار اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان کے نزدیک مادرائے عقل انسانی کسی سرچشمہ قوانین کا ماننا عقلاً ناممکن
تھا۔ انہوں نے اس سے اس لئے انکار کیا تھا کہ ان کے سامنے جو کچھ وحی کہہ کر پیش کیا جاتا تھا (یعنی عیسائیت
کے عقائد) انہیں ان کی عقل صحیح تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ اگر وحی کی تعلیم یہی ہے
تو یہ وحی تمہیں مبارک۔ ہم اسے تسلیم کرنے سے باز آئے۔ اگر ان کے سامنے وہ وحی پیش کی جائے جس
نے معاشی نظام تو اسی قسم کا پیش کیا ہے جس قسم کا نظام کمیونٹزم کا مستقبل نگاہ ہے اور اس کے لئے
بنیاد دینی مہیا کی ہے جس کا کمیونٹزم میں فقدان ہے۔ اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک میری بات عقل و
فکر کی رُو سے سمجھی نہ جائے، اسے مت قبول کرو، ہو نہیں سکتا کہ وہ اسے درخور اعتناء نہ سمجھیں۔



کہا یہ جائے گا۔ (اور یہ اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے) کہ اگر قرآن کریم نے اس قسم کا معاشی نظام
دیا تھا، اور اس کے لئے ایسی اساس محکم بھی مہیا کر دی تھی تو وہ نظام (بھڑکے سے عرصہ کے بعد) آگے کیوں
نہ چلا؟ یہ اعتراض بڑا سطح بینی پر مبنی ہے۔ ایک ڈاکٹر کسی مریض کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے، وہ اُسے
چند دنوں تک استعمال کرتا ہے۔ اسے اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس کا استعمال چھوڑ
دیتا ہے اور اس طرح اس کا مرض دور نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔ تو اس کے بعد کیا آپ کہیں گے
کہ اگر وہ نسخہ واقعی شفا بخش تھا تو اس سے اس مریض کا مرض دور کیوں نہ ہوا؟

اگر وہ اس نسخہ کو متواتر استعمال کرتا رہتا اور اس کے باوجود مرض دور نہ ہوتا، تو ہم کہہ سکتے تھے
کہ اس نسخہ میں شفا بخشی کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن اسے ترک کر دینے کے بعد تو اس پر یہ اعتراض وارد
نہیں کیا جاسکتا۔ وہ نسخہ آج بھی موجود ہے اور اس کا دھوئے ہے کہ اس میں آج بھی اس کی صلاحیت

کہ وہ اس مرض کو دور کرنے۔ اس کے دعوے کے کذب و صداقت کو پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ اسے تنہا کر کے دیکھا جائے۔

اور ہم چین کے اربابِ بسنت و کشاد تنگ یہ پیغام اس لئے پہنچانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اس منزل کا آدھا سفر طے کر لیا ہوا ہے۔ یعنی وہ اس کے حصّہ لاپر عمل پیرا ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے منزل مقصود پہنچنا دوسروں کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ ان تک اگر یہ آواز پہنچا دی جائے، تو چہ عجب کہ اقبال نے جو کہا تھا کہ ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صغم خانوں سے

وہ حقیقت دنیا کے سامنے ایک بار پھر آجائے۔

چینی عوام کے سامنے اس وقت جذبہ محرک صرف مائزے تنگ کی شخصیت ہے۔ وہ اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کی خاطر سب کچھ لٹا دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی صبر آزما قربانی کے لئے محض ہیں آمادہ رہتے ہیں کہ اس سے مائزہ خوش ہوگا۔ ان کی تمام توجہات کا نقطہ ماسکہ، ان کی سعی و عمل کا مرکز، ان کی تباہ و بربادیت کا محور، مائزہ کی ذات ہے۔ لیکن مائزہ تو بہر حال ایک فانی انسان ہے۔ اس نے زود یا دیر مرجانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد چین کے پاس جذبہ محرک کیا ہوگا؟ جو لوگ چین سے ہو کر آتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ چین کے اربابِ حل و عقد کو خود اس امر کا احساس ہے اور وہ اس مشکل ترین سوال کا حل دریافت کرنے کے لئے سب سے حد متفکر اور مشوش ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس مشکل کا حل انہیں مل نہیں سکتا۔ شخصیتیں بہر حال آنے جانے والی ہوتی ہیں۔ جو نظام شخصیات کے سہارے قائم ہوگا وہ ناپائیدار ہوگا۔ پائیدگی تو نظریہ حیات اور فلسفہ زندگی ہی کے لئے ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس میں زمین کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور یہ نظریہ حیات کیونترم کے ہاں ہے نہیں۔ اس لئے چین کے اربابِ فکر و نظر کی ہزار تمنائوں اور صد ہزار کاوشوں کے باوجود، انہیں اس مشکل کا حل مل نہیں سکتا۔ یہ سوال خود قرآن کریم کے بھی پیش نظر تھا جس کا حل اس نے یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ یاد رکھو:-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ - قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَآثِنُ

مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْفُتِلَبْتُمْ عَلَىٰ آعْقَابِكُمْ (پہلے)۔

محمد مجزایں نیست، اللہ کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول آئے اور اپنے

فرانض سر انجام دے کر دنیا سے) چلے گئے تو کیا یہ اگر کل کو دفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم یہ سمجھ کر کہ یہ نظام اس کی ذات سے وابستہ تھا، اس لئے اس کی دفات سے ختم ہو گیا پھر اپنے نظام کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے؟

اور یہی کتنی وہ حقیقت کبریٰ جس کا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس وقت اعلان کیا جب نبی اکرمؐ کی دفات سے بعض قلوب میں یہ خیال ابھر کہ اب کیا ہوگا؟ اس خیال کو رفع کرنے کے لئے جناب صدیق اکبرؓ نے ممبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اے جماعت مومنین! اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تم میں سے جو شخص محتسب کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا اس کا معبود واقعی دفات پا گیا ہے۔ لیکن جو خدا کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا، اس کو جان لینا چاہیے کہ اس کا معبود زندہ و پایندہ ہے۔ اس اعلان عظیم سے آپ نے شخصیات اور نظریہ زندگی کے فرق کو نمایاں کر کے بتا دیا اور اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اسلام خدا کے عطا کردہ اس نظریہ زندگی کا نام ہے جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا۔ اس کی بقا شخصیتوں سے وابستہ نہیں۔ اس لئے شخصیتیں آتی اور جاتی ہوتی ہیں۔ خدا کا عطا کردہ نظریہ حیات زندہ و پایندہ ہے۔ یہ نظریہ حیات آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس پر جب بھی عمل کیا جائے گا۔ یہ اپنے نتائج سامنے لے آئے گا۔ برعکس اس کے، چین کا موجودہ نظام مائوزے تنگ کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس کی بنیاد کسی ایسے فلسفہ حیات پر نہیں جو مائوزیاؤن کے دیگر زعماء کی دفات کے بعد بھی باقی رہے۔ برعکس اس کے۔ ان کا فلسفہ حیات وہ ہے جس پر اس نظام کی عمارت قائم رہ نہیں سکتی۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کے پیش نظر ہم نے کہا ہے کہ اگر آج کوئی شخص، چین کے ارباب فکر و نظر کے سامنے قرآن کریم کا فلسفہ حیات پیش کر کے، ان پر اس کی اہمیت واضح کر دے، تو وہ نوع انسان کا بہت بڑا محسن ہوگا۔

لہٰذا ہم نے اس مقالہ میں اس نکتہ سے بحث نہیں کی کیسی گیل کے فلسفہ میں، جس پر مارکس کے تخیل کی عمارت استوار ہوتی ہے، ثبات (PERMANENCE) کا تصور ہی نہیں۔ اس کی بنیاد تغیر (CHANGE) پر ہے اس لئے اس کی رُو سے مستقل اقدار کا تصور ہی غلط ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کا فلسفہ حیات، مستقل اور غیر متبدل اقدار کا حامل ہے، جو شخصیات سے وابستہ ہیں، نہ تاریخی وجوہ کے بدل جانے سے قابل تغیر۔ اس نکتہ کی وضاحت اس مقالہ میں کی گئی ہے جس کا عنوان ہے۔ ”مائوزے تنگ اور شران۔“

ماؤنٹے تنگ

اور شران

(پرویز)

اسلام ایک دین ہے۔ دین کے معنی ہیں ایسا نظام زندگی جس کی بنیاد کسی فلسفہ حیات (IDEOLOGY) پر ہو۔ وہ کوئی مذہب (RELIGION) نہیں۔ مذہب کا تعلق نظام زندگی سے ہوتا ہی نہیں۔ وہ دنیاوی کاروبار سے الگ تھلگ رہنا سکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے کسی نظام حیات کے جنم نہیں دیا۔ یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ مذاہب ہیں جو انسان کو ملکتی یا نجات کے طور پر ہی سکھاتے ہیں۔ کوئی نظام زندگی عطا نہیں کرتے۔ دوسری طرف، اسلام کے علاوہ کوئی نظام زندگی ایسا نہیں جس کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہو۔ اسلام کے بعد، کیونززم ایک ایسا نظام زندگی ہے جو ایک فلسفہ حیات پر متفرع ہے۔ بالفاظ دیگر، صرف کیونززم ایک "دین" کی حیثیت سے اسلام کے مد مقابل آیا ہے۔ اس لئے اسلام کو ایک دین ماننے والوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کیونززم کا ہر نقطہ نگاہ سے مطالعہ کریں۔ اور پھر دیکھیں کہ ان میں سے کون سا نظام زندگی ایسا ہے جو انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اور اس میں باقی رہنے اور آگے چلنے کی صلاحیت ہے۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں نے بالعموم اسلام کو ایک مذہب سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے وہ اس کا مقابلہ مذاہبِ عالم سے

کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف، کمیونسٹوں کو بھی بالعموم اتنا ہی معلوم ہے کہ کمیونزم ایک معاشی نظام کا نام ہے۔ حالانکہ (جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہلایا ہے) یہ ایک نظام زندگی ہے جو ایک خاص فلسفہ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے عصر حاضر میں 'انسانی ہیئت اجتماعیہ کے مستقبل کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اسلام اور کمیونزم کا تقابلی مطالعہ ناگزیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں اس سے زیادہ اہم موضوع کوئی ہے ہی نہیں۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکا ہوں کہ

(۱) ایک چیز ہے کمیونزم کا فلسفہ حیات اور دوسری چیز ہے اس کا معاشی نظام جسے وہ اس فلسفہ حیات کی بنیادوں پر استوار کرنے کا مدعی ہے۔

(۲) جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے وہ قرآن کریم کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مثال ہے لیکن کمیونزم کا فلسفہ زندگی اور قرآن کا فلسفہ حیات ایک حد تک ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود اصل و بنیاد کی رعیت ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

(۳) کمیونزم کا فلسفہ حیات بنیادی طور پر اس قدر کمزور ہے کہ اس کے پیش کردہ معاشی نظام کی عمارت اس کی بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے برعکس،

(۴) اس معاشی نظام کی عمارت صرف اس فلسفہ حیات پر قائم ہو سکتی اور برقرار رہ سکتی ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔

میں نے متعدد مقامات پر ان ہر دو فلسفہ ہائے زندگی کے اصولی خطوط کو سامنے لا کر بتایا ہے کہ کیسے طرح باہم متضاد ہیں لیکن عصر حاضر کے اس اہم ترین مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب کا تقاضا ہے کہ تفصیل سے بتایا جائے کہ یہ دونوں فلسفے کیا ہیں، کس حد تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور کہاں سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ احباب کے اس تقاضے سے قطع نظر مجھے خود اس کا احساس ہے کہ یہ موضوع نفسی گفتگو کا محتاج و مستحق ہے۔ لیکن اس قدر پیچیدہ فلسفیانہ بحث کو عام فہم انداز میں پیش کرنے اور اسے ایک مقالہ میں سمٹانے کی دقت میری عنایاں گیر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے مباحث کے لئے موزوں یہی ہوتا ہے کہ یا تو اسے متعدد خطبات کی شکل میں درسا درسا سامنے لایا جائے اور یا انہیں مبسوط تصنیف کی صورت میں پیش کیا جائے۔ لیکن چونکہ ان باتوں کا سر دست امکان نہیں اس لئے میں نے (بحالات موجودہ) یہی مناسب سمجھا ہے کہ اسے مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش

کردوں اور تفصیل کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

کمیونزم کا فلسفہ

کمیونزم کے فلسفہ حیات کی ابتداء ہیگل سے کرنی چاہیئے اور پھر مارکس اور لینن کو ساتھ لیتے ہوئے ماؤزے تنگ تک پہنچ جانا چاہیئے۔ لیکن یہ راستہ طول طویل بھی ہے اور (نئی اعتبار سے) دشوار گزار بھی۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہیگل اور مارکس کے تصورات کے متعلق سرسری اشارات پر اکتفا کیا جائے اور ماؤزے تنگ کے تصور کو تفصیل سے پیش کیا جائے، بالخصوص اس لئے کہ وہی اس دور میں اس فلسفہ کا عظیم علمبردار اس کے پیدا کردہ انقلاب کا قائم اور اس کی بنیادوں پر اتوار معاشی نظام کا سب سے بڑا مدعی و مہمار ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ نہ کہ وہ عمل کے امتزاج کی رُود سے دیکھا جائے تو اس وقت دنیا میں اس کا ہمسر کہیں نظر نہیں آئے گا۔

ہیگل نے کہا کہ دنیا میں ایک تصور (IDEA) وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اس میں سے اس کی ضد ایک اور تصور پھوٹتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح پروان چڑھتا ہے، تو پھر ایک تیسرا تصور ایسا پیدا ہوتا ہے جو ان دونوں باہم گرتے متضاد تصورات کی صفات کو لئے ہوئے اکھڑتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ تصورات آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روح عصر (SPIRIT OF THE AGE) اس عمل پیمن کی محرک ہوتی ہے۔

مارکس اسی سکتب فکر سے متعلق تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ یہ تضاد و تفرق تصورات میں نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے معاشی نظام میں ہوتا رہتا ہے اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) اس کی قوت محرکہ ہے۔

ماؤزے تنگ بھی اصولی طور پر اسی فلسفہ امتداد کا مؤید ہے۔ لیکن وہ ہیگل (بلکہ مارکس سے بھی ایک حد تک) اختلاف رکھتا ہے۔ اس کا فلسفہ اس کے مجموعہ تحریرات (WORKS) میں مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے، اور اس کی اہل و بنیاد قانون امتداد (LAW OF CONTRADICTION) ہے اس کے جنسل کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) کائنات کی نشوونما کے سلسلہ میں، شروع ہی سے دو تصورات شانہ بشانہ چلے آتے نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ایک تصور وہ ہے جسے عام طور پر مادہ و ارا الطبعیاتی (METAPHYSICAL) کہا جاتا ہے اور دوسرے کو مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) مادہ و ارا الطبعیاتی فلسفہ کی رُود سے سمجھایا جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک مستقل وجود رکھتی ہے وہ دیگر اشیائے کائنات سے بالکل لائق اور الگ تھلگ ہوتی ہے اور شروع سے آخر تک وہی شے رہتی ہے۔ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ کچھ اور بن ہی نہیں سکتی۔ خارجی عناصر اس پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس سے اس کے صرف مظاہر میں تبدیلی آتی ہے، اس کی اہل دنیا میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یعنی اس کی تبدیلی کیفیت کی (QUANTITATIVE) ہوتی ہے۔ کیفیت کی (QUALITATIVE) نہیں ہوتی۔ جن اشیاء میں کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہ اپنے جیسی چیز ہی پیدا کر سکتی ہیں۔ جیسے آم کی جھٹھی سے آم پیدا ہو جاتا ہے اور بکری کا بچہ، آخر کار بکری بن سکتا ہے، کچھ اور نہیں۔ اسی سلسلہ میں نظریہ ارتقاء کے حاملین (یعنی ڈارون کے متبعین) بھی اتنا ہی بتا سکے ہیں، کہ ارتقاء کی رُود سے، اشیائے کائنات کی شکل و صورت ہی میں فرق پیدا ہوتا ہے، ان کی ذات (ESSENCE) دیسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہذا کائنات میں تخلیق کا عمل، گردشِ دولابی (REPETITION) سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی اصول، اشیائے کائنات میں کارفرما ہے اور یہی قانون، انسانی فکر و تصورات کی دنیا میں۔ اس کے اعتبار سے تبدیلی نہ ان میں ہوتی ہے نہ ان میں۔

(۳) اس کے برعکس، جدلیاتی فلسفہ کی رُود سے کائنات کی نشوونما کا تصور یہ ہے کہ

(ا) کائنات کی ہر شے کے اندر شروع سے آخر تک، ہمیشہ دو متضاد عناصر موجود ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کے اس باہمی تضاد یا ٹکراؤ کی جہت سے اس فلسفہ کو جدلیاتی (DIALECTIC) کہا جاتا ہے۔

(ب) ان متضاد عناصر میں سے ایک وقت میں ایک عنصر غالب رہتا ہے۔ اسے (PRINCIPAL) کہا جاتا ہے اور دوسرا مغلوب جسے (SECONDARY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے ایک کا پورا بھاری رہتا ہے اور دوسرے کا ہلکا۔ بھاری یا غالب عنصر کی جو کیفیات ہوں، ان کی نسبت سے دوسرے متعارف ہوتی ہے۔

(ج) باہمی تضاد سے، کچھ وقت کے بعد، مغلوب عنصر غالب ہو جاتا ہے اور غالب عنصر، مغلوب اور چونکہ ہر شے کا تشخص، غالب عنصر کی نسبت سے متعین ہوتا ہے اس لئے اس تبدیلی سے وہ شے خود ایک دوسری شے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مشکل صورت کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اہل دنیا کی رو سے بھی بالکل جدید شے۔ اس قانون کو وحدت تضادات (UNITY OF OPPOSITES) سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو مادّے تنگ کے نزدیک عالمگیر اور بنیادی قانون کائنات ہے۔

اس مقام پر ایک ایسا ہے جس کی وضاحت، مادّے تنگ کی تحریروں میں مجھے نہیں مل سکی۔ بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ اس طریق میں غالب عنصر، مغلوب ہو جاتا ہے اور مغلوب، غالب آ جاتا ہے۔ یعنی دونوں عناصر موجود تو رہتے ہیں، صرف ان کی پوزیشن بدل جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بات یوں نظر آتی ہے کہ یہ تضاد عناصر شروع سے آخر تک اس شے میں موجود رہتے ہیں۔ اگر عنصر (الف) غالب ہو تا ہے تو وہ شے (الف) بن جاتی ہے اور جب عنصر (ب) غالب آ جاتا ہے تو وہ شے (ب) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ گردشِ دولابی (CYCLIC PROCESS) اسی طرح جاری رہتا ہے اور اس طرح وہ شے (الف) یا (ب) بنتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں بن سکتی۔

لیکن بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ غالب عنصر آہستہ آہستہ کمزور ہو کر مغلوب عنصر میں تبدیل یا مدغم ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس نے کئی جگہ اسے اس کی موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس طرح اس شے میں ایک نیا عنصر وجود میں آ جاتا ہے جس کی حیثیت عنصر غالب کی ہوتی ہے اور اس کے متقابل ایک نیا مغلوب عنصر وجود میں آ جاتا ہے۔ یوں وہ شے (الف) اور (ب) میں ہی تبدیل نہیں ہوتی رہتی بلکہ وہ ارتعائی طور پر کچھ اور بن جاتی ہے جو پہلی شے سے ارتع ہوتی ہے۔ اسے تضادات میں توافق کہا جاتا ہے۔

(د) اس عمل تغیر کی رو سے ایک شے، ایک ہی وقت میں، وہ شے بھی ہوتی ہے اور کچھ اور شے بن بھی رہی ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، اشیائے کائنات، ہمیشہ وجود کو شے (BECOMING) کے مرحلہ میں رہتی ہیں، انیت (BEING) کے مقام تک کبھی نہیں پہنچتیں۔

(ه) ایک شے کے اندر دونوں متضاد عناصر ایک دوسرے کی ضد (OPPOSITE) ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کے وجود کا سبب (COMPLEMENTARY) بھی ہوتے ہیں۔ یعنی اگر ان میں سے

ایک کا وجود نہ ہو، تو دوسرا بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ جیسے تاریکی نہ ہو تو روشنی بھی نہیں ہو سکتی۔ موت نہ ہو تو زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہ ایک دوسرے کی تکمیل موجب بھی ہوتے ہیں۔ یعنی عنصر غالب آہستہ آہستہ منسوب میں تبدیل ہو کر اسے غالب بنا دیتا ہے۔

(ش) یہ طریق تصادم و تخلیق۔ یا یوں کہیے کہ اشیاء میں استبدال و استخلاط کا عمل متواتر۔

شرع سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے، کبھی ختم نہیں ہوگا۔

(ص) یہ طریق عمل صرف اشیاء (THINGS) کے اندر کارسزما نہیں بلکہ انسانی فکر اور معاشرتی

و معاشرتی نظام زندگی بھی اسی قانون اضداد کے تابع ہیں۔ ان میں بھی اسی طرح باہمی تصادم اور سلسلہ تغیرات جاری و ساری رہتا ہے۔

ماؤزے تنگ نے انسانی فکر کے متعلق تو یہ کہاہے لیکن خود ان کے متعلق اس نے بصراحت کچھ نہیں کہا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک (بلکہ مادی تصور حیات کی رُو سے) کائنات میں مادہ کے علاوہ کسی اور شے کا وجود ہی نہیں، اس لئے ان کا شمار بھی اشیاء (THINGS) میں ہوتا ہے اسی لئے شاید اس کے متعلق کسی جداگانہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لہذا یوں سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ دیگر اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے، وہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ (یہ نکتہ بڑا اہم ہے اسے خاص طور پر ذہن میں رکھئے)۔

ایک اہم استثناء یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ جد لیاقی فلسفہ کی رُو سے، اشیاء کائنات ہوں یا انسانی فکر و تصورات، ان میں سے کوئی بھی غیر متبدل نہیں۔ ہر ایک تغیر پذیر

ہے۔ لیکن خود یہ قانون (LAW OF CONTRADICTION) جس کی رُو سے یہ تمام تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں، غیر متغیر اور غیر متبدل ہے۔ ماؤزے تنگ کے اپنے الفاظ میں۔

یہ ایک عالمگیر صداقت ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ اس میں کوئی استثناء

نہیں ہو سکتی۔ یہ کائنات کا عمومی، ابدی اور غیر متبدل قانون ہے۔

دوسرے مقام پر ماؤزے تنگ نے اسے معروضی قانون (OBJECTIVE LAW) کہاہے۔

یعنی ایسا قانون جو نہ اشیاء کائنات کا پیدا کردہ ہے نہ ذہن انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج

ہے۔ چونکہ یہ قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے اس لئے جب اسے موجود فی الخارج کہا

جائے گا تو اس کا حشر شبہ لامحالہ کائنات (UNIVERSE) سے ماوراء قرار دیا جائے گا۔ اس نکتہ کا

ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے۔

علم کسے کہتے ہیں؟ (۱) ماوزے تنگ نے علم (KNOWLEDGE) کے متعلق کہا ہے کہ:

(۱) علم وہی علم ہے جسے حواس کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اسے

(۲) انسانی فکر چونکہ معاشرہ کے خارجی عناصر سے بھی متاثر ہوتی ہے، اس لئے کسی ایک زمانے میں انسان صداقت (TRUTH) کا صرف اضافی اور جزوی علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس شرح انسان کا جزوی علم بڑھتے بڑھتے ایک دن حقیقی اور کلی علم بن جاتا ہے۔ یعنی وہ صداقت مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) تک پہنچ جاتا ہے۔

صداقت مطلقہ سے مراد قوانینِ نظریہ ہیں۔

(۳) یہ دیکھنے کے لئے، کہ انسان نے جو علم حاصل کیا ہے وہ صداقت ہے یا نہیں، اس علم کو عمل میں لانا ضروری ہے۔ اگر مثلاً اس کا نتیجہ وہی ہو جو اس کا دعوے سے ہے تو وہ علم سچا ہے، ورنہ جھوٹا اور غلط۔ یعنی علم کی صداقت کی پرکھ (PRAGMATIC TEST) کی روت سے ہو سکتی ہے۔

(۴) انسان کا جو عمل، قوانینِ نظریہ کے مطابق ہوگا، وہی صحیح نتیجہ پیدا کرے گا۔

(۵) ظاہر ہے کہ اس طریق کی روت سے انسان کوئی صداقت (TRUTH) یا قانون (LAW) بناتا نہیں۔ جو صداقتیں یا قوانین کائنات میں موجود ہیں، انہیں صرف دریافت (DISCOVER) کرتا ہے۔

(۶) مختصر الفاظ میں صداقت کے انکشاف کا طریقہ یہ ہے کہ ایک نظریہ (THEORY) کو عمل میں لایا جائے۔ اس سے جو نتیجہ مرتب ہو اسے پھر نظریہ (یا CONCEPT) تصور کر کے اس پر عمل کیا جائے۔ اس طرح ہر عمل کے بعد علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی۔ اس طریق کار کو مسلسل جاری رکھا جائے۔ اور اس طرح انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ جو عناصر اس انقلاب کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہوں گے، شروع شروع میں بہ جبر انہیں راستے سے ہٹایا جائے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایسا مرحلہ آجائے گا جہاں دنیا کیوں نہ ہو کے نظام کو لطیف خاطر قبول کرے گی۔ داخلی انقلاب کے بغیر خارج میں کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔ خارجی

عناصر اس پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں لیکن انقلاب کی اساس داخلی تبدیلی ہی ہوتی ہے۔
یہ ہے اس فلسفہ کی رو سے علم کا تصور اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔

اس فلسفہ کا جائزہ

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ فلسفہ جدلیت کا بنیادی دعوے یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے (THING) کے اندر دو متضاد عناصر ہر وقت مصروف جدل و پیکار رہتے ہیں اور اسی تضاد کے نتیجہ میں وہ شے کچھ عرصہ کے بعد بالکل نئی شے میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک "شے" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں غیر جاندار اشیاء، جاندار مخلوق، خود انسان، انسانی فکر اور انسانی تمدنی اور معاشی نظام سب شامل ہیں۔ جہاں تک غیر جاندار اشیاء یا انسان کے علاوہ دیگر جاندار مخلوق کا تعلق ہے، ان میں عمل نشوونما کا سوال ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس پر بحث نہیں کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادی اشیاء کی نشوونما کے اصول و طریق کے سوال کا تعلق طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) سے ہے اسے فلسفہ کے دائرے میں آنا ہی نہیں چاہیے (اگرچہ آجکل یہ رجحان بھی فروغ پا رہا ہے کہ طبیعیات کی بنیاد بھی فلسفہ ہی پر رکھ دی جائے) بہر حال، یہ سوال ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، اس لئے ہم اس پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا تعلق خود انسان سے ہے اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے سوال کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انسان کے طریق نشوونما کے متعلق، ماؤزے تنگ نے بصراحت الگ بحث نہیں کی۔ اس کے نزدیک جس اصول یا طریق عمل کا اطلاق اشیائے کائنات پر ہوتا ہے، اسی کے مطابق انسان کی نشوونما بھی عمل میں آتی ہے۔ یا یوں کہیے، کہ وہی قانون اصدا خود انسان پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

اس فلسفہ کی رو سے کہا یہ گیا ہے کہ

(۱) متضاد عناصر کے باہمی تضاد کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

(۲) اس تضاد کے سلسلہ میں، ہر نئی شے جو وجود میں آتی ہے، پہلی شے سے بہتر اور ارفع ہوتی

ہے۔

(۳) اس قانون ارتقاء میں رجعت (واپس لوٹنا) نہیں آگے بڑھنا ہی ہے۔

یہاں سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ جامد مادہ، اس طریق جدلیت کی رو سے، رفتہ رفتہ، پیکر انسانی میں تبدیل ہو گیا۔ اس میں نئی چیز اس کی فکر اور شعور — بلکہ شعور خویش (SELF-CONSCIOUSNESS) ہے۔ اس لحاظ سے، یہ سابقہ کڑیوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جدلیت کے لامتناہی سلسلہ کی رو سے، اس کے بعد کیا ہو گا؟ — یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ موت کے بعد نہایت جسم، بے جان مادہ رہ جاتا ہے۔ جو کچھ عرصہ کے بعد منتشر (DE-COMPOSE) ہو کر مختلف کیمیائی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے — لوہا، چونا، فاسفورس وغیرہ۔ اگر ان اسی جسم کا نام تھا تو اس کی یہ تبدیلی، اسے آگے لے جانے کے بجائے، جامد مادہ کی اسی پہلی کڑی میں لے گئی جہاں سے سلسلہ ارتقاء کی ابتدا ہوتی تھی۔ یہ ارتقاء نہیں، رجعت ہے اور رجعت بھی ایسی کہ جدلیت کی کشمکش نے جو منازل نہایت سال میں طے کئے تھے، موت کی ایک ضرب کاری نے ان سب کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اور بات جہاں سے چلی تھی پھر وہیں پہنچ گئی۔ ستر آن کی مثال میں، بڑھیلے جو سوت دن بھر کی محنت سے کاٹا تھا، شام کو اسے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کر کے رکھ دیا۔ اور دوسرے دن پھر وہ چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ موت سے ایک فرد کا تو خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن نوع انسانی (HUMAN Species) باقی رہتی ہے۔ مرنے والا، اپنے جیسا انسان پیدا کر دیتا ہے — تو اس سے بھی اس فلسفہ کی تفسیل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے وہ شے (یعنی انسان) کسی دوسری شے میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ویسے کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہذا، یہ ترقی (PROGRESS) نہیں، اعادہ (REPETITION) ہے۔ یہ خط مستقیم پر آگے بڑھنا نہیں، ایک دائرہ کے چکر میں گھومنا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک فرد، بجائے خویش ایک شے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فرد میں کیا تبدیلی آتی ہے؟ — فلسفہ اصناف کی رو سے، اسے اپنی موجودہ حیثیت سے مختلف اور ارفع صورت میں تبدیل ہونا چاہیے۔ نسل انسانی کی بقا سے وہ فرد تو باقی نہیں رہتا، نہ ہی کسی اعلیٰ پیکر میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا جسم مادی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا یہ حیثیت فردانہ، خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جو ایک فرد میں باہم گرمہز و پیکار

رہتے ہیں؟ — یہ ٹھیک ہے کہ جسم انسانی کے اندر ہر آن تعمیر و تخریب (ANABOLISM & KATABOLISM) کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے پُرانے جراثیم (CELLS) ہر وقت فنا اور ان کی جگہ نئے جراثیم کے وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے اس کا جسم ہر آن ایک نئے جسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک بالکل نیا جسم بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ تصادم و موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں چلتا۔ اور فلسفہ جدلیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ سلسلہ تصادم لامتناہی ہے۔ لہذا انسان اگر عبارت ہے اس کے طبعی جسم سے تو اس سے اس فلسفہ کی ساری عبارت نیچے آگرتی ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ تصادم اس کے جراثیموں کا نہیں، تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جن میں ہر آن کشمکش جاری رہتی ہے۔ ان میں سے ایک عنصر اس کا جسم ہے جو ہمارے سامنے ہے، دوسرے عنصر کو جسم کی ضد (OPPOSITE) ہونا چاہیے۔ وہ کیا ہے؟ پھر ان دونوں میں سے اس وقت کونسا عنصر غالب یا بنیادی (PRINCIPAL) ہے اور کون مغلوب یا ثانوی (SECONDARY)۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد ان عناصر میں باہمی تبادلاً ہو جائے گا یا ایک عنصر ختم ہو جائے گا تو انسان کیا بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ اس وقت بنے گا اس کی نوبت موت کے بعد ہی آئے گی۔ اس سے واضح ہے کہ (فلسفہ جدلیت کی رُو سے بھی) موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب فلسفہ جدلیت یا مائو زے تنگ کی فکر سے نہیں ملتا۔

فلسفہ جدلیت کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کائنات میں ایک ایسی شے بھی ہے جو —

دوسرا اہم نکتہ

- (۱) خود اشیاء کے اندر موجود نہیں۔
- (۲) عمل تضاد و تصادم کی پیدا کردہ نہیں۔
- (۳) ازلی وابدی اور غیر متبدل ہے۔
- (۴) ذہن انسانی کی پیدا کردہ نہیں۔
- (۵) موجود فی الخارج ہے۔
- (۶) عالمگیر حقیقت اور صداقت مطلقہ ہے۔

(۴) ذہن انسانی صرف اس کا انکشاف کر سکتا ہے، اس کی تخلیق نہیں کر سکتا۔

اور یہ شے ہے خود قانونِ تضاد (LAW OF CONTRADICTION)

مادی فلسفہ حیات کی رُو سے اس قسم کی شے کا وجود ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن جب اس کے وجود کا امکان تسلیم کر لیا گیا ہے، تو پھر اگر کوئی یہ کہے کہ اس قسم کا صرف ایک قانون (قانونِ تضاد ہی نہیں، اور کئی قوانین ایسے ہیں، تو اس فلسفہ کے حامیوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسے قوانین سے انکار کریں۔ یا اس تصور کے خلاف اعتراض کریں۔ اگر کوئی شخص خود اس معیار کے مطابق جو فلسفہ جدلیت کے حامی کسی دعوے کی صداقت کو پرکھنے کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ یعنی (PRAGMATIC TEST) کی رُو سے کسی اور قانون کو بھی صحیح ثابت کر دے، تو ان حضرات پر لازم آئے گا کہ اس قانون کو بھی مطلق حقیقت (ABSOLUTE TRUTH) تسلیم کریں۔ یہ ان کے اپنے دعوے کا منطقی نتیجہ ہے۔

ماؤزے تنگ نے اپنے "اقوال" میں ایک جگہ کہا ہے کہ

تیسرا نکتہ | کیونکہ تاریخِ انسانیت میں، مکمل ترین، ترقی پذیر، عقلانی اور معقول

نظام ہے۔

یہ تصور فلسفہِ تضاد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے کوئی شے، کوئی تصور، کوئی نظام کسی وقت بھی مکمل نہیں ہوتا۔ وہ تغیر پذیر ہوتا ہے اور سرِ آن بدلتا رہتا ہے اور تغیرات کا یہ عمل لامتناہی ہوتا ہے۔

ماؤزے تنگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ

ملوکیت یا استعماریت کا نظام اب، زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا

کیونکہ یہ شرانگیز کام (EVIL THINGS) کرتا ہے۔

چوتھا نکتہ

یہ خیال بھی فلسفہِ تضاد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے، کسی نظام کے باقی رہنے یا مٹنے کا یہ اصول نہیں، کہ جو نظام، تعمیری کام کرے گا وہ باقی رہے گا اور جو تخریبی کام کرے گا، مٹ جائے گا۔ اس فلسفہ کی رُو سے، تضاد کا قانون از خود کار فرما ہے۔ اس کے مطابق، ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ضد، دوسرا نظام موجود ہوتا ہے۔ ان دونوں میں باہمی تضاد ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مغلوب نظام غالب آجاتا ہے۔ اس کے بعد، پھر یہ چکر جاری ہو جاتا ہے۔ نہ ہی کوئی نظام اس لئے وجود میں آتا ہے

کہ اُس نے اچھے کام کئے تھے، نہ ہی وہ اس لئے مٹتا ہے کہ اس سے خراب کام سرزد ہوئے تھے۔ وہ نظام کیسا ہوا اور خواہ کسی قسم کے کام کیسے، اسے اپنی باری پر بہر حال، مٹنا ہے۔ تاریخی وجوہ یا قانون اصدا کی اندھی توتیں، نہ اچھے کو دیکھتی ہیں نہ بُرے کو۔ انہوں نے تو ایک کو مٹانا ہے اور اس کی جگہ اس کی ضد دوسرے کو لانا۔۔۔ انسان ہزار چلے ہے اور اس کے لئے لاکھ کوشش کرے کہ اچھا نظام مٹے نہیں قائم رہے وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تغیرات لانے والی یہ توتیں انسان کے نفع یا نقصان کی پرواہ ہی نہیں کرتیں۔ انسان ان کی گردش دولابی کی مشین میں ایک بے بس پیرزے کی طرح ہے کہ جس قسم کا نظام وہ لائے، یہ اس کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں ماؤزے تنگ کا پیش کردہ قانون اصدا۔ اس قانون کا جو تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے مقصود نکتہ چینی نہیں۔ یہ ترآنی فلسفہ حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کے لئے ناگزیر تھا۔

باب دوم

قرآنی فلسفہ حیات

کائنات کے متعلق جو فلسفہ (یا تصور) قرآن کریم پیش کرتا ہے وہ ایک حد تک فلسفہ جدلیت کے دوش بروش چلتا ہے۔ لیکن جو اس مقام فلسفہ جدلیت میں ہیں، قرآنی تصور ان سے ممتاز ہے۔ اور جس مقام پر وہ فلسفہ رک جاتا ہے، قرآنی تصور ان کو اس سے آگے لے جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں قرآنی تصور کو مختصر الفاظ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ بحث حسب ذیل گوشوں میں منقسم ہوگی۔

۱۔ قرآن کا انداز انہام و تفہیم۔

۲۔ تخلیق کائنات۔

۳۔ انسان کی تخلیق۔

۴۔ ان فی زندگی کی کشمکش۔

۵۔ قانونِ تضاد

۶۔ کائنات میں غیر متبدل کیا ہے۔

۷۔ مستقل انداز۔

۸۔ کشمکش حق و باطل۔

۹۔ تضاد میں توافق۔

۱۰۔ علم کا تصور۔

۱۔ قرآن کا طریق افہام و تفہیم

قرآن کریم کا ایک انداز افہام و تفہیم یہ ہے کہ وہ ایک شے یا نظریہ کی ضد کو اس کے سامنے لا کر اس کی وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ۔ اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ وَالْظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ۔ نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ وَالْخِطْلُ وَالْحُرُورُ۔ نہ ہی دھوپ اور سایہ یکساں ہو سکتے ہیں۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَالْمَوَاتُ۔ (۴۴-۴۵)۔ نہ ہی مرنے والے اور زندہ برابر ہو سکتے ہیں۔ اسی نظریات اور تصورات کے سلسلہ میں وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر، ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت، حق کے مقابلہ میں باطل، کلمہ طیبہ کے مقابلہ میں کلمہ خبیثہ لا کر اپنے مطالب و معانی کی وضاحت کرتا ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں)۔ ماو زے تنگ اسی قسم کی مثالیں پیش کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ان متضاد اشیاء میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں ہوتا، لیکن قرآن کریم ان تضاد کو معانی و مطالب کی دھجکا کے لئے پیش کرتا ہے۔ وہ یہ تصور پیش نہیں کرتا کہ یہ متضاد اشیاء از خود ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ یہ تصور درحقیقت مجوسیت (MAGISM) نے پیش کیا تھا۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانًی (۳۹) کہا ہے۔ یعنی وہ کتاب جس کی تعلیم شروع سے آخر تک، مربوط اور آپس میں ملتی جلتی ہے۔ اس میں کہیں مخالفت نہیں، تضاد نہیں،

لیکن یہ اپنے مفہوم کی وضاحت، متضاد اشیاء کو ایک دوسرے کے بالمقابل لا کر کرتی ہے (تضادم اور کراؤ کے متعلق ہم آگے چل کر بات کریں گے)۔

قرآن کریم اشیاء فطرت کے اختلاف کو مِنْ آيَاتِ اٰلٰہِ نٰثٰتِہٖ خداوندی میں شمار کرتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ — اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ — (۲۴۰)۔ یعنی تخلیق ارض و سما اور اختلاف نل دنہار میں ان لوگوں کے لئے نشانات راہ ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے۔

وَ مِنْ آيٰتِہٖ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَ النَّہَارِ (۲۴۰)۔

ارض و سما کی تخلیق اور ان انوں کے رنگ اور زبان کا اختلاف بھی آیات خداوندی میں

سے ہے۔

لیکن وہ نسلوں اور زبانوں کے اس اختلاف کے باوجود تمام نوع انسانی کو، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر ایک برادری (امت واحدہ) بنانا چاہتا ہے۔ یہ ہے اس کے نزدیک توافق اضداد - UNITY OF OPPOSITES - کا طریق۔

۲۔ تخلیق کا بت

عمل تخلیق کے متعلق قرآن کریم کا پیش کردہ تصویریہ ہے کہ کائنات کو بیک جنبش، مکمل شکل میں پیدا نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ یہ بتدریج عمل ارتقاء کی روستے تکمیل تک پہنچ رہی ہے۔ واضح رہے کہ عربی زبان اور خود قرآن کریم کی روستے) ایک عمل ہے فطر کا اور دوسرا ہے خلق کا۔ فطر کے معنی ہیں کسی شے کو پہلی بار عدم سے وجود میں لانا۔ اور خلق کے معنی ہیں مختلف عناصر میں توازن و ترتیب سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ (یہ لفظ عام طور پر انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات اسے فطر کے مفہوم میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے) خدا کے عمل فطرت کے متعلق تو قرآن کریم کوئی تشریح پیش نہیں کرتا کیونکہ ”عدم سے وجود میں آنے کا سوال انسان کے شعور کی موجودہ سطح پر اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لیکن عمل تخلیق

کے متعلق وہ وضاحت سے بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔ **يَذَرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ**۔ ایک شے کی تخلیق کی اسکیم، عالم امر کی بلندیوں میں طے پاتی ہے۔ پھر اس اسکیم کا عملی آغاز زمین کی پست ترین سطح سے ہوتا ہے۔ **ثُمَّ يُعْرِجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَامُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ** (۳۳)۔ اس نقطہ آغاز سے وہ، بتدریج بلندیوں کی طرف الجھرتی ہے تاکہ اس اسکیم کے مطابق اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ تدریجی مراحل وہ، ایک ایک دن میں طے کرتی ہے جس کی مقدار تہارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں پچاس پچاس ہزار سال کی۔ (۳۴)۔

ان تخلیقی مدارج کے متعلق وہ دوسری جگہ کہتا ہے کہ۔ **وَالَّذِي خَلَقَ فَسُوِّيْهِ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ**۔ (۳۵)۔ خدا وہ ہے جو اشیائے کائنات کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ ان میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے، انہیں ایک خاص اعتدال پر لاتا ہے۔ پھر ان کا ایک مقام تکمیل (DESTINY) مقرر کرتا ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے انہیں راستہ دکھا دیتا ہے۔ اسی عمل ارتقا کو اس نے دو لفظوں میں یوں بیان کیا ہے

إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ (۳۶)

خدا وہ ہے جو ہر شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اسے گردشیں دیتا ہوا مختلف مراحل میں سے گزرتا ہے۔

مثلاً اس نے زمین اور اجرام فلکی کے تخلیقی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ
۱۔ یہ تمام اجرام، ابتداءً ایک ہیولی (NEBULAE) کی شکل میں ایک ہی تھے۔ پھر الگ الگ ہوئے۔ (۳۷)۔

۱۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ متران کریم کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ وہ طبعی امور کے متعلق تفصیلی گفتگو کرے۔ اس کا موضوع انسانی زندگی کے مسائل کو سلجھانے کے لئے راہ نمائی عطا کرنا ہے۔ وہ طبعی امور کے متعلق محض مضمناات کرتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس خدا کی طرف سے ہے جو خالق کائنات ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ وہ بھی کسی بات کے متعلق کچھ کہے تو وہ حقیقت کے خلاف ہو۔

- ۲۔ یہ ہیولے گیس کی شکل میں تھا۔ (۴۱)۔
 - ۳۔ زمین اس ہیولے سے یوں الگ ہوئی جیسے گوپے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ (۴۲)۔
 - ۴۔ ان اجرام کو کچھ مختلف مراحل میں سے گذارا۔ (۴۳)۔
 - ۵۔ زمین بھی اس ہیولے سے الگ ہونے کے بعد، دو مراحل میں سے گزر کر اس قابل ہوئی کہ اس پر زندگی کی نمود ہو سکے۔ (۴۴)۔
 - ۶۔ زندگی کی نمود پانی سے ہوئی۔ (۴۵)۔ اور اس طرح بتدریج، جانداروں کی تخلیق ہوئی۔
یعنی رنگینے والے، دو پاؤں پر چلنے والے، چار پاؤں پر چلنے والے۔ (۴۶)۔
- اس تمام عمل (PROCESS) میں خدا کی ربوبیت کا زور رہتا ہوتا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں ایک شے کو اس کے نقطہ آغاز سے بتدریج مقام تکمیل تک پہنچنے کے لئے سامان نشوونما عطا کرنا۔ ان مراحل میں سے گذرتی ہوئی ایک شے، کچھ وقت کے لئے ایک مقام میں ٹھہرتی ہے۔ اس کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف چل دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے، ان اشیاء کا مستقر و مستودع کہہ کر پکارا ہے (۴۷)۔ یعنی کسی شے کی ماضی قرار گاہ اور اس کے بعد وہ اگلی منزل جس کے سپرد اس امانت کو کر دیا جائے۔ اس نئی منزل میں پہنچ کر وہ شے، کچھ اور بھی بن جاتی ہے۔ اسے وہ اس شے کی نشاۃ الآخرۃ سے تعبیر کرنا ہے۔ یعنی اس کی دوسری پیدائش۔ سورہ عنکبوت میں ہے۔

قُلْ سَلِّمُوا فِي الْأَرْضِ فَإِنظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ ارْجِعُوا إِلَى اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ (۴۸)۔

ان سے کہو کہ دنیا میں چلو پھرو۔ اور دیکھو کہ خدا کس طرح ایک شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ اور پھر اسے کس طرح ایک نئی دوسری پیدائش عطا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ان پیاموں کے مطابق ہوتا ہے۔ جو اس نے اشیاء کائنات کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور جن پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔

یہ تغیر کائنات کی ہر شے میں ہر آن رونما ہوتا رہتا ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (۴۹)۔ کائنات کی ہر شے، ہر آن تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اور ہر نئے مرحلہ میں اس کی نشوونما کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور خدا کی صفت ربوبیت اس کے تقاضوں کے مطابق سامان نشوونما عطا کئے جاتی ہے یَسْئَلُهُ مَنْ

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَاْنٍ۔ (۲۵)۔ کائنات کی ہر شے ہر آن ایک نئی ہیئت میں ہوتی ہے اور اپنی نشوونما کے لئے خدا کی شانِ ربوبیت کی محتاج۔ یوں وہ شے نشوونما پا کر ایک نئی شے بن جاتی ہے۔ اس طرح کائنات میں منت نئے تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۲۶)۔

وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق مخلوق میں منت نئے اضافے

کرتا رہتا ہے۔

غالب کے الفاظ میں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز؛

رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

ان تخلیقی تبدیلیوں کے سلسلہ میں وہ یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اس طرح یہ تمام کارگر کائنات رفتہ رفتہ ایک اور قالب میں ڈھل جائے گا۔

يَوْمَ تَبْدِلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ (۲۷)

جس مرحلہ میں یہ ارض کسی اور ارض میں تبدیل ہو جائے گی اور اسی طرح سماوات بھی۔

اس لئے کہ ہُوَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ۔ (۲۸)۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ

اس کائنات کی مثل دوسری کائنات بنا دے؛

لیکن جس طرح یہ سلسلہ کائنات ازلی نہیں یعنی ایسا نہیں کہ اس کی ابتدا کوئی نہ ہو، اسی طرح

یہ ابدی بھی نہیں کہ اس کی انتہا کوئی نہ ہو۔ كُلُّ شَيْءٍ خَيْرٌ مِّنْ مُّسْتَقْبَلٍ۔ (۲۹)۔ یہ سلسلہ ایک

نشان کردہ مدت تک کے لئے رواں دواں چل رہا ہے۔

ان اشیاء میں سے جو سننے (خارجی اثرات کے تابع) آگے بڑھنے کی صلاحیت کھودیتی ہے۔

اس تبدیلی سے مراد وہ عالمگیر انقلابِ عظیم بھی ہو سکتا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ عالمِ انسانیت میں

رودنا ہوگا۔ اور کائنات کی طبعی تبدیلی بھی۔

ترقی رُک جاتی ہے پھر وہ یا تو معدوم ہو جاتی ہے اور یا اُنھی مقام پر گردش کرتی رہتی ہے۔ جس طرح آم کی گٹھلی سے اسی طرح آم کا درخت پیدا ہو جاتا ہے، بکری اپنے بیسا بچہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ گردش دو لابی (REPETITION) یا تولید (REPRODUCTION) ہے۔ ارتقاء (آگے بڑھنا) نہیں۔

۳۔ انسان کی تخلیق

انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے ایک خاص منزل تک یہ بھی اپنی تخلیقی مراحل میں سے گزرتا ہے جن سے دیگر اشیائے کائنات اور جاندار مخلوق گذرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں

بَدَا خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ۔ (پہلے)۔ انسانی تخلیق کی ابتداء بے جان مادہ (INORGANIC MATTER) سے ہوئی۔ جامد مادہ میں، زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ لیکن جب اس میں پانی کی آمیزش ہوتی ہے، تو حیاتِ خوابیدہ، آنکھیں ملتی ہوئی اکٹھی بیٹھتی ہے۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ صَلَاسَةً سَجًى۔ (پہلے) ہر شے کو زندگی پانی سے عطا ہوئی ہے۔ مٹی اور پانی کے امتزاج سے جسے مسترآن نے ظن لازم کہلے یعنی چھپی مٹی، زندگی کا اولین جرثومہ (LIFE-CELL) وجود میں آیا جس میں نروماڈ کا امتیاز نہیں تھا۔ یعنی زندگی کا آغاز (UNI-CELLULAR) طریق سے ہوا۔ اسے قرآن نے،

نَفْسٍ وَاحِدَةٍ سے تعبیر کیا ہے۔ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ (پہلے)۔ "خدا نے تمہیں نفسِ واحد سے پیدا کیا۔" یہ جرثومہ حیات، جوشِ نمو سے پھٹ کر دو ٹکڑوں (SISTER CELLS) میں تقسیم ہو گیا اور یوں دو مادہ کی تفریق و تمیز وجود میں آگئی۔ وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ (پہلے)۔ اور اس طرح اس جرثومہ واحد سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

قرآن کریم نے "جوڑے" کے لئے لفظ "زوج" استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ایسے جوڑے کے ہیں جس کے ایک جزو کے بغیر دوسرے جزو کی تکمیل نہ ہو سکے۔ یعنی وہ دونوں اجزاء ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کی تکمیل کا موجب (COMPLEMENTARY TO EACH OTHER) ہوتے ہیں۔ یہ توڑے صرف جانداروں میں نہیں، ہر شے میں ہوتے ہیں۔ وَالَّذِي خَلَقَ الْأُنثَىٰ وَاجًا كَلَهًا۔ (پہلے)۔ اُس نے برائے کے جوڑے پیدا کئے جو ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی

تکمیل کا باعث ہیں۔

مختلف اشیائے کائنات میں، ازواج کا اختلاط کس طرح ہوتا ہے؟ یہ سوال ہمارے زیر نظر موضوع سے خارج ہے۔ جہاں تک انسانی تخلیق کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ (دیگر حیوانات کی طرح) نر اور مادہ (عورت اور مرد) کے جنسی اختلاط سے، رحم مادر میں انسانی بچے کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بچہ (جنین)۔ دیگر حیوانات ہی کی طرح۔ رحم میں مختلف منازل سے گزرتا ہے۔ وقرآن کے الفاظ میں
ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نَطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ۔ استقرار محل کے بعد۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النَّطْفَةَ عَلَاقَةً
یہ جڑوہ آہستہ آہستہ کچھ لٹکنے والی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ فَجَعَلْنَا الْعُلُقَةَ مِضْغَةً۔ پھر وہ گوشت
کا لوٹھڑا سا بن جاتا ہے۔ فَخَلَقْنَا الْمِضْغَةَ عِظَامًا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ سا ابھر آتا ہے۔
فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔ پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ سی چڑھ جاتی ہے۔ (۲۳-۱۱)

یہاں تک انسان اور دیگر حیوانات کے بچے یکساں مراحل سے گزرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد
ایک مقام امتیاز آ جاتا ہے جو درحقیقت مادی تصور حیات اور قرآنی نظریہ زندگی کا نقطہ تفریق ہے۔ اس
سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر قرآن نے کہا ہے کہ
ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (۲۳-۱۲)
پھر ہم اسے ایک نئی مخلوق بنا دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی تبدیلی ہے جس سے انسان، دیگر حیوانات سے مختص اور متمیز ہو کر
ایک نئی مخلوق بن جاتا ہے؟ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُسُلِنَا (۲۳-۱۳)

اس میں خدا اپنی روح (توانائی) کا ایک شمع ڈال دیتا ہے۔

یہ الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) ہے جس کے اسناد سے انسان، دیگر مخلوقات

سے بالکل الگ اور ممتاز مخلوق بن جاتا ہے۔ یہ "نفخ روح خداوندی" انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق کے

حصے میں نہیں آیا۔ اسی کو انسانی ذات (HUMAN - PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی

ہے، جسے "میں" کہا جاتا ہے۔ یہ انا (I - AM - NESS) ہے جو اس حیوان کو انسان میں تبدیل کر دیتا

ہے۔ اسی کے احساس کو شعور و خویش (SELF - CONSCIOUSNESS) کہا جاتا ہے۔ اسی سے

انسان اپنے ہزاروں فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے یہ اس قابل ہوتا ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔ اس تبدیلی کو مترآن کریم نے بڑے، بلوغ، لطیف اور حسین انداز سے بیان کیا ہے، وہ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے، اسے صیغہ واحد غائب (THIRD PERSON) سے پکارتا چلا جاتا ہے۔ (خَلَقْنَاهُ نَسْلَهُ سَوَاءً)۔ لیکن اس کے بعد جب اس میں "نفخ روح" ہو جاتا ہے تو اس صیغہ غائب کو ایک تخت صیغہ مخاطب (SECOND PERSON) میں تبدیل کر کے کہتا ہے۔

وَجَعَلْ لَّكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ۔ (۳۳)

پھر خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے۔

یعنی اس طرح وہ مخلوق (انسان) اس قابل ہو جاتی ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں مادی تصورات حیات اور شرآئی نظریہ تخلیق انسانی میں وہ فرق نمودار ہوتا ہے جس کے بعد ان کے راستے بالکل الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ مادی تصورات حیات کی رو سے، انسان محض اس کے طبیعی جسم سے عبارت ہے۔ طبیعی قوانین کے مطابق دیگر حیوانات کی طرح اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ طبیعی قوانین کے ماتحت اس کی نشوونما ہوتی ہے اور جب طبیعی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رک جاتی ہے تو اسے موت آجاتی ہے اور یوں اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مترآن کہتا ہے کہ "نفخ روح خداوندی" کے بعد جب انسان، ایک خلق جدید یعنی مخلوق میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں ایک ایسی شے کی نمود ہو جاتی ہے جو نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہے نہ طبیعی قوانین کے مطابق اس کی نشوونما ہوتی ہے اور نہ ہی جسم کی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ وہ انسان کی موت کے بعد زندہ رہتی اور زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَعِنْدَ خَلْقَتِكُمْ أَطْوَأَ مَا رَأَيْتُمْ۔ (۳۴)

خدا نے تمہیں مختلف مدارج میں سے گذارتے ہوئے پیدا کیا۔

ان مدارج و مراحل میں، ہر نیا درجہ اوپر درجہ، سابقہ درجہ اور مرحلہ سے بلند تھا۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو سکتا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَلَىٰ طَبَقٍ۔ (۳۵)

تم اسی طرح طبقہ طبقہ، درجہ بدرجہ بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔

موت سے تمہارے جسم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تمہارا نہیں۔ تم ایک نئی زندگی رکھی خَلْقِ جَدِید میں داخل ہو جاتے ہو۔ موت تو اس بات کا ٹیسٹ (TEST) کرنے کے لئے ہے کہ تم میں آگے بڑھنے کی کس قدر صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔

خَلْقِ الْمَوْتِ وَالْحَيٰوَةِ لِيَبْلُوَكُمْ اَنۡتُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۲۰)

موت اور حیات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کا ٹیسٹ ہو جائے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے اندر کس قدر حسن و توازن پیدا کر لیا ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ جب جسم انسانی کے اجزاء منتشر ہو کر پھر سے لوہا اور پتھر بن گئے تو انہیں حیات نو کس طرح مل سکتی ہے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ ان اجزاء سے تمہارا جسم مرکب تھا۔ "تم" ان کے مجموعہ یا امتزاج کا نام نہیں تھے۔ اس لئے جسم کے پھر سے بے جان مادہ بن جانے سے "تم" فنا نہیں ہو جاتے۔

قُلْ كُونُوا حِجَارًاۙ اَوْ حَدِیدًاۙ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْسُبُ فِیۡ صُدُورِكُمْ

(۲۱)

ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا، یا کوئی اور شے جس کے متعلق تمہارے ذہن میں ہو کہ اس کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تم ایک ایسی "نئی مخلوق" بن چکے ہو جو طبیعی قوانین کی زد میں نہیں آتی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مادی جدلیت کا پیش کردہ نظریہ یہ ہے کہ بے جان مادہ، عمل ارتقاء سے بڑھتا بڑھتا پیکر آدمیت تک آگیا۔ اب اس کے بعد ارتقاء کی بجائے رجعت ہوگی۔ انسان مرنے کے بعد پھر اپنی اجزاء میں تبدیل ہو جائے گا۔ جن کے ارتقاء سے وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن شرآن کہتا ہے کہ ارتقاء میں رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔ زندگی کی ندی کا چوپانی آگے بڑھ گیا وہ لوٹ کر پیچھے نہیں آ سکتا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ اس زندگی میں جن لوگوں کی انسانی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما نہیں ہوئی ہوگی وہ مرنے کے وقت کہیں گے کہ رَبِّ ارْجِعُوْنِیْ لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَكْتُ۔ لے میرے نشوونما دینے والے! زندگی کے دھارے کا رخ ایک بار پیچھے کی طرف موڑ دے، کہ جو مواقع میں نے پہلے کھو دیئے تھے وہ پھر حاصل ہو جائیں، تو میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا۔ کَلَّا۔ (۲۲-۲۳) نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔

زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹا کرتا۔ عمل ارتقا میں رجعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں یا آگے بڑھنا ہے یا ایک مقام پر رُک جانا۔ پیچھے مڑنا نہیں۔ (آگے بڑھنے کا نام، قرآن کی اصطلاح میں جنت کی زندگی ہے۔ رُک جانے کا نام جہنم۔ اور یہ سلسلہ ارتقا جنت کی زندگی میں بھی بدستور جاری رہتا ہے۔ ان نکات کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ اس لئے اس وقت انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔ آپ نے غور کیا کہ جس مقام پر آکر فلسفہ امتداد رُک ہی نہیں جاتا بلکہ اس کی تمام عمارت نیچے گر جاتی ہے۔ قرآن کریم اس مقام سے ان کو کس طرح آگے لے جاتا ہے۔



۴۔ انسانی زندگی کی کشمکش

جس طرح انسانی بچہ کو اس کا جسم اور جسمانی صلاحیتیں، نشوونما یافتہ (DEVELOPED) شکل میں نہیں ملتے۔ ان کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسی طرح اسے انسانی ذات بھی نشوونما یافتہ شکل میں نہیں ملتی۔ اس کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہو یا اس کی ذات کی نشوونما، یہ امتداد کے تضاد (CONTRADICTIONS) کی رو سے ہوتی ہے۔ جسم انسانی میں یہ تضاد، زندگی کے جڑوں کے ہر آن نٹا ہونے اور نئے جڑوں کے وجود پذیر ہوتے رہنے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ زندگی، صحت، بیماری، موت، اسی کشمکش کے مظاہر ہیں۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کن متضاد عناصر کے تضاد سے ہوتی ہے۔ یہ سوال غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے کچھ قوانین ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی کچھ قوانین و ضوابط ہیں۔ انسانی جسم کی پرورش سے متعلق قوانین کو قوانین فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ اور انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق قوانین کو مستقل اقتدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار بھی قوانین فطرت کی طرح غیر متبدل اور عالمگیر ہیں۔ ان اقدار کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس وقت صرف ایک بنیادی قاعدہ کو مثلاً پیش کیا جاتا ہے۔

جسم انسانی کی پرورش ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود استعمال کرتا ہے۔ (مثلاً کھانا، پینا وغیرہ) اس کے لئے ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹتا چلا جائے۔ عقل انسانی، اس کے اس جذبہ کی تسکین کے لئے اسے مختلف راہیں سمجھاتی اور متنوع حربے سکھاتی ہے۔ نیز اس کی اس روش کے لئے جواز کی دلیلیں (JUSTIFICATORY REASONS) تراشتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنے جسم کی ضروریات سے زائد جو کچھ ہو، اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ اس طرح انسانی جسم کے تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے میں کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کشمکش اور تضاد کو قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں 'ابلیس و آدم کی آدینرش' سے تعبیر کیا ہے۔ ابلیس (یا شیطان) انسان کے ان جذبات کا ترجمان ہے جو اس کے طبعی تقاضوں کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں ابلیس و آدم کی نمود ایک ہی وقت میں ہوئی ہے۔ اور ابلیس کو آخر تک، آدم کے مد مقابل رہنے کی ہمت بھی دیدی گئی ہے۔ (قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ) (۱۱۶)۔ خدا نے ابلیس سے کہا کہ ہاں! تمہیں ہمت دیجاتی ہے، لہذا، انسان کے اندر، تضاد کی کشمکش، شروع سے ہے اور آخر تک رہے گی۔ ایک فرد کی زندگی میں بھی اور نوع انسان کی حیات اجتماعی میں بھی۔۔۔ حیاتِ جہنم میں ان دو گروہوں کی شکل میں جن میں سے ایک اپنے ذاتی مفاد کے حصول کو مقصدِ زندگی قرار دے اور دوسرا گروہ ان کا جو نوع انسانی کے مفاد عامہ کو پیش نظر رکھیں، اس ٹکراؤ سے انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نمود اور نشوونما ہوتی ہے۔ اس سے اس کی قوت بڑھتی ہے اور جوں جوں اس کی قوت بڑھتی جاتی ہے، ابلیسی تقاضے اس سے مغلوب ہوتے جاتے ہیں۔ اسی لئے ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ تو جس قدر چاہے زور لگالے۔ (اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہُمْ سُلْطٰنٌ) (۱۱۷)۔ جو لوگ میرے قوانین کا اتباع کریں گے، ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔

دراخ رہے کہ نثر آئی تصور کی رُوسے، 'ابلیس کا کبھی خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ، انسانی ذات کی نشوونما یافتہ قوتوں کے سامنے ٹھک جاتا ہے، ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سلسلہ ارتقا میں آگے بڑھنے اور رُک جانے کے لئے اصول یہ بتایا ہے کہ

فَمَنْ ثَلَاثٌ مَّوَارِثُہٗ فَاُولَٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِسُونَ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ

فَاُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ - (۴)۔

جس کا تیزی قوتوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب و کامران ہوگا۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا۔ وہ نقصان اٹھائے گا۔

یعنی، یہ نہیں کہ آگے وہ بڑھ سکے گا جس کا تختہ سی پلڑا یا کل خالی ہوگا۔ آگے وہ بڑھے گا جس کی ذات کی صلاحیتوں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ جو تختہ سی قوت پر غالب آچکا ہوگا۔ یہاں زندگی اور ارتقاء کا معیار ثقل موازن رہ پڑے گا بھاری ہونا ہے۔

• نفس کشی — یعنی ابلیسی قوتوں کو فنا کر دینے — کا تصور، خائفانہیت کا پیدا کردہ فریب ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت وہی ہے جس کی تائید قرآن کریم ہے۔ اگر تصادم کا امکان باقی نہ رہے تو زندگی کی جوئے رواں، جو ہرن کر رہ جائے۔ اس میں حرکت و حرارت، اسی تصادم کی بدولت ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

مزی اندر جہان کو ر ذوقے

کہ یزداں وارد و شیطان ندارد

یہ ہے وہ دو گونہ عمل اضداد، جو ان کے اندر کار فرما رہتا ہے۔ ایک تضاد اس کے جسم کے اندر اور دوسرا تضاد اس کے طبیعی تقاضوں اور ذات کے تقاضوں کے اندر — واضح رہے کہ قرآن کی تعلیم یہ نہیں کہ انسانی جسم کے طبیعی تقاضوں کو فنا کر دیا جائے۔ قطعاً نہیں۔ وہ جسم کی پرورش کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے میں ٹکراؤ ہو تو ذات کے تقاضے کو ترجیح دینی چاہیے، کیونکہ یہ حیات کی ارفع اور آگے چلنے والی شکل کا نام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس مقام پر بھی قرآنی فلسفہ حیات کس طرح مادی جدلیت کے فلسفے سے آگے لے جاتا ہے۔



۵۔ قانون اضداد

قانون اضداد و تضاد، خود خالق کائنات کا پیدا کردہ، اور اس کی حکیم کالائیفک حصہ ہے۔

وہ چاہتا تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کے تصادم کا امکان نہ ہوتا۔ سب انسان مجبوراً ایک ہی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا اس لئے انسان کو ایسا نہیں پیدا کیا۔ وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآ مَنَّ مِنَ الْإِسْلَامِ جَبِينًا۔ (پہلے) اگر خدا چاہتا تو وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ سب کے سب مومن ہوتے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام ایسا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو حصہ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ کہ وہ اپنے فیصلہ سے جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ۔ (پہلے)

ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

اختیار و ارادہ، انسانی ذات کی خصوصیت ہے۔ اسی سے یہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور اسی سے اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے جس سے اُس کی خارجی دنیا کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ یہ صورت افراد کی ہوتی ہے اور یہی کیفیت اقوام کی۔ اس کا واضح فیصلہ ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَآ يُغَيِّرُ مَا بِتَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔ (پہلے)

یاد رکھو! خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کر لے۔

جس قسم کی تبدیلی قوم کے اندر (یعنی اس کی نفسیات) میں پیدا ہوگی، اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں رونما ہوگی۔ (ایمان) اسی قسم کی صحیح نفسیاتی تبدیلی کو کہتے ہیں، یہی وہ تبدیلیاں ہیں جن سے مردہ اقوام کے اندر زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ فَخُذْ مِنَ الْمَيِّتِ وَ فَخُذْ مِنَ الْحَيِّ۔ (پہلے)۔ اسی سے ایک قوم اپنی عظمت و شوکت کھو کر تعزیزت میں گر جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورہ نوبہ میں خود جماعت مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ اگر تم تخریبی قوتوں کا پوری استعداد سے مقابلہ نہیں کرو گے تو یسْتَبْدِلُ قَوْمًا فَيُزَكِّیْهِمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا۔ (پہلے)۔ خدا کائنات میں خود ثبات تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔

اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے۔ یہ نہیں کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم آتی ہے تو وہ پہلی قوم جیسی ہی ہوتی ہے اس قسم کا استبدال بے معنی ہے۔ یہ آنے والی قوم، جانے والی قوم کی مثل نہیں ہوتی۔ اس سے بہتر ہوتی ہے، جیسی تو اس کی جانشین بنتی ہے۔ اسی لئے کہا کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی، لَا يَكُونُ ذُوًا اَمَثًا لَّكُمْ (۲۴)۔ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ مٹی وہی قوم ہے جس کی تمہاری صلاحیتوں کا پلڑا بھکا ہو گیا ہو، اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جس کا یہ پلڑا بھاری ہو۔ یہی قوموں کے استبدال و اختلاف کا ابدی قانون ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے قوم کی داخلی (نفسیاتی) تبدیلی کا۔

ایک قوم تو ایک طرہت رہی۔ قرآن تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اگر پوری کی پوری نوع انسانی ایسی ہوگا کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے، تو یہ بھی صفحہ ارض سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ اور اسکی جگہ کوئی اور مخلوق لے لے۔

اِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَ يُسَلِّطْ جَنَدًا (۲۵)۔
خدا کے قانون شیت کی رو سے یہ بھی ممکن ہے کہ اگر تم میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے
تو وہ تمہیں مٹا دے اور تمہاری جگہ ایک جدید مخلوق لے لے۔

جب کسی قوم کے زندہ رہنے کی صلاحیتوں کا پلڑا بھکا ہو جائے اور وہ اس طرح مضاف زندگی سے ہٹا جائے تو اسے اس قوم کی "اجل" کہا جاتا ہے اور اس میں پھر ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔
وَلِكُلٍّ اَمَلٌۭ اَجَلٌۭ ۖ فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً ۚ وَلَا
يَسْتَفْتُوْنَ ۝ (۲۶)۔

ہر قوم اس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو جب وہ
صلاحیت ختم ہو جاتی ہے تو اس کی مدت حیات بھی ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد اس میں ایک
ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔

اور یہ کچھ یونہی علی الحساب نہیں ہو جاتا، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وَلِكُلٍّ اَجَلٌۭ
کتاب (۲۷)۔ ہر قوم کی اجل کا فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی انہی قوت
یا قانون تضاد (LAW OF CONTRADICTION) کی جابرانہ گردش نہیں جس سے ایک قوم

غلبہ و تسلط کی مالک بن جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے اور اس میں، نہ مٹنے والی قوم کا کوئی جرم اور قصور ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی جگہ لینے والی قوم کی کوئی کاریگری۔ یہ محض گردشِ دولابی کی رُو سے بندھی ہوئی باریاں ہیں جو خود بخود آتی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کے فلسفہ کی رُو سے، قومیں اپنے جوہر ذاتی کی بنا پر غلبہ و اقتدار کی وارث ہوتی ہے۔ جب تک ان میں وہ جوہر باقی رہتا ہے، ان کا اقتدار بھی قائم رہتا ہے۔ جب اس جوہر میں کمی واقع ہو جائے تو وہ باقی رہنے کی صلاحیت کھودیتی ہے اور اس کی جگہ اسی قوم لے لیتی ہے جو اس سے بہتر صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قانونِ اصدا و اور قرآنی فلسفہ میں کس قدر نمایاں فرق ہے اور قرآنی فلسفہ کس طرح علم و بصیرت کو اپیل کرتا ہے۔



۶۔ کائنات میں غیر متبدل کیا ہے؟

فلسفہِ جدلیت کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ

۱۔ کائنات میں مادہ کے کسی شے کا وجود نہیں۔

۲۔ ہر مادی شے میں عملِ اصدا و جاری دساری ہے جس کی وجہ سے ہر شے ہر آن تغیر پذیر ہوتی ہے۔ کائنات میں ثبات و قرار کسی شے کو نہیں۔

لیکن، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اس کے ساتھ ہی، انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود یہ قانونِ اصدا و ایک حقیقتِ مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) ہے۔ غیر متبدل (IMMUTABLE) ہے۔ ابدی (ETERNAL) ہے۔ اور نہ کسی شے کا پیدا کردہ ہے، نہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج (OBJECTIVE) ہے۔

قرآن کریم کا فلسفہ یہ ہے کہ اس مسم کائنات میں متبدل، موجود فی الخارج قانون ایک ہی نہیں۔ ایک سے زیادہ ہیں۔ ان قوانین کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک شقِ قوانینِ فطرت پر مشتمل ہے جن کے مطابق سلسلہ کائنات سرگرم عمل ہے۔ دوسری شق کا تعلق ان قوانین سے ہے جن کے مطابق ان کو بنی نوعیت کی سرگرمی چاہیے تاکہ اس کے طبعی جسم کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی نشو و نما بھی ہوتی جائے، قانونِ فطرت

ہر شے کے اندر از خود موجود ہوتا ہے اور وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہوتی ہے۔ ”مجبور سے مطلب یہ ہے کہ ہشیائے کائنات کو اس کا اختیار و ارادہ ہی نہیں دیا گیا کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکیں۔ انسانی زندگی سے متعلق قوانین، ستر آئن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ قوانین جب نظری حیثیت سے سامنے آئیں تو انہیں کلمات اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جب ان کا ظہور عملی شکل میں ہو تو یہ سنت اللہ کہلاتے ہیں۔ کلمات اللہ ہوں یا سنت اللہ۔ سب غیر متبدل ہیں۔ ایسے غیر متبدل کہ کائنات کی کسی شے کو انسان سمیت، اس کی قدر حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے اور خود خدا جس نے ان قوانین کو اس قسم کا بنایا ہے، قدرت رکھنے کے باوجود، ان میں تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ خود اس کا ارشاد ہے کہ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ اللَّهُ رَہِمًا قوانین خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے۔

و تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (۲۱)

تیرے رب کے قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

اسی طرح ”سنت اللہ“ کے متعلق فرمایا

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۲۲)

خدا کا یہ دستور اہم سابقہ میں بھی رہا۔ یہی اب کارفرما ہے۔ تم دستور خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

جن لوگوں کے سامنے ان ستر آئی حقائق کو پہلی مرتبہ پیش کیا گیا، وہ کہتے تھے کہ یہ محض شاعری ہے فَتَرْجَبُصْ بِهٖ رَبِّبَ الْمُنُونِ (۲۳)۔ تھوڑا سا انتظار کرو۔ زمانے کی گردشیں اسے خود مٹا دیں گی یونہی حالات بدلے اور زمانے کے تقاضوں میں تبدیلی آئی؛ یہ باتیں داستانِ پارینہ ہو جائیں گی۔ ان سے کہا گیا کہ یہ شاعری نہیں۔ شاعری ایک داعی انقلاب کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ (۲۴)۔ یہ اٹل قوانین ہیں۔ اس لئے۔ تَرِصُّوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظَرِ (۲۵)۔ تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ یہ ابدی حقائق ہیں یا کسی شاعر کے تخیلات۔ انہی میں وہ قانونِ عوہ و ثبات شامل ہے جس کے مطابق چیزیں مٹی اور باقی رہتی ہیں یَمُحُوْا اللّٰهُ مَا یَشَاءُ وَیُثَبِّتُ (۲۶)۔ اور ان کا سرچشمہ کائنات سے ماوراء علم خداوندی ہے وَ عِنْدَکَ اُمُّ الْکِتَابِ (۲۷)۔ یہ قوانین

دیئے اس لئے گئے ہیں۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يُخْنَىٰ مَنْ يَخْنَىٰ عَنْ بَيِّنَةٍ (پہ)۔
جیسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے اور جسے تباہ ہونا اور مٹنا ہے، وہ بھی دلیل و
برہان کی رُو سے مٹے۔ یہاں نہ دھاندلی ہے اور نہ ہی محض اتفاقی طور پر حوادث سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہاں
ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔



۷۔ مستقل اقدار

ان میں سے جن قوانین کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر
انسانی معاشرہ ان اقدار کے مطابق مشکل ہو جائے تو اس میں تمام افراد معاشرہ کی طبعی ضروریات زندگی بھی
بلا مشقت و پریشانی پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ یہ
دو ہر مقصد ان اقدار کے سوا اور کسی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان اقدار و قوانین کی فہرست تو
طویل ہے لیکن ہم یہاں ان میں سے چند ایک بنیادی اقدار کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً:-

- ۱۔ ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب الاحترام ہے۔ (۱۱۱)۔
- ۲۔ معاشرہ میں تعین مدارج کا معیار افراد کے ذاتی جوہر اور حسن سیرت و کردار ہے۔ نہ کہ نہانی
نسبتیں۔ (۱۱۲)۔

- ۳۔ معاشرہ میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے ذرائع منفی
کا پابند ہے۔ (۱۱۳)۔

- ۴۔ معاشرہ کے بنیادی ستون عدل اور احسان ہیں۔ عدل کے معنی ہیں ہر ایک کے حقوق اور
واجبات کی کما حقہ ادائیگی۔ اور احسان کے معنی یہ ہیں کہ جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی آجائے
اس کی کا پورا کر دینا۔ (۱۱۴)۔ اور اس کے لئے مزد و معاوضہ تو ایک طرف شکریہ تک کے
بھی متمنی نہ ہونا۔ (۱۱۵)۔

- ۵۔ اپنی جائز ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدینا (۱۱۶)۔
بلکہ اگر دیکھا جائے کہ دوسروں کی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو ان کی ضرورت کو

اپنے اوپر ترجیح دینا۔ (۵۹)۔

- ۶۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (۵۳)۔
- ۷۔ جس میں محنت کرنے کی استعداد ہے، اسے محنت کئے بغیر کچھ نہیں مل سکے گا۔ (۵۳)۔
- ۸۔ ذرائع رزق ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ (۲۱، ۵۵)۔
- ۹۔ ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا معاشرہ کا فریضہ ہوگا۔ (۱۱، ۱۱۱)۔
- ۱۰۔ کسی شخص کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ (۲۳)۔ فرمانروائی صرف قوانین کی ہوگی۔ (۱۱۴)۔
- ۱۱۔ انسان کا کوئی کام۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال تک بھی اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۲۴)۔ ان میں سے ہر ایک کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے اور اپنی اثرات کے ثبوت کے مطابق اس کی ذات کا مستقبل متعین ہوتا ہے۔ اگر اس کے تعمیری نتائج کا پلڑا جھکا ہوا ہے تو اس کا مستقبل خوشگوار ہے۔ اگر وہ پلڑا ہلکا ہے تو اس کے لئے تباہی ہے۔ اس قانون مکافات میں کسی کے لئے استثناء نہیں۔

ان قوانین یا مستقل اقدار کو حق (THE TRUTH) کہاجاتا ہے۔ یہی حقیقت (REALITY) ہے۔ ان کے خلاف جو نظریہ، تصور یا مسلک ہے وہ باطل ہے۔ حق تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے اور انسانیت کے ارتقاء میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ باطل تخریبی نتائج پیدا کرتا ہے اور کاروان انسانیت کا راستہ روک کر ٹھہرا ہوجاتا ہے۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری اس کے تین بڑے ستون ہیں۔ حق و باطل میں شروع سے کشمکش چلی آ رہی ہے اور چلی جائے گی۔ انسانی تاریخ اسی کشمکش کی محسوس تفسیر ہے۔



۸۔ کشمکش حق و باطل

اب ہم پھر ایک ایسے مرحلہ میں داخل ہو رہے ہیں جہاں مادی جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی فقہ میں بنیادی فرق ہے۔ فلسفہ جدلیت کی روتے، کوئی نظریہ، کوئی تصور کوئی مسلک، مذہبیادی طور پر حق ہے

نہ باطل۔ ہر نظریہ (IDEA) اور ہر شے کے اندر دو متضاد عناصر باہم گریہ سر پیکار رہتے ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا۔ جو غالب آجاتا ہے اس کی ضد پھر نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہی کشمکش پھر جاری رہتی ہے اور یہ سب کچھ (مارکس کے الفاظ میں) تاریخی وجوب (HISTORICAL - NECESSITY) اور ماڈرن ٹنگ کی اصطلاح میں تناؤن اضداد کی اندھی قوت کی رُوسے، از خود ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، قرآنی تصویر یہ ہے کہ

۱۔ یہ کشمکش، حق (تعمیری قوتوں) اور باطل (تخریبی قوتوں) کے درمیان ہوتی ہے۔
۲۔ اس کشمکش میں آخر الامر حق غالب آتا ہے، اور سلسلہ کائنات ایک ارتقائی منزل اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس نئی منزل میں باطل پھر سیکریدل کر سٹنے آتا ہے اور حق و باطل کا یہ تصادم پھر جاری رہتا ہے جس میں حق پھر غالب آجاتا ہے۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے اور ہر منزل کے بعد کائنات اور کھڑی او سنورقی چلی جا رہی ہے۔

۳۔ کشمکش اور حق کا غلبہ اس اسکیم کے مطابق جاری و ساری ہے جس کی رد سے خدائے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس کشمکش میں اگر ان حق کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو یہ مرحلہ تیز رفتاری سے طے ہو جاتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو یہ مسافت اس رفتار کے مطابق طے پاتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے لیکر ایک ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔" اس کی مزید تشریح ذرا آچل کر آئے گی۔

۴۔ جو ان حق کی حمایت کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ اور ان کی اس دنیا کی اور اس کے بعد کی زندگی، خوشگوار یوں کے جھولے جھولتی ہے۔ یوں خود ان، اپنے ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

دیکھئے قرآن کریم ان حقائق کو کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
۱۔ نظام کائنات یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا گیا۔ اسے بالحق — تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ ۚ وَمَا

خَلَقْنَاهُمْ إِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۳۴-۳۳)

اور ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان میں ہے، یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ بالحق پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اکثر لوگ علم و بصیرت سے کام نہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

۲۔ کائنات میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ اس تصادم میں آخر الامر باطل شکست کھاتا ہے۔
بَلْ نَقْضُ كَذِبَ عَلَيِ الْبَاطِلِ - فَيَكُونُ مَعَهُ - فَإِذَا هُوَ رَاهِقٌ وَ لَكَرُّ الْوَيْلِ
مِمَّا تَصِفُونَ ۝ (۳۵-۳۴)

ہم حق کی ضربیں باطل پر لگاتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ حق، باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ جو لوگ اپنے تصورات کے مطابق اس کے خلاف کچھ سمجھتے ہیں، تو ان کے حق میں تبہا ہی کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔ کیونکہ وہ حق کے غلبہ کا تصور نہیں رکھتے۔

۳۔ مفاد پرست گردہ باطل کو غالب رکھنے کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔
وَ يُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ (۳۶)
جو لوگ حق سے انکار کرتے ہیں وہ باطل کے حیلوں سے حق کے خلاف نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرح حق کو مغلوب کر دیا جائے۔

۴۔ لیکن حق پرست جماعتیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اتر آتی ہیں۔
لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ كُورَ الْمُجْرِمُونَ ۝ (۳۷)
تاکہ حق کا اثبات ہو جائے اور باطل کا ابطال۔ خواہ ایسا ہونا ان لوگوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو قوانین شکنی ہی میں اپنا مفاد منفر سمجھتے ہیں۔

۵۔ لیکن اگر حق کی حمایت کے لئے انسانوں کی جماعت نہ بھی اٹھے، تو بھی آخر الامر حق غالب آکر رہتا ہے۔ اگرچہ اس میں دقت بہت لگ جاتا ہے۔

وَ يَنْفِخُ فِيهِمُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۝ (۳۸-۳۷)
خدا، اپنے قوانین کے زور سے، باطل کو محو اور حق کو محکم اور استوار کئے جاتا ہے۔

یہ نکتہ، مزید وضاحت چاہتا ہے۔ انسانی عمل کا ایک طریق تو یہ ہے کہ وہ کسی قانون کی صداقت پر یقین رکھ کر اس کے مطابق کام کرنا شروع کر دے۔ اس سے اثباتِ حق کی مسافت بہت جلد طے ہو جائے گی۔ اور اس عمل کے نتائج اس قانون کی صداقت کی محسوس دلیل بن جائیں گے۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ کسی قانون یا فارمولے کو نہ مانے بلکہ اپنے قیاس کی راہ نمائی میں سفر شروع کر دے۔ قیاس عقلی کا طریق تجرباتی (TRIAL AND ERROR) کام ہوتا ہے۔ اس میں عقل ایک مسلک اختیار کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربے کے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ راہ غلط تھی۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس طرح، متعدد تجارب، اور سینکڑوں برس کی جانکاہ مشقتوں کے بعد وہ حقیقت تک پہنچ پاتی ہے۔ اسے عرب عام میں زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کی یہ وہ رفتار ہے جس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اب یہ انسان کے اپنے فیصلہ پر منحصر ہے کہ وہ اپنے سفر کا آغاز ہی حقیقت (صداقت) کی راہ نمائی میں کرے اور اس طرح راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بھی محفوظ رہے، اور مسافت بھی برق رفتاری سے طے کر لے۔ یا عقل کے تجرباتی طریق کے مطابق چھوڑ کر کھاتا ہوا، صدیوں کے بعد وہاں جا کر پہنچے۔ اول الذکر طریق سے حق، ایک ہی جہت میں باطل پر غالب آجاتا ہے۔ ثانی الذکر طریق سے وہ صدیوں میں جا کر غالب آتا ہے۔ غالب یہی طور حق ہی کو آنا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ آخر الامر غالب، حق ہی نے آنا ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ حق یونہی خلا میں غالب آجائے گا۔ حق سے مراد ہے حق پر مبنی نظام۔ یہ نظام انسانوں کی دنیا میں رائج ہو گا اور انسانی ہمت پر اسے متشکل کریں گے۔ ایک جماعت اسے متشکل کرے گی اور دوسری جماعت اس کی مخالفت کرے گی۔ اسکی حمایت کرنے والی جماعت اگر مادی قوت کے اعتبار سے فریقِ مخالف کے مقابلہ میں کمزور بھی ہوگی تو بھی آخر کامیابی ہوگی۔ قرآن کریم اس کمزوری کو ابتداءً ایک دو کی نسبت سے تعبیر کرتا ہے اور آخر الامر ایک اور کی نسبت سے۔

۶۔ یہ پرکھنے کے لئے کہ حق کس طرف ہے، بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَنَمُكِّتْهُ ۚ وَاللَّهُ مَرۡصِدٌ

وہی نظریہ زندگی، وہی مسلک حیات، وہی نظام انسانی باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوع

انسان کے لئے منفعت کا موجب ہو۔

مفاد پرست انسانوں کی گروہ مندانہ منفعت کوششیاں، اس اصول کو ناکام بنانے کے لئے مصروفِ جدوجہد رہتی ہیں لیکن خدا کی اسکیم اسے کامیاب و کامران بنا کر رہتی ہے۔

يُرِيدُونَ اَنْ يُظْفَرُوا نَوْرًا مِّنْ اَمَلِهِ بِاَنْوَاعِهِمْ وَ يَأْتِي اَمَلُهُ اِلَّا اَنْ
يَسْتَقَرَّ نَوْرُهُ وَ لَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ (پہ)

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس نورِ خداوندی کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔ لیکن خدا کی مشیت ان کی ان کوششوں کو بار آور نہیں ہونے دے گی۔ یہ نور اپنی تکیں تک پہنچ کر رہے گا۔ خواہ مفاد پرست گروہوں پر یہ چیز کتنی ہی شاق کیوں نہ گذرے۔

یہی وہ نظامِ زندگی ہے جو باطل پر مبنی ہر نظام پر آخر الامر غالب آئے گا۔

هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَى الْاٰثِنِ
كَلِمَهُ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ (پہ)

خدا نے اپنے رسول کو صحیح منزل کی طرف راہ نمائی دے کر بھیجا ہے۔ یعنی ایک ایسا نظامِ زندگی دے کر جو حق پر مبنی ہے۔ یہ نظام، دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر رہے گا۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت نہیں کرنا چاہتے۔

حق و باطل کی اس کشمکش کے نقطہ نگاہ سے دنیا میں انسانوں کی دو ہی جماعتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حق کا غلبہ چاہنے والی۔ اسے محض مومنین کہا جاتا ہے۔ دوسری باطل کے غلبہ کی متمنی۔ اسے کفار کا گروہ کہتے ہیں۔ کشمکش انہی دو جماعتوں میں ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق پرست ہونے کا دعوے کرتے ہیں لیکن درحقیقت چاہتے ہیں باطل کے ساتھ لپٹے رہنا۔ انہیں منافق کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ، قرآنِ کریم کی رو سے، بدترین خلافت ہوتا ہے۔ یعنی کفار سے بھی بدتر۔

”شُرک“ حق اور باطل کے نظام میں مفاہمت (COMPROMISE) کو کہتے ہیں جس کی نظام حق میں وظیفہ گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نظام کے داعیِ اول (صورتِ نبی اکرم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ

وَلَا تَشْرِكُوْا اِلٰی الَّذِیْنَ ظَلَمْتُمْ فَتَنْصَرِفُوْا النَّارُ۔ (۱۱۳)

یہ لوگ جو عدل کے بجائے ظلم پر مبنی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تو تم ان کی طرف

ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو جس جہنم میں یہ گرفتار ہیں اس کی آگ کے شعلے تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

حق و باطل کے اصدا میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حق کے ساتھ باطل کی ذرا سی بھی آمیزش ہو جائے، تو حق، حق نہیں رہتا۔

قرآنی تصور کی رو سے حق اور باطل کے تضاد کی کیفیت یہ ہے۔ دوسری طرف فلسفہ جدلیت ہے جو تصور پیش کرتا ہے کہ دو باہم متضاد صفتوں میں کچھ وقت کے بعد ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یعنی کچھ عرصہ کے بعد حق — باطل ہو جاتا ہے اور باطل، حق ہو جاتا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کے اس فلسفہ کو (کہ حق ہمیشہ حق رہتا ہے اور باطل، باطل رہتا ہے) وہ ماوراء الطبیعیاتی (METAPHYSICS) سے تعبیر کرتے ہیں جس کی ضد فلسفہ جدلیت ہے۔ اس لئے اس بنا پر ہمیں ان کے فلسفہ پر تنقید کرنے کا حق نہیں۔ ہم اس دلیل کو تسلیم کر لیتے لیکن انہی کا یہ بھی تو دھوئے ہے کہ قانونِ تضاد (LAW OF CONTRADICTION) حق ہے جو باطل میں تبدیل نہیں ہوتا۔ وہ شروع سے وہی ہے اور ابد تک وہی رہے گا۔ یہ خود (METAPHYSICS) ہے، لہذا بات صرف اتنی ہوئی کہ فلسفہ جدلیت، ایک قانون کو غیر متبدل تسلیم کرتا ہے، قرآن ایک سے زیادہ قوانین کو ایسا کہتا ہے۔ اس کے اس دھوئے کی دلیل بھی وہی ہے جو دلیل وہ پیش کرتے ہیں۔ یعنی استنباطی دلیل (PRAGMATIC TEST)۔ اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ جب علم سے متعلق گوشہ سامنے آئے گا۔

یہ حال یہ ہے کہ وہ نظام جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ نظام زندگی جس میں مستقل اقتصادِ حیات یا غیر متبدل قوانین محسوس عملی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ نظام زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہوتا ہے۔ مکان کی حدود سے اس طرح کہ یہ عالمگیر نظام ہے جو کسی خاص خطہ زمین میں محدود نہیں رہ سکتا، نہ ہی کسی خاص قوم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ تمام نوجوان انسان کے لئے یکساں نظام ہے۔ جہاں تک زمان کا تعلق ہے۔ اس نظام کے محسوس پیکر میں تو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن اس کی اصل دنیا دہمیشہ وہی رہتی ہے۔ یعنی غیر متبدل قوانین جن پر ان کی عمارت استوار ہوتی ہے، اسے دین کہا جاتا ہے۔

۹۔ اضراد میں توافق

حق و باطل کی کشمکش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو ان جماعتوں کے درمیان جو حق و باطل کی حامی ہوتی ہیں۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوسرے افراد کے سینے کے اندر (داخلی) کشمکش جس میں ایک طرف انسان کے بیباک جذبات، طبعی مفاد کے حصول کے لئے ہیجان خیز رہتے ہیں اور دوسری طرف اس کی ذات کی نشوونما کے تقاضے حق کی حمایت کے داعی ہوتے ہیں۔ انسانی جذبات کو فنا کر دینے کا تصور انتہائی غلط نہی اور خودکشی ہے۔ جذبات ہی تو وہ قوت محرکہ ہے جو انسان کو آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ مگر ان کا انداز تربیت یہ ہے کہ وہ جذبات کو مستقل اقدار کے تابع سرگرم عمل رہنا سکھاتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے الفاظ میں۔ ”اس طرح ابلیس مسلمان ہو جاتا ہے“ اس سے ان افراد کے سینے کا داخلی اضطراب مبدل بہ سکون ہو جاتا ہے۔ یہ نظام انہی افراد کے باطنوں سے تشکل ہوتا ہے۔ اس کیفیت کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ۔ لَقَدْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ (۱۶۸) خدا کی صفت ربوبیت کے زیر سایہ انہیں ایسا مقام حاصل ہو گا جس میں ہر سمت سے سلامتی کی آوازیں و بھلائی نوازیں ہوں گی۔ (وَتَحْتَهُمْ فِيهَا سَلَامٌ مَّزِيدٌ)۔ اس وقت انسان کے ارضی معاملات اور مادی اقدار (غیر متبدل قوانین) ایک ہی مرکز میں مرکوز ہوں گے۔ (۱۶۹) اور انسانی معاشرہ کی حالت یہ ہو گی کہ۔ لَا تُلَاقُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ کسی انسان کا دوسرے انسان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوگا۔ وَالْآمُرُ يُؤْتَيْنِ بِاللَّهِ۔ (۱۷۰) حکومت انسانوں کی نہیں بلکہ قوانین خداوندی کی ہوگی۔

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورٍ رَبِّهَا۔ (۱۷۱)

اور زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔



۱۰۔ علم کے متعلق تصور

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، فلسفہ جدلیت کی رو سے علم وہی علم کہلانے کا مستحق ہے جو حوس کے ذریعے سے حاصل کیا جائے۔ اور نظریہ وہی درست تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کی تائید اس کے نتائج کریں ہیں۔ عملی طریق سے انسان بتدریج قوانینِ نظرت کا علم حاصل کر لے گا حقائق انہی قوانین کو کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم بھی انسانی علم ہی کو قرار دیتا ہے جسے حواس (SENSE PERCEPTION) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ

وَلَوْ تَقَوَّلَ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْدَهُ مَسْنُونًا ۚ (۱۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور قلب ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے اس بات کے علم ہونے کی شہادت دی تھی یا نہیں۔

یعنی حصول علم کے لئے ضروری ہے کہ انسانی حواس معلومات حاصل کر کے قلب (MIND) تک پہنچائیں اور وہ ان سے کوئی نتیجہ مستنبط کرے۔ چنانچہ قرآن کریم قدم قدم پر مظاہر فطرت پر غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔ وہ علماء کہتا ہی انہیں ہے جو کارگہ فطرت کے مشاہد کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس میں قوانین خداوندی کس حسن و خوبی سے کارسرا ہیں۔ (۲۷۳-۲۷۴)۔ نظام فطرت کے ساتھ ہی وہ انسانی تاریخ کے مطالعہ پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اقوام سابقہ کی سرگزشتوں پر غور کرو اور دیکھو کہ جس قوم نے زندگی کے صحیح قوانین کے مطابق نظام متشکل کیا اس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس نے غلط راہ اختیار کی اس کا انجام کیا ہوا۔

نظام فطرت کے مشاہدہ اور تاریخ انسانی کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر انسان پہنچے، قرآن اسے ایک نظریہ قرار دیتا ہے۔ وہ نظریہ صحیح ہے یا غلط اسے پرکھنے کے لئے وہ کہتا ہے کہ اس نظریہ پر عمل کر کے دیکھو۔ اگر اس کے نتائج اس کے دعویٰ کی تائید کرتے ہیں تو وہ نظریہ صحیح ہے۔ اگر نتیجہ اس کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ نظریہ درست نہیں۔ یہی وہ طریق تھا جسے خود نبی اکرمؐ نے اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت کے لئے پیش کیا۔ آپؐ نے اسی قوم مخالفت سے کہا کہ میں نے تو ان قوانین خداوندی تمہارے سامنے پیش کر دیئے۔ اب ان کی صداقت کے پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ

كُلُّ يَوْمٍ أَغْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ ۖ إِنِّي عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ
مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝ (۱۳۶)

ان سے کہو، کہ اے میری قوم! تم اپنے طریق پر عمل کرو، میں اپنے طریق پر عمل کرتا ہوں نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ منزل تک کون پہنچتا ہے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے یہ حقیقت ابھر کر

سلنے آجائے گی کہ جو لوگ دوسروں کی محنت کو غصب کر کے ظلم کرتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جس دعویٰ کا اثبات اس کے عملی نتائج نہیں کرتے وہ دعویٰ صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے حقیقت تک پہنچنے کے لئے بڑی لمبی مدت درکار ہوتی ہے جہاں تک مستقل اقدار کا تعلق ہے اس طویل مدت کو مختصر کرنے کے لئے خالق کائنات کی طرف سے ایک اور طریق تجویز کیا گیا۔ اسے دجی کہا جاتا ہے یعنی ان قوانین کو کسی انسان پر براہ راست منکشف کر دیا جاتا اور وہ انہیں دوسرے انسانوں تک پہنچا کر ان کے کہتا کہ تم ان پر عمل کر کے خود ان کی صداقت کے متعلق اطمینان کر لو۔

دجی کا یہ سلسلہ چودہ سو سال ہوئے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لہذا اب انسانی علم کا ذریعہ مطالعہ شاہ اور شکر و شہور کے علاوہ کوئی نہیں۔ دجی کے ذریعہ جو علم آخری مرتبہ دیا گیا تھا۔ وہ اپنی اصلی شکل میں قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تم ان قوانین پر غور و فکر کرو اور ان پر عمل کر کے دیکھو اگر اس طرح تمہیں ان کی صداقت کے متعلق اطمینان ہو جائے تو انہیں صحیح تسلیم کرو۔ غور و فکر سے انسانی ذہن ایک نظریہ کے متعلق اتنا اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ مبنی بر حقیقت ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے اس طرح مبنی بر صدا خیال کرے تو یہ بات اسے اس پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ اس پر عمل کر کے دیکھے۔ اس ذہن اس نظریہ کے نتائج ہنوز اس کے سامنے نہیں ہوتے۔ اس طرح ان دیکھے نتائج پر اعتماد کر کے آمادہ عمل ہو جانے کو ایمان بالغیب کہتے ہیں۔ یعنی ان نتائج پر یقین جو ہنوز مشہود طور پر سامنے نہیں آتے۔ یہ یقین اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر انسان اس کے مطابق عملی قدم اٹھانے کے لئے بطیب خاطر تیار نہیں ہو سکتا۔ جب نتائج اس دعوے کی تائید کر دیں تو وہی ایمان بالغیب حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں پہلے درجہ کے یقین کو علم الیقین کہا جاتا ہے اور دوسرے درجہ کے یقین کو عین الیقین (دست) یعنی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا۔

یہ ہے قرآن کی رُوسے علم کی تعریف (DEFINITION) اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔ وہ کہتا ہے کہ جو قوانین یا مستقل اقدار تمہارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، تم ان پر عقل و فکر اور دلیل و بیان کی روش سے غور کرو۔ اگر وہ تمہیں قابل قبول نظر آئیں تو ان کے مطابق اپنا معاشرہ تشکیل کرو۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ان قوانین کی صداقت کی زندہ شہادت بن جائیں گے۔ (۲۴)۔ یوں

وہ انسان کو اس محنت شاقہ سے بچا لیتا ہے جو عقل کے تجرباتی طریق سے منزل تک پہنچنے کے لئے لاینفک ہوتی ہے۔



فلسفہ کا اثر معاشی نظام پر

اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے یہ ساری فلسفیانہ بحث اس لئے کی ہے کہ کمیونزم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے معاشی نظام کی بنیاد فلسفہ جدلیت پر ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ یہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔ اس نظام کے لئے قرآن کا فلسفہ حیات ہی اس اس حکم عطا کر سکتا ہے۔ اس لئے انسانیت کی نجات کی راہ یہ ہے کہ مٹرائی فلسفہ کی بنیادوں پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار کی جائے۔ دونوں فلسفے ہمارے سامنے آگئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مادی جدلیت کا فلسفہ اس عمارت کے بوجھ کا تحمل کیوں نہیں ہو سکتا۔

مادی فلسفہ خواہ وہ جدلیت کا ہو یا مادہ راہ الطبیعیاتی، اس کا فطری نتیجہ نظام سرمایہ داری کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ مادی فلسفہ حیات کی رُو سے انسان کی زندگی صرف حیوانی ہوتی ہے اور قوانین فطرت کے تابع رہتی ہے۔ یہ وہ قوانین ہیں، جن کا اطلاق دیگر حیوانات پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح انسان پر۔ اس طرح اس فلسفہ کی رُو سے انسانی زندگی کے تقاضے محض طبعی تقاضے ہوتے ہیں۔

طبعی زندگی کے تین تقاضے ایسے ہیں جنہیں بنیادی یا جبلی (INSTINCTIVE) قرار دیا جاتا ہے۔

(۱) تحفظ خویش کا تقاضا (SELF - PRESERVATION)

(۲) تغلب خویش کا تقاضا (SELF - AGGRESSION) — یہ درحقیقت تقاضا غریبی

ہی کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور

(۳) افزائش نسل کا تقاضا (SELF - REPRODUCTION)

تقاضا غریبی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر فرد، زیادہ سے زیادہ سامانِ زیست میٹھے کی فکر کرے تاکہ اس سے اس کا زیادہ سے زیادہ تحفظ ہو سکے۔ اگر اس مقصد کے حصول میں اس کے راستے میں کوئی حائل

ہو جائے تو یہ اس کا مقابلہ کر کے اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تقاضا ۲) ہوا۔ اور جب اپنے تحفظ کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر اپنی اولاد کے تحفظ کی فکر کرے۔ یہ تقاضا ۳) ہے۔ اس تصور زندگی کے ماتحت کسی فرد کے لئے، کسی دوسرے فرد کے تحفظ یا مفاد کا سوال پیدا ہو نہیں سکتا۔ کوئی حیوان کسی دوسرے حیوان کے مفاد کا تصور نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک حصول مفاد خویش کے علاوہ کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں، ہو سکتا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس فلسفہ کا ملنے والا اس سوال کا اطمینان بخش جواب کبھی نہیں دے سکتا کہ

میں دوسروں کی مدد کیوں کروں؟

آپ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا تقاضا باہمی تعاون ہے۔ یعنی میرے لئے کسی محتاج کی مدد کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر کل کو میں محتاج ہو جاؤں تو دوسرے میری مدد کریں۔ لیکن ایسا کہتے وقت یہ نہیں سوچا جاتا کہ یہی جذبہ تو وہ ہے جس کے تابع ہر شخص زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے یعنی وہ ایسا انتظام کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ یہی وہ منہا (RACE) ہے جو ایک فرد کی حالیہ ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی اسے اطمینان سے نہیں سمیٹنے دیتی۔ وہ ہر وقت سمیٹنے کی فکر میں غلطاں دیکھاں رہتا ہے اور اسی سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ زیادہ عقل دہنر (WITS) کے مالک زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتے ہیں اور دوسرے سچاپے محتاج سے محتاج تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتا ہے وہ دوسروں کے تعاون کا محتاج نہیں رہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس تعاون کو روپے سے خرید سکتا ہوں۔ اس لئے تعاون کی ضرورت اسے اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ وہ دوسروں کی امداد کرے۔ اسی کا نام سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ یہ مادی فلسفہ زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔

فلسفہ جدلیت، انسانی زندگی اور اس کے تقاضوں کا تصور تو یہ پیش کرتا ہے لیکن اس بنیاد پر معاشی نظام وہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ اشیاء کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ نرم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ۔

ہر شخص سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے اور اس میں سے اسے بقدر اس کی ضرورت کے مے کز باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے لے لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ (مادی تصورات کی رُوسے) وہ کونسا جذبہ محرکہ ہے جس کے ماتحت ایک فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں کم از کم خود لے کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیدے۔ اس قسم کا مطالبہ زندگی کے طبعی تقاضے کے خلاف ہے۔ تحفظِ خویش کی جبلت (INSTINCT) اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ اس مطالبہ کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آپ بنگالی طور پر عوام کے جذبات کو مشتعل کئے رجوش پلا کر مدہوش کرنے ہی کی دوسری شکل ہوتی ہے، اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ مفادِ خویش کو نظر انداز کر دیں۔ لیکن اسے ان کا مستقل پہنچ زندگی نہیں بنا سکتے۔ روس کا تجربہ اس کا شاہد ہے۔ انہوں نے عوام (محتاجوں اور غریبوں کو) یہ کہہ کر کہ "اٹھو اور امیروں کو لوٹ لو۔ ان کی دولت و حشمت کے مالک تم بن جاؤ گے۔" انہیں بے پناہ قربانیوں کے لئے آمادہ کر دیا۔ انہوں نے اس نشہ سے مدہوش ہو کر ہنگامی طور پر وہ کچھ کر دیا جسے دیکھ کر دنیا انگشت بدندان رہ گئی۔ لیکن جب ان کا نشہ اتر گیا تو ایثار اور قربانی کا وہ جذبہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جب ان محنت کشوں سے کہا گیا کہ تم..... زیادہ سے زیادہ محنت کرو اور اس میں سے صرف بقدر اپنی ضرورت کے لو۔ تو انہوں نے کہا کہ سرکار! پھر اس میں اور قدیم نظام سرمایہ داری میں کیا فرق ہے؟ اُس میں کارخانہ دار ہم سے زیادہ سے زیادہ محنت کراتا تھا اور ہمیں بقدر ہماری ضروریات کے دیتا تھا۔ یہی کچھ اب آپ کو زچا ہے۔ ہم ایسا کیوں کریں؟ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا نظام قائم رکھنے کے لئے دُڈھے سے کام لینا چاہا۔ یہ کچھ وقت کے لئے تو چلا لیکن پھر ناکام رہ گیا۔ کوئی نظام قوت کے بل بوتے پر مسلسل نہیں چل سکتا۔ اس سے مجبور ہو کر روس والوں کو اپنے نظام میں تبدیلی کرنا پڑی۔ یہ جو دہاں اپنے موقف سے رجعت ہوئی ہے۔ جسے چین تحریف (REVISIONISM) قرار دے رہا ہے۔ یہ کسی سیاسی دباؤ یا مصلحت کا پیدا کردہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیاد کی کمزوری کا فطری نتیجہ ہے۔ چین ابھی اس منزل میں بنیاد داخل ہوا ہے۔ اس لئے اس کا مقام یوں سمجھئے کہ وہی ہے جو لیسن کے زمانے میں روس کا تھا۔ اس لئے اسے ابھی اس تحریف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جب یہ بحران ختم ہو جائے گا تو وہاں (چین میں) بھی وہی صورت پیدا ہو جائے گی جو روس میں پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد یہاں بھی وہی ہے جو روس میں تھی۔ یہ کسی خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیاد کی کمزوری کا لازمی ثمر ہے۔ چنانچہ ماؤزے تنگ کو ابھی سے اس احساس نے ستاا شروع کر دیا ہے کہ چین کی نئی نسل کمینڈزم کے مسلک سے ملتی جا رہی ہے۔ اسے سنبھالنا چاہیے۔

اس کے لئے وہاں نوجوانوں پر مشتمل حفاظتی عسکر (RED GUARDS) کے ہاتھوں از سر نو اس انقلابی جدوجہد کو شروع کرایا جا رہا ہے جس میں سے ماؤزے تنگ اور اس کی پارٹی کے دیگر رفقاء گزرے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس تحرک (IMPETUS) سے یہ نظام جذہ قدم اور آگے نکل جائے لیکن اس سے اسے استحکام اور بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کی بنیادی کمزوری ہے جو خارجی محرکات سے رفع نہیں کی جاسکتی۔

اس کے برعکس، قرآن کا فلسفہ حیات یہ ہے کہ

(۱) انسان کی زندگی محض طبعی زندگی نہیں۔ انسان جسم کے علاوہ ایک اور شے سے بھی عبارت ہے، جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) مقصد زندگی جسم کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ہے اور ذات کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی۔ اگر ان دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ نہ ہو تو ہوا المراد۔ لیکن اگر ان میں کسی وقت ٹکراؤ ہو جائے تو پھر ذات کے تقاضوں کو جسم کے تقاضوں پر ترجیح دیکھائی گئی۔

(۳) ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اس کی مستمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے اور اس طرح جسم کی موت کے بعد زندہ رہ کر آگے بڑھتی اور مزید ارتقائی منازل طے کئے چلے جاتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۴) جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ خود اپنے استعمال میں لائیں۔ مثلاً آپ کے جسم کی پرورش صرف اس شے سے ہوگی جسے آپ خود کھائیں گے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیں۔ بالفاظِ دیگر جسم کی نشوونما "لینے" سے ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما "دینے" سے۔ قرآن کے الفاظ میں — اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالًا یَّتَرَكِیْ (۱۲۰)۔ یعنی اس شخص کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے جو اپنی چیزوں کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے۔

یہ ہے وہ فلسفہ حیات جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ اس کے معاشی نظام کے اصولی خط و خال یہ ہیں:

(۱) خدا نے سامانِ زیست تلم نوع انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس لئے

ذرائع پیداوار کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا خدا کے مقابلہ میں دوسرے خدا

کھڑے کر دینے کے مراد ہے۔

(۲) چونکہ اس مقصد حیات انسانی ذات کی نشوونما ہے اور وہ اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ ہاں دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ دے۔ اس لئے اس نظام میں ہر فرد کی خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت سے کمائے۔ اپنی کمائی کے ماہل میں سے اپنی بنیادی طبیعی ضرورت پوری کرنے کے بعد باقی سب دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے یَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ﴿۹۱﴾ مسئلہ العُشْر ﴿۹۱﴾ — یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔ تاکہ اس سے اس کی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو جائے۔ اس عمل (PROCESS) کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس وقت زکوٰۃ کا مفہوم صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ سرمایہ دار جس قدر جی چاہے سمیٹے چلے جائیں لیکن اس میں سے اڑھائی فی صد خیرات کر دیں۔ لیکن قرآن کی رو سے اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ زکوٰۃ کے معنی نشوونما ہیں۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں — دوسروں کی نشوونما کا سلمان بہم پہنچانا۔ یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے (۹۲) اس میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا موقع آ پڑے تو وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے (۹۳)۔ وہ یہ کچھ کسی خارجی دباؤ یا سیاسی مصلحت کے ماتحت نہیں کرتا۔ یہ اس کی ذات کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں وہ زیادہ سے زیادہ اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (یعنی زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتے جانے) کا جذبہ محرک، حیات آخرت پر ایمان کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا۔ (۹۴)۔ یہ صرف اسی تصور حیات کے ماتحت ممکن ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ (دوسروں سے مراد اپنی جماعت کے افراد ہی نہیں، بلکہ پوری کی پوری نوع انسانی ہے)

اور جب اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کے لئے دیدیا جائے گا تو فاضل دولت (SUR - PLUS - MONEY) — جو نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے — کسی کے پاس رہے گی ہی نہیں نہ ہی جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوگا، نہ ہی روپیہ سیٹھنے کے لئے باہمی دوڑ (RACE) ہوگی۔ اس میں جو منافست (RACE) ہوگی، وہ زیادہ سے زیادہ کام کر کے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو

دینے کے لئے ہوگی۔ (پیش)

یہ ہے وہ فلسفہ حیات جس کی بنیادوں پر ترآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ان ہر دو فلسفہ میں سے کونسا فلسفہ ایسا ہے جس کی بنیادوں پر وہ نظام قائم رہ سکتا ہے جس کا تصور کمیونزم پیش کرتی ہے۔ وہ صرف ترآن کے فلسفہ حیات کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔

—————

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، فلسفہ جدلیت میں دوسرا شخص یہ ہے کہ اس میں متانوں (LAW OF CONTRADICTION) کے علاوہ کسی متان، کسی تصور کسی نظام کو غیر متبادل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کا تصور یہ ہے کہ متانوں تضاد کی رُو سے ایک نظام ظہور میں آ جاتا ہے۔ پھر اس میں اس کی ضد کھڑی ہو جاتی ہے اور دونوں میں تضاد شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد وہ پہلا نظام غلوب ہو جاتا ہے اور دوسرا غالب آ جاتا ہے۔ پہلے نظام کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے نظام کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گردش دولا بی اسی طرح جاری چلی آرہی ہے۔ اسی طرح جاری رہے گی۔ اس وقت اس گردش کی رو سے، سابقہ نظام سرمایہ داری پر اس کی ضد (نظام سوشلزم) غالب آ رہا ہے۔ اس کی اگلی منزل کمیونزم ہوگی) اب اسے محض اتفاق سمجھئے کہ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب اس نظام کے غلبہ کی باری ہے جو مزدوروں اور محنت کشوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس میں نہ مارکس کی فکر کا کوئی دخل ہے، نہ لینن کی عملی کارروائی کا۔ نہ روس کا کوئی کمال ہے، نہ چین کا اعجاز۔ — تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رو سے ایسا ہونا تھا۔ ایسا ہو رہا ہے اس کے بعد جب گردش کا دوسرا رخ آئے گا تو یہ نظام مٹ جائے گا اور اس کی جگہ اس کی ضد کوئی دوسرا نظام لے لیگا۔ اس وقت روس اور چین تو ایک طرف، ساری دنیا کے انسان مل کر بھی چاہیں کہ اس ختم کئے علاؤ معاشی نظام کو برقرار رکھ لیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت اگر نظام سرمایہ داری مٹ رہا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ نظام عدل و انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی اور اس کی جگہ سوشلزم کا نظام برسر اقتدار آ رہا ہے تو یہ بھی اس لئے نہیں کہ یہ نظام نوب انسان کے لئے زیادہ مفید بخش ہے۔ یہ تو صرف اپنی اپنی باری کا سوال ہے۔ اس کی باری ختم ہو رہی ہے اس لئے وہ جارہا ہے۔ اس کی باری آرہی ہے اس لئے یہ آ رہا ہے۔ کل کو جب اس کی باری ختم ہو جائے گی تو

یہ بھی چلا جائے گا اور مزدوروں اور محنت کشوں کی ہزار آہ و فغاں اور ان کے حامیوں کی لاکھ سسی و کاوش بھی اسے پرستار نہیں رکھ سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت کمیونزم کی طرف سے دنیا کے سامنے اس کا معاشی نظام پیش کیا جا رہا ہے اس کا فلسفہ نہیں۔ اس نظام کے متعلق بدلائل و شواہد بتایا جا رہا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں انسانیت کے لئے آئینہ رحمت ہے اور یہ واقعہ بھی ہے، سوال یہ ہے کہ جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے اور یہ اپنی مسند خالی کر رہا ہوگا اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے رہا ہوگا جو اس کی ضد ہوگا تو اس وقت کمیونزم کے حامی دنیا کو کیا کہیں گے؟ اس وقت ان کے تمام دلائل و شواہد جو یہ موجودہ نظام (کمیونزم) کے حق میں پیش کر رہے ہیں، سب باطل قرار پا جائیں گے۔ اُس وقت انہیں بھی اُس آنے والے نظام کی حمایت کرنی ہوگی۔ ورنہ جو درگت اس وقت نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی بن رہی ہے وہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوگا۔ اس لئے کہ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کا تصور اتنا ہی ہے تاکہ وہ جدید نظام کا ساتھ نہیں دیتے۔ جانے والے نظام کے ساتھ پیٹے ہوئے ہیں۔ اگر اُس وقت کمیونزم کے حامیوں نے اس جدید نظام کا ساتھ نہ دیا، تو وہ بھی ہی جرم کے مرتکب قرار پائیں گے جس جرم کی بنا پر اس وقت نظام سرمایہ داری کے حامیوں کو مورد الزام قرار دیا جا رہا ہے۔

پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت ماورے تنگ اپنی قوم کو کمیونزم کے معاشی نظام کی برکت کی بنا پر اس مقام تک لے آیا ہے۔ کل کو جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی تو پھر اس قوم سے کیا کہا جائے گا اور ان کے لئے وجہ جامعیت کیا چیز ہوگی؟

ہل یہ ہے کہ ماورے تنگ کا فلسفہ اُمتداد، فلسفہ جبریت (DETERMINISM) ہی کی ایک شاخ ہے جس کی رو سے انسان کی حیثیت کائنات کی عظیم مشینری میں ایک بے بس پُرزے سے زیادہ کچھ نہیں، جو مشین کی حرکت کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ یونان کی مشرک گاہوں سے ابھرا اور آج کو تباہ کر رہا ہوا مختلف بھیس بدل کر یہاں تک آپہنچا ہے۔ یہی وہ فلسفہ تھا جس سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے تنازع (آداگون) کا عقیدہ وضع کیا اور عیسائیت نے "اولین گناہ (ORIGINAL SIN) کے کلنگ کا ٹیکہ انسانیت کی پیشانی پر لگایا جو کسی کے دھوئے دھل نہیں سکتا۔ مغرب کے مفکرین اور سائنسدانوں نے عیسائیت کو تو خیر باد کہہ دیا لیکن وہ اس کے اس فلسفہ کے چکر سے نہ نکل سکے چنانچہ ان کی ہر تحقیق کا رخ ہی طرفِ جانا ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ اسی سے ہیکل متاثر تھا اور یہی مارکس

بیچارے کے اعصاب پر سوار رہا۔ اب وہی تصور فلسفہ امتداد کے روپ میں سامنے آیا ہے جس میں نظام خود بخود بدلتے رہتے ہیں اور انسان ہر آنے والے نظام کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ نہ اس کی برائیاں، کسی مرتبہ نظام کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں، نہ اس کی اچھائیاں، اس کا کچھ سنوار سکتی ہیں۔ اس کے برعکس قرآن یہ کہتا ہے کہ ایک نظام فی ذاتہ اچھا ہوتا ہے اور دوسرا نظام فی ذاتہ خراب ہوتا ہے۔ جو اچھا ہوتا ہے اس میں قائم رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جو خراب ہوتا ہے وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اچھے نظام کا معیار یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمُوتُ فِي الْأَرْضِ (۲۳۱)

جو نظام تمام نوع انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہی نظام اچھا ہوتا ہے اور اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، آیتہ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۲۳۲)۔ جو نظام سلب و نہی اور ظلم و جور پر مبنی ہوگا اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ محو و ثبات کا یہ قانون غیر متبدل ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ بات ساری وقت (TIME) کی ہے اگر انسانوں کی کوئی جماعت اس کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ تو یہ ظلم پر مبنی نظام جلد منہ جاکے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس میں وقت لگ جائیگا۔ قرآن کریم نے اس کی ایک مثال بھی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نظام جاگیر داری (FEUDAL SYSTEM) جس میں زمین کے حید و نہایت رقبے افراد کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں، ظلم پر مبنی نظام ہے یہ منہ کر رہے گا۔ خدا کے کائناتی قانون کی رو سے ایسا بتدریج ہوگا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ مِنْ أَمْثَلِهَا وَنَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللَّهُ يَخْلُكُ

لَا مُعَقَّبَ لِحُكْمِهِ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۲۳۳)

کیا یہ لوگ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو جاگیر داروں کی ملکیت سے کم کرتے جا رہے ہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جسے کوئی پتا نہیں سکتا۔ وہ بہت جلد حساب کر دیتا ہے لیکن اس کا ایک ایک ن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔

لیکن جب عہد نبی اکرمؐ میں، جماعت مومنین اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی

ہوئی، تو وہی انقلاب جسے اپنی رفتار سے ہزاروں سال میں جا کر مکمل ہونا تھا، چند سال کے عرصہ میں ظہور میں آگیا۔ عہد نبی اکرمؐ میں، زمین کو بیٹائی، یا گراہ پر دینے کی مانعیت کر دی گئی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام زمین، نظام معاشرہ کی تحویل میں آگئی۔ اس کے بعد جب اس جماعت کے جانشینوں نے اس قانون خداوندی سے اعراض برتا، تو اس قانون نے پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے چلنا شروع کر دیا اور اب یہ صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد، پھر عکلاً متشکل ہوتا نظر آ رہا ہے۔ یہی مثال دوسرے غلط نظام ہلکے حیات پر بھی صادق آتی ہے۔

یہ ہے قرآن کا پیش کردہ قانونِ خود شہادت — یہ تاریخی وجوب کی اندھی قوت کی پیدا کردہ گردشِ دولابی نہیں۔ اس میں اصول یہ ہے کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ لِيَحْيِيَ مَنْ تَحْيَا عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (پہ)۔ جو مبتلا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے مبتلا ہے، جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہتا ہے۔ اور وہ دلیل و برہان یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ نِيْعُهُمْ فِي الْاٰخِرٰتِ۔ (۱۳)

زندہ وہ رہتا ہے جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس نقطہ خیال سے بھی آپ دیکھئے کہ جبرلیط کے فلسفہ اور قرآنی فلسفہ میں سے کس میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ ایسے نظام کو قائم کر سکے اور باقی رکھ سکے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو؟

ختمِ آخر

نظام کائنات پر غور کرنے سے چند ایک اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً:۔
 (۱) صغیر ارض پر زندگی کی نمود سے پہلے ہی یہاں سامانِ زیست موجود تھا اور موجود چلا آ رہا ہے۔
 زندگی خواہ اولین جرثومہ کی شکل میں ہو اور خواہ بلند ترین حیوانی پیکر میں، جن اشیاء پر ان کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ پانی، روشنی، حرارت، ہوا، خوراک، وغیرہ۔ وہ سب کچھ ساتھ موجود رہتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی اتفاقاً وجود میں نہیں آگیا، یہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت کارفرما ہے اور سراسر حکمت پر مبنی۔

(۲) یہ سامانِ زینت ان اشیاء کا خود پیدا کردہ نہیں، کسی اور کا عطا کردہ ہے۔ یعنی جس نے انہیں زندگی دی ہے اس نے سامانِ زندگی بھی پیدا کر دیا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:-

وَمَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱)

زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں۔

(۳) صوفی ارض پر کوئی شے (انسان کے علاوہ) ایسی نہیں جو سامانِ زینت کو انفرادی ملکیت

میں لے بیٹھے۔ وہ صرف اپنی ضرورت پوری کرتی ہے۔ — وَكَأَيُّنَ مَلِكٍ ذَا بَيْتٍ لَا يَحْتَسِبُ

رِزْقَهَا۔ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ۔ (۱۲)

اپنا رزق اپنی بیٹھ پر لاوے لاوے پھرتے ہیں۔ سامانِ زینت، مادہ، ارض پر تمہارے لئے اور

ان کے لئے بکھرا پڑا ہے۔

ان میں سے جو ذی حیات رزق کا ذخیرہ بھی کرتے ہیں (مثلاً چیونٹیاں یا شہد کی مکھیاں وغیرہ)

تو وہ بھی ان سب کی اجتماعی ضرورت کے لئے ہوتا ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال وہاں بھی نہیں ہوتا۔

(۴) انسانوں کے لئے بھی اسی انداز کی زندگی بسر کرنا منشاءِ فطرت تھا۔ اسے قرآن (تھو

آدم کے تمثیلی رنگ میں) اس زمین پر جنت کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ زندگی جس میں کیفیت

یہ ہو کہ:

إِنَّ لَكَ أَلًا تَجُوعُ مِنْهَا وَ لَا تُغْنَى وَ أَنتَ لَا تَظُنُّوْهُ فِيهَا

وَ لَا تَضَعُ (۱۳)

اس میں تجھے نہ بھوکے رہنے کا غم ستائے نہ پیاس پریشان کرے۔ نہ اس میں لباس

کے لئے متفکر ہونا پڑے، نہ مکان کے لئے سرگرواں۔

اس میں کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ وَ كَلَّا مِنْهَا سَعِدًا حَيْثُ شِئْتُمْ۔ (۱۴)۔ جہاں

کسی کو ضرورت ہو، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔ ذرائع رزق ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔

سَوَاءٌ لِّلْمُسْلِمِينَ۔ (۱۵)

(۵) لیکن انسان کی مفاد پرستیوں نے، سامانِ زینت پر انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کر کے اس

جنت کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ اس لپٹی کو دستہ آں نے بیوہ آدم سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

ہر فرد، دوسرے کا دشمن ہو گیا۔ (وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوًّا۔ (۱۱۱))۔

(۶) اب مقصودِ نظرت یہ ہے کہ انسانی دنیا میں پھر سے وہی جہنمی زندگی کا نقشہ قائم ہو جائے اور اس طرح "جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے جنت کو پالے" خدا کا کائناتی قانون، اسی نقشہ کو قائم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کے مطابق) بہت سست ہے۔ اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہے۔

اس رفتار کو تیز کرنے کے لئے آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعی، حضراتِ انبیاءِ کرامؑ وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ وہ اپنے حلقہ اثر میں اس نقشہ کو قائم کرتے۔ یعنی مسلمان زیت کو تمام افرادِ انسانیہ کی ضرورتاً کو پورا کرنے کے لئے عام کر دیتے۔ (اسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے)۔ لیکن ان کے بعد مفاد پرست گروہ پھر آگے بڑھ آتا۔ اور اس نقشہ کو الٹ کر پھر سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیتا۔ یہ کچھ ایسے لوگوں کی مدد سے ہوتا، جو مقدس لبادوں میں ملبوس ہو کر عوام سے کہتے کہ منشاءِ خداوندی بھی یہی ہے۔ انہیں مذہبی پیشوا کہا جاتا ہے۔

آخری مرتبہ "خدا کے آخری نبی" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں متشکل ہوا اس کے کچھ عرصہ بعد مفاد پرست گروہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی شکل میں پھر آگے بڑھ آیا۔ انہوں نے ماضی کا نظامِ سرمایہ داری قائم کر دیا اور خدا کا کائناتی قانون پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔ اب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لئے اب جنتِ ارضی کی تشکیل کی دو صورتیں تھیں۔

(۱) جس امت کو اس آخری نبی کے پیغامِ رقرآن کا وارث قرار دیا گیا تھا، وہ اس نظام کو اپنے دست و پاؤں سے قائم کرتی اور باقی رکھتی۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتی۔ تو

(ب) زمانے کے تقاضے انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے۔ اس شکل میں ویشواری یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بیک جست اپنی منترہ صورت میں سامنے نہیں آ سکتا۔ ابتداءً بڑی دھندلی سی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور پھر تجرباتی طریق سے بتدریج اپنی منترہ شکل تک پہنچتا ہے۔

ہم (دائیں کتاب اللہ) نے اپنا فریضہ ادا کیا، تو اس انقلاب نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ عصرِ حاضر میں اس کی پہلی نمود مارکس کی فکر میں سامنے آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے سینے میں قلبِ حساس تھا، جو مظلوم و مقہور انسانوں کی حراں نصیبی پر۔ جن پر بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں

نے رزق کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ خون کے آنسو روتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دکھ دور ہو جائیں۔ وحی کی حقیقی روشنی (سترانی تعلیم) اس کے سامنے نہیں تھی۔ اس کے سامنے عیسائیت تھی جو لفظ ان ایٹم کے دکھوں پر آنسو بہانے کی مدعی ہونے کے باوجود، عملاً اس نقشہ کو قائم رکھنے کا موجب تھی جس سے یہ تمام دکھ وجود میں آتے ہیں۔ جب آپ خدا پرستی کے لئے دنیا کو تیاگ دینے یا اسے قابل نفرت سمجھنے کو اولین شرط قرار دیدیں اور مظلوموں کے دکھ دور کرنے کے لئے عدل کے بجائے رحم کی بھیک مانگیں، تو مستبد قوتیں و مذہباتی پھر سگیں۔ انہیں ظلم و ستم سے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مارکس نے اس حقیقت حال پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان چیرہ دستیوں کا بنیادی سبب مذہب کا تصور ہے۔ اس لئے اس نے مذہب کو ان ایٹم کا اولین دشمن قرار دیدیا۔ اگر اس کے سامنے ”مذہب“ کے بجائے ”دین“ (فکران کریم) ہوتا تو وہ اس نتیجہ پر کبھی نہ پہنچتا۔

روس میں بھی، اسی عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ اس لئے لینن بھی خدا کے متعلق، اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا تصور، مفاد پرستیوں کا پیدا کردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خدا پر ایمان نہ رہے تو انسانی ذات وحی حیات آخرت پر ایمان خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

چین میں مذہب کے سلسلے میں حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ وہاں، ایک چھوڑ، تین تین متدیم مذاہب مروج تھے۔ اور تینوں کے تینوں توہم پرستی کے مظاہر، کنفیوشس ازم، کی تعلیم خالصتہً اسلاف پرستی تھی جس میں جمود و تقلید سب سے بڑی نیکی اور تغیر و صلاح کا تصور سب سے بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ (بعینہ اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں مذہبی پیشوا ایٹم تقلید کو عین دین پیش کر تے ہیں اور ہر تغیر اور جدت کو جہنم کے عذاب کا موجب قرار دیتی ہے) طاؤ ازم، گیان و صیان میں مست رہ کر دنیا تیاگ دینے کی تعلیم دیتا تھا۔ بدھ مت اس سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اس میں منتہائے زندگی نروان حاصل کرنا ہے جس سے مراد اپنے آپ کو تا طبتہ فنا کر دینا ہوتا ہے۔ ماؤزے تنگ کے سامنے یہ مذاہب تھے۔ اس لئے اس کا رد عمل ظاہر ہے۔ اس نے فکری طور پر ہیگل، بلکہ مارکس سے بھی اختلاف کیا۔ لیکن مذہب کے خلاف اس کی شدت ان سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اتنا بڑا انقلابی ذہن جمود و تعطل کے اس جذام کو کیسے گوارا کر لیتا؟ لیکن چونکہ دین اس کے سامنے بھی نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بھی اپنے فلسفہ کی بنیاد اپنے قیاسات ہی پر رکھی۔ وہ اس کے سوا کچھ بھی کیا سکتا تھا۔

یہ ہے وہ فلسفہ جس کا اجمالی تعارف ہم نے شروع میں کرایا تھا اور جس کی بنیادوں پر وہ نئے عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی بنیادوں پر یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ جب چین میں اتالیقون الاڈون (PIONEERS) کی موجودہ نسل ختم ہو جائے گی تو پھر آئندہ نسل کے لئے، اتنی بڑی قربانیوں کے لئے کوئی جذبہ محرکہ نہیں رہے گا۔ اور چینی انقلاب بھی اسی تخریبیت (REVISIONISM) پر مجبور ہو جائے گا جس کا قصہ وہ اس وقت روس کو دیر رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے روس اور اس کے بعد چین کی ان انقلابی جماعتوں نے کائناتی قانون کی تائید کے لئے ہاتھ اٹھا کر اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے انقلاب کی اساس دنیا دہ حکم نہیں، اس لئے یہ انقلاب ایک جنگی حادثہ بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کے بعد، اگر کائناتی قانون نے اپنے حساب سے "ایک دن" کی بھی مزید "تاریخ ڈال دی" تو انسانیت کو صدیوں تک پھر سرمایہ داری کے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس وقت، اس معاشی انقلاب کو قرآن کی اساس محکم مل جائے تو پھر نظام سرمایہ داری سر نہیں اٹھ سکے گا۔ اور جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فرد دس گم گشتہ کو پھر سے پالے گا۔ اقبال نے نیچے کے فکر کی بلندی اور اس کی بنیاد کی پستی کو دیکھ کر کہا تھا کہ ۷

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں

تو اقبال اس کو سمجھتا مفتاح کبریا کیلئے ہے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُس مجذوب فرنگی سے کہیں زیادہ ضرورت آج اس "سالک چینی" کو مقام کبریا سے آگاہ کرنے کی ہے۔ یہ اس لئے کہ مقام کبریا کے راستے میں جو خاردار جھاڑیاں دامنگیر ہوتی ہیں چین نے انہیں راستے سے الگ کر دیا ہے۔ وہاں پادشاہی، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری کی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور یہی وہ خاردار جھاڑیاں ہیں جو انسان کو "خدا" تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ یہ وہ حصہ آف ہے جسے طے کئے بغیر انسان اللہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد دین کی سزائے کی سرحد پر کھڑا ہے۔ اگر اس وقت اُسے اس مقام کی نشاندہی کر دی جائے اور وہ اس راستے کو اختیار کرے، تو صرف چین ہی نہیں، عالمگیر انسانیت اس جہنم سے بچ سکتی ہے جس میں اسے بصورت دیگر معلوم کتنے غریبے تک اور مبتلائے مصائب رہنا پڑے اور اس سے نکلنے کے لئے خدا جانے اسے کتنی خون کی ندیاں پیرنی۔ اور آگ کے دریا عبور کرنے پڑیں۔ مسلم ممالک میں سے اس وقت کوئی بھی اس کے لئے

آئندہ نظر نہیں آتا، کہ وہ قرآن کے انقلابی پروگرام کو اپنے ہاں عللاً متشکل کر دے۔ یہ مالک ابھی حصہ لے رہی ہے نہیں نکلے، حصہ الٹ تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا، کہ اس سے اسلام اس ٹپتے کو سٹا سکے گا جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر دیا تھا۔ لیکن یہاں جس تیزی سے مذہبی پیشوائیت اپنا تسلط جاری ہے اس کے پیش نظر یہاں دین کے نمک کے اسکانا محض پیچھے جا پڑے ہیں۔ یاد رکھئے! مذہبی پیشوائیت کا اقتدار نظام سرمایہ داری کے مائے کا پیانہ ہوتا ہے ان درونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کے بڑھنے سے دوسری بڑھتی ہے اور ایک کے گھٹنے سے دوسری گھٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں دین کے انقلابی پروگرام کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں خواہ وہ وحی کی راہ نمائی میں وجود کوش ہو، اور خواہ زمین کے تقاضوں سے۔ یہ وجہ ہے، جو میں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآن کا پیغام کسی طرح ماؤزے تنگ تک پہنچ جائے اور وہ اسے سمجھنے پر آمادہ ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے نور انسان کی تقدیر بدل جائے اور اقبال نے حکیم سنائی کے اس مصرعہ کے اندر چھپی ہوئی جس، قیامت پیش از قیامت، کا خواب دیکھا تھا، جنت سے نکلا ہوا آدم اس خواب کی تعبیر کو اپنی آنکھوں کے سامنے متشکل دیکھ لے۔ یہ خواب، اس نظم کے ایک بند میں مرقوم ہے جسے علامہ نے حکیم سنائی کے مزار کے سر پہانے کھڑے ہو کر کہا تھا۔ یعنی

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے مغل نے

یہاں ساقی نہیں پیدا۔ وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی!

وہ بندے فقر کھتا جن کا ہلاک قصیر و کسری!

یہی شیخ حرم ہے جو چیرا کر بیچ کھاتا ہے

حکیم بو ذرا و دلق اولیس و چا در زہری

حضور حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی

یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر دے پیدا

نہ آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے

”گرفت چنیاں احرام و سخی خفتہ در بطن!“ (یعنی حکیم سنائی کا شعر)

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تاریخ نے ہمیں ایک عجیب مقام پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں جن کا نظام سرمایہ دارانہ ہے لیکن وہ عیسائی یا یہودی ہونے کی جہت سے، اپنے آپ کو خدا پرست کہتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی خدا پرستی کو خدا پر ایمان و تراسی نہیں دیتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن کے تراشیدہ یا اپنے مذہب کے پیش کردہ خدا کے تصور کے مطابق خدا کو ماشیں۔ خدا پر ایمان کے یہ معنی ہیں کہ آپ خدا کے اس تصور پر ایمان رکھیں جو تصور اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے۔ اور وہ تصور قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کریم نے اہل کتاب سے بھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا پر ایمان لائیں۔ لہذا قرآنی نقطہ نگاہ سے، نہ اہل مغرب خدا پرست ہیں اور نہ ہی ان کا نظام، قرآنی نظام کے مائل ہے۔ بلکہ وہ اس کی ضد ہے۔ ان کی طرف سے یہ نعرہ کہ

”دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور اشتراکیت کے خدا نرا موش نظام کے خلاف متحدہ محاذ

بناؤ“

محض ایک سیاسی نعرہ ہے جو مسلم اقوام کو اپنے دام تروریہ میں پھنسانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ دوسری طرف کمیونزم ہے جس کا نظام تو قرآنی نظام کے مماثل ہے لیکن اس کا فلسفہ حیات قرآنی فلسفہ زندگی کی نفی ہے۔ اس لئے وہ بھی قرآنی نقطہ نگاہ سے مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ جس طرح قرآن اپنے نظام کو فلسفہ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح کمیونزم بھی اپنے معاشی نظام کو اپنے فلسفہ زندگی سے جدا نہیں کرتی۔ کمیونسٹ کے لئے مذہب یہی ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام کو ایک وحدت کی طرح تسلیم کرے۔ یہ وجہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ نہ ایک کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ ایک مسلمان کمیونسٹ۔

تیسری طرف ہم مسلمان ہیں جن کے ہاں قرآن کریم کے الفاظ تو بے شک محفوظ ہیں لیکن عملانہ ہمارا نظام قرآنی ہے، نہ فلسفہ زندگی قرآنی۔ ہم بھی درحقیقت اسی مقام پر ہیں جس مقام پر مغرب کے اہل کتاب ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان کے پاس خدا کی راہ نمائی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں اور ہمارے پاس وہ رغلانوں میں لپیٹی ہوئی، محفوظ رکھی ہے۔

ان حالات کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ”اگر اشتراکیت کے ساتھ خدا کو شامل کر لیا جائے

تو وہ اسلام کے مسائل ہو جاتی ہے۔ تو یہ فارو لا کار و بان انسانیت کے لئے منزل مقصود کی صحیح نشاندہی کرتا ہو۔ لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے مسلم مالک ابھی آمادہ نہیں۔ وہ اس تصور حیات سے ہنوز بہت دور ہیں۔ لیکن دین خداوندی پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں کہ وہ اسے چلانا چاہے تو وہ چل کے اڑے اگر وہ اسے قفل پارینہ بنائے تو دنیا بے بس و بیہوش ہو جائے گا۔ یہ تمام نوع انسان کی مشترک ورثہ ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی اسے اپنانا چاہے، دین اسی کا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر مخاطب قوم سے کہتا ہے کہ بن کا نقشہ تمہارے سامنے آچکا ہے۔ فَاَنْ تَوَكَّلُوْا..... يٰسَيِّدِيْ رَّبِّ اَوْمًا غَيْرُكُمْ اگر تم اسے اپنانا چاہتے ہو تو ہوا ہوا۔ لیکن اگر تم اس سے روگردانی چاہتے ہو تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ جو اسے اپنالے گی۔ وَلَا تَقْصُرُوْا عَنْهُ سُبُوْحًا (۱/۱۰۷)۔ اور تم اس کا کچھ لگاؤ نہ سکو گے۔ دین ایک خاص فلسفہ حیات کے مطابق نظام زندگی تشکیل کرنے کا نام ہے۔ جو قوم بھی ایسا کرنا چاہے دین لپک کر اسے سینے سے لگا لے گا۔

اٹھلے چوڑھا کر ہاتھ میں ساغرائی کلبے

لہذا یہ حالات موجود و کشادگی راہ ایک ہی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اشتراکی ذہن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جس فلسفہ پر دنیا اپنے سماجی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے اس کی بنیادیں اس شمار کے بوجھ کی تحمل نہیں ہو سکتیں۔ یہ عمارت قرآنی فلسفہ حیات کی بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتی ہے۔ تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے۔ اس وقت اشتراکی ذہن کا سب سے بڑا نمائندہ ماؤز سے تنگ ہے۔ چین کے ستارہ دو نفوس اس کی فکر کی پرستش کرتے ہیں اور چین سے باہر کس قدر اذ بان اس فکر سے بالواسطہ متاثر ہیں۔ اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ پوزیشن دنیا میں اس وقت کسی اور معرکہ کو حاصل نہیں اور نہ ہی عملی اعتبار سے اس وقت کوئی دوسرا انسان ایسا نظر آتا ہے جو اسلام جیسے عالمگیر انقلاب کو اپنے ہاں عملاً نافذ کرنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس ایک ذہن کو منکر میں قرآنی تبدیلی آجائے تو عالم انسانیت میں اس سے بڑا انقلاب اور کونسا ہو سکتا ہے اس سے فی الواقع دنیا میں قیامت سے پہلے وہ قیامت برپا ہو سکتی ہے جس کا تصور بتال نے پیش کیا تھا اور اس نے "پاسباں مل گئے تعب کو صنم خانوں سے" کی جوتلمی حقیقت بیان کی تھی، جو عجیب کہیں کی تائید میں ایک اور شہادت دنیا کے سامنے آجائے۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ ہمارے ہاں (ہر کمزور قوم کی طرح) یہ ذہنیت چلی آرہی ہے کہ دنیا میں جو نہی کسی بڑے آدمی نے غلبہ و اقتدار حاصل کیا تو اس کے متعلق یا تو ہم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ”وہ اندر سے مسلمان ہی ہے“ اور یا اس کے مسلمان ہونے کی دعائیں مانگنے لگ گئے۔ لیکن میرے اس خیال کی فکر یہ ذہنیت نہیں۔ میں اس نتیجہ پر چند دلائل و وجوہات کی بنا پر پہنچا ہوں: انہیں میں نے تفصیل سے پیش کر دیے ہیں۔ اگر ارباب فکر و نظر کو اس تجزیہ حالات میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کی نشاندہی کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔ میری قرآنی بصیرت نے بہر حال مجھے اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے اور وہی مجھے اس پر بھی مجبور کر رہی ہے کہ میں اسے ارباب علم و بصیرت کے سامنے کھلے الفاظ میں پیش کر دوں۔ کیونکہ کتمان حقیقت قرآن کی رو سے انسانیت کے خلاف جرم عظیم ہے۔



آخر میں میں اتنا اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سابقہ صفحات میں ماؤزے تنگ کی فکر یہ جو تنقید کی گئی ہے تو اس سے اس کی تنقیص مقصود نہیں۔ قرآن کریم عقل انسانی کا مقام بہت بلند قرار دیتا ہے۔ اور اس سے کام لینے کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے جو شخص بھی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کے مسائل سلجھانے کی کوشش کرے گا، وہ ہمارے نزدیک مستحق تحسین و ستائش ہے۔ لیکن (وہ کہتا ہے) جس طرح (مثلاً) انسانی نگاہ کی ایک حد ہے جس سے آگے کی چیز سے نظر نہیں آسکتی، اسی طرح عقل انسانی کی بھی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا نہیں سکتی۔ وحی کی راہنمائی ایک دور میں ہے جس سے عقل انسانی کی آنکھ اپنی عام حد سے بہت آگے کی چیزیں دیکھ سکتی ہے۔ ماؤزے تنگ (یادگیری معنکرین) کی حد نگاہ یقیناً عام انسانوں سے زیادہ وسیع ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اسے وحی کی راہ نمائی کی دور میں مل جائے تاکہ وہ راستے کے ان مقامات کو یقین کی آنکھ سے دیکھ سکے جسے اس وقت وہ محض قیاس کی لکڑی سے ٹٹو لیتا ہے۔ اس لئے غلطی کھا جاتا ہے۔ ہم اگر اس وقت اس زیادہ دور کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں تو اس میں ہماری آنکھ کا کوئی کمال نہیں۔ یہ اس دور میں کی خوبی ہے۔ یہ دور میں اگر اس معنکر کے ہاتھ میں دیدی جائے تو وہ ہم سے بہت زیادہ آگے دیکھ سیکے گا۔ اس لئے خود بھی راستے کے خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور کاروان انسانیت کو کبھی بحفاظت اس کی منزل تک لے جاسکے گا۔ یہ ہے میری آرزو کا مقصود، اور میری سعی و کوشش کا مطلوب۔

ایک خط اور اس کا جواب

ذیل کا خط بغور ملاحظہ فرمائیے۔

بمذہب ایک سال سے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کر رہا ہے اور طلوع اسلام بھی برابر زیرِ نظر ہے۔ آپ نے قرآن حکیم کی تفہیم جس نہج پر دی ہے اس کی بے اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ تاریک خیال ملا کا آپ سے سیخ پا ہونا ایک قدرتی اور فطری امر ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ قرآن حکیم نظامِ ربوبیت کا داعی ہے۔ اور حضرت علامہ اقبالؒ مرحوم کا کلام بھی آپ کے مہنوا ہے۔ چونکہ نظامِ ربوبیت اپنے خواص میں انقلابی نظریات کا ہے اور ملازمِ فطرت اس کی ضد ہے۔ بقول کے۔

ہرگز مگو کہ شیخ شود اہل الفتلاب

بادر ممکن کہ ہست در عالم غراب سُرخ

پرویز صاحب: نظامِ ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائعِ حصول میں مجھے اختلاف ہے لہذا اپنے سوال کا جواب یہ تو طلوع اسلام چاہتا ہوں۔ اگر جواب مذہبی عقیدہ مندی کے جذبات سے فراہم کر دیں اور تاریخی جواب و حقائق کا حاصل ہو تو میرے لئے زیادہ مؤثر و مسکت ہوگا۔

قدیم اشتراکی نظام سے لے کر آج تک تدریجی ادوار میں ارتقائی قوانین قدرت جاری و ساری ہیں۔ مادی تاریخ ان ادوار کا تعین کرتی چلی آرہی ہے۔ مذہب کی دخیل کاری مادی تاریخ کے عہد میں دست انداز نہیں ہوئی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے متکثری اور ایک مخصوص خطہ میں ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جو سراسر اپنی فطرت کے لحاظ سے ہر وقت کے مادی دور سے جو اس زمانہ کا طبعی تاریخی دور تھا الگ تھلگ تھا۔ یہ پیغمبر اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور تاریخی غور جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن شارع اسلام کے رخصت ہوتے ہی چند ماہ و سال کے اندر یہ اسلامی نظام جو تاریخی لحاظ سے قبل از وقت تھا ختم ہو گیا اور ”مستثنیات“ واقعات کی تربیت میں جگہ پا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے رسول پاکؐ سے نفسِ نفیس تربیت پائی تھی۔ اور قیصرِ کسریٰ کو اس واسطے ختم کیا تھا کہ یہ غیر صالح نظام کے نایندہ ہیں۔ چند ہی روز کے بعد اسی غیر صالح نظام کے شہنشاہ بن کر جلوہ نما ہوئے اور تاریخ کا تیز رو دھارا اسی سمت ہی بہتا رہا جس سمت سے اس کو غیر طبعی طور پر موڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کیونکہ تاریخ کے ارتقائی مادی قلعہ منہ ہی تاریخ سے عبارت ہیں۔

یہ امر بالکل غیر طبعی اور غیر فطری ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے اور شیر خوارگی۔ بچپن، عفتوان، شباب، شباب اور کہولت کے دوروں سے گزرے ہی نہ۔ ایسا ہونا ناممکنات سے ہے کیونکہ انسان کو ان تمام ارتقائی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور بعینہ ہی ارتقائی قوانین انسانی معاشرہ میں بھی موجود ہیں۔ یہیں منزل بمنزل ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونا پڑتا ہے جیسے بروت کو پانی اور پانی کو بھاپ میں تبدیل ہونے کے لئے انقلابی عملوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ان تینوں یعنی بروت، پانی، اور بھاپ میں اصل ہستی پانی کی ہے جس نے مختلف مدارج میں پہنچ کر اپنی اصل ہستی کو فنا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے خواص اور صورت نوعیہ میں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ بعینہ اسی طرح یہ کارخانہ زندگی ابتدا میں پھسل پھسل کر اور رینگ رینگ کر چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ تاریخی عوامل کے تھپیڑوں کو سہنے کی اپنے اندر قابلیت پیدا کرتا ہے۔ یعنی تنازع للبقا کی قوتیں برصتی جاتی ہیں۔ اور اس کے اندر روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی طرح یہ کارواں اور تاریخی ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور اب یہ اٹیم اور برقیات کے دور میں ہے۔ پانی کی طرح زندگی کے ان مختلف قافلوں کی اصل بھی مادی تاریخ ہی ہے

جو مختلف دوروں میں اپنی صورت نوعیہ اور خاص تبدیلی کرتی جا رہی ہے۔ اگر کسی سوسائٹی یا مذہب کے خیالات کا رجحان ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ان اعمال و افعال کی تجدید بھی کرتا جاتا ہے جو نئے مادی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں تو ایسا نظام ترقی پسندانہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ مادی تاریخ کے یہ سائنٹفک اصول ہیں جن کو نہ ماننا حقیقت کا منہ چڑا رہا ہے۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ہم جدید تاریخ کے سائنٹفک مطالعہ کے بغیر مادی تقاضوں اور عوامل کا درست تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اور صرف مذہبی پیشوا اس قابل ہیں کہ اپنے مذہبی علوم کے سہارے سے تاریخ کا پیہر ہمیشہ آگے کو لے جائیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ان کی تاریخ رجعت پسندانہ تاریخ ہے۔ ”آئین نو سے ڈرنا۔ رسم کہن پر اڑنا۔ منزل ہی کہن ہے قوموں کی زندگی میں“ چونکہ قوموں کا ہر فعل خواہ وہ وقتی تقاضے کی مصیحت پر مبنی ہو وہ مذہب کی اصطلاح میں ”سنت“ کہلاتا ہے جس کو ترک کرنا مذہب کی اصطلاح میں ”کفر“ تصور کیا جاتا ہے خواہ پیغمبر کے اس فعل کی افادیت صرف وقتی طور پر ہو اور بعد کے حالات میں اس فعل پر عمل کرنا سلسلہ ناقابل عمل ہو۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر کو ان کی خلافت کے عہد میں یہ مشورہ دیا گیا کہ آپ خزانہ عامرہ کو ہر شام خالی نہ کر دیا کریں۔ بلکہ خزانہ کو باقاعدہ جمع کریں۔ اور کارکنان حکومت کی باقاعدہ ماہانہ تنخواہ مقرر فرمائیں تو آپ نے جواب دیا کہ میں سنت رسول کے خلاف نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ حال یہ ایک امر واقع ہے کہ پیغمبر اسلام جن خطوط پر معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے وہ نہ ہوا اور معاشرہ مادی تاریخ کے عوامل کی سنت کا پیروکار رہا۔ اور مذہبی پیشواؤں نے اس وقت کے صاحب اقتدار طبقہ کی خواہشات کے مطابق مواد نکالنے کا کام سنبھال لیا جو آج بھی جاری ہے۔

محرم پر دیز صاحب! آپ اس بستی یعنی پاکستان میں واحد شخص ہیں جو فرماتے ہیں کہ **اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ** اور نظام روپیہ بیت قائم ہونا چاہیئے دوسری طرف شرق تا غرب تمام مولوی صاحبان ایک زبان آپ کے خلاف تکفیر کے فتوے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اسلام کا ماحصل صرف چار نکاتوں تک جانتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر اسلام کا نام لے کر جاگیر داری نظام کا جواز نکالتے ہیں۔ اور اپنی کتاب ”سود حصہ دوم“ میں فرماتے ہیں۔ ”ایک مربع گز سے لے کر اگر کسی شخص کے قبضہ میں اس قدر رقبہ ہو جس کی کوئی حد ہی مقرر نہ ہو اگر جائز طریقہ سے قابض ہے تو شریعت کی رو سے درست ہے“ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ زمین اللہ کی ہے اس پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

وہ خدایا یہ زمین تیری نہیں میری نہیں

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

آپ بھی جواز اپنے دعوے کا قرآن ہی سے نکالتے ہیں اور مودودی صاحب بھی قرآن ہی سے۔

جن کے نزدیک یہ زمین پاکستان کھڑوؤں، دولتوں اور ٹوانوں کی ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!

کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ حصولِ پاکستان سے پیشتر کیا وعدے کئے تھے کہ پاکستان بن جانے

کے بعد آپ کے لفظوں میں نظامِ رُبوبیت قائم کیا جائے گا۔ اور حضرت عمرؓ کا درلوٹ آئے گا۔ عوام نے

ہولناک اور بے مثال قربانیاں دیں۔ پاکستان بن گیا۔ سولہ سال گزر گئے اور ان سولہ سالوں میں

ہر صدرِ مملکت اور ان گنت وزیروں نے اور مولوی صاحبان نے یہی کہا کہ ہمارا نظام اسلامی ہونا چاہیے۔

لیکن مادی تاریخ کہتی ہے کہ نہیں۔ نظامِ صرف میری سنت پر چلنا چاہیے۔ آپ غور فرمائیں کہ ہماری

حکومت اور علمائے دین دونوں فرقہ پرستی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام ہونا چاہیے لیکن یہ دونوں فرقہ پرست

نظام بنانے سے عاجز ہیں۔ اگر آپ نظامِ رُبوبیت پیش کرتے ہیں تو علمائے دین کے نزدیک کائنات

کھڑتے ہیں اور مہر خانہ کعبہ سے بھی اسلامی نظام کی آواز نہیں آتی ہے۔ بلکہ عربوں کا آج ایک ہی محبوب

نعرہ ہے۔ (عرب نیشنلزم زندہ باد) لیکن آج زمین میر و سلطان سے بیزار ہو رہی ہے اور ہمارے

ملک کا جاگیرداری نظام عالمِ نزع میں ہے۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لئے تاریخ کے مادی اصولوں

ہی سے راہنمائی لینی چاہیے اور اپنے ارد گرد کے حالات اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

نظامِ رُبوبیت تک پہنچنے کے لئے سیدھا راستہ یہی ہے۔



طلوعِ اسلام

ہم نے اس تفصیلی خط کو تمام اس لئے شائع کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اشتراکی فلسفہ حیات

کیا ہے؟ اور اس فلسفے سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو متعدد بار واضح کر چکے

ہیں کہ ایک چیز ہے اشتراکی نظام معاشی اور دوسری چیز ہے اشتراکی فلسفہ زندگی۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظام معیشت کی عمارت اشتراکی فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اس لئے اس نظام کو سمجھنے کے لئے اس فلسفہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعینہ جس طرح اسلامی مہج زندگی کے کسی گوشے کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی فلسفہ حیات یا نظریہ زندگی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جو نظام یوں ہی ہنگامی طور پر اپنا لیا جائے اس کی صورت کچھ اور ہوتی ہے لیکن جو نظام کسی خاص فلسفہ حیات کی پیداوار ہو اسے اس فلسفہ حیات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اس فلسفہ کا سمجھنا لایتنفک ہوتا ہے۔

۲۔ مشہور جرمنی مفکر ہیگل کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ ایک تصور (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے ایک اور تصور کی نمود ہوتی ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے تصور کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس جدید تصور کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ گردش دو لابی شروع سے آج تک جاری ہے اور اسی طرح جاری رہیگی اس عمل کا نام جدلی عمل (DIALECTICAL PROCESS) ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی قوت ہے جو اس عمل کو ایسے نظم اور ضبط کے ساتھ جاری رکھتی ہے، تو اس نے کہا کہ اس مخفی قوت کا نام ”روح عالم“ (WORLD - SPIRIT) ہے وہ اس عمل سے خود اپنی ذات کی تکمیل چاہتی ہے۔

مارکس (MARKS) ہیگل کے فلسفہ کا متبع تھا۔ لیکن اس نے ذرا آگے جا کر، ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ اس کا یہ اختلافی نظریہ خود ایک فلسفہ بن گیا۔ اس نے کہا کہ جنگ اصدا کا جو تصور ہیگل نے پیش کیا ہے وہ تو درست ہے لیکن یہ جنگ تصورات (IDEAS) میں نہیں ہوتی بلکہ نظام ہائے زندگی (SOCIAL ORDERS) میں ہوتی ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالف قوتیں وجود کو ش ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں اس نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک جدید نظام کو مسلط کر دیتی ہیں۔ جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ او یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے نظام سرمایہ داری دنیا پر مسلط تھا۔ اب اس کی جگہ اشتراکی نظام لے رہا ہے جو اس سے پہلے نظام کی ضد ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ جنگ اصدا کون سی قوت کی روح سے جاری رہتی ہے تو اس نے کہا کہ اسے تاریخی وجوب

(HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ یہ قوت اس قدر محکم اور ہیبت ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے سامنے یکسر بے بس اور عاجز ہے۔ جب یہ ایک نظام کو مستط کرتی ہے تو انسان اس نظام کو بدل ہی نہیں سکتا۔ اسے اس نظام کو مجبوراً تسلیم اور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اختیار کرنا کیا معنی؟ اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ قوت اس نظام کو فنا کرنا چاہتی ہے تو انسانوں کی کوئی تدبیر اسے بچا نہیں سکتی۔ مارکس کے نزدیک انسان کی ساری تاریخ اس کی اس بے بسی اور بیکی کی داستان ہے۔ خدا۔ وحی۔ مستقل اقدار۔ حق و باطل کا تصور اس کے نزدیک سب افسانے ہیں۔ اور ذہن انسانی کی تخلیق۔ حقیقت صرف تاریخی وجوہ کی ہے۔ مارکس کے اس نظریہ کی عملی تعبیر کا نام، "تاریخ کی مادی تعبیر" (MATERIALISTIC INTERPRETATION OF HISTORY) ہے۔ وہ اس تعبیر کو اس قدر حتمی اور یقینی قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کا رخ بدل نہیں سکتی۔

۳۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اشتراکی فلسفہ زندگی۔ اس کی روشنی میں آپ مذہب بالآخر ٹھیک تو بات صاف ہو جائے گی کہ اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس پہنچ پر سوچتا ہے۔

اسلام کا نظریہ حیات، اس فلسفہ کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حق (TRUTH) ایک ابدی حقیقت ہے، جو ذہن انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ اپنے مقام پر اٹل اور غیر متبدل ہے، اور کسی شے سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ جو تصورات حق کے مطابق ہوں وہ بنی برصداقت ہوں گے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار حق پر مبنی ہونے کی وجہ سے ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ وحی خداوندی کی رُو سے رواسطت حضرات انبیائے کرامؑ انسانوں کو ملتی ہیں تاکہ وہ ان کے مطابق اپنا نظام زندگی قائم کریں۔ جو نظام ان اقدار کے مطابق قائم ہوتا ہے اسے حق کا نظام کہا جاتا ہے اس نظام کی عملی شکل، زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ لیکن جن بنیادوں پر یہ ہوتا رہتا ہے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

جو تصورات، مستقل اقدار کے خلاف ہوں انہیں باطل کے تصورات کہا جاتا ہے جو حق کی نقیض ہے۔ ان دونوں تصورات کی باہمی کش مکش رہتی ہے اور اس کش مکش میں حق، باطل کو شکست دیتا چلا جاتا ہے اس طرح باطل آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ تاکہ آخر الامر یہ میدان چھوڑنا

اور حق کا غلبہ مکمل ہو جائے گا۔

حق اور باطل کی کیش مکش، خدا کے کائناتی قانون کی رو سے جاری ہے لیکن چونکہ اس قانون کی رفتار، ہمارے حساب و شمار کی پیمائش کے مطابق بہت سست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک دن قرآن کے الفاظ میں ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے)، اس لئے اس کشمکش کے نتائج بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخی نوشتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے اس حقیقت کی شہادت مل سکتی ہے کہ کیش مکش جاری ہے اور اس میں حق (تعمیری لقوہ حیات) باطل (تخریبی نظریہ) پر بدرجہ غالب آ رہا ہے۔

اسلام کی رو سے انسان بے بس اور بے کس - مجبور و مقہور مخلوق نہیں - یہ صاحب اختیار و ارادہ ہستی ہے اسے اس انتخاب (CHOICE) کی قوت دی گئی ہے کہ وہ اپنا نظام، حق کے مطابق قائم کرے یا باطل کے مطابق۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت حق کے مطابق نظام قائم کرتی ہے تو اس کے تعمیری نتائج مرتب ہونے کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اتنی تیز کہ کائناتی قانون کی رفتار سے جو نتائج صدیوں میں جا کر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں، وہ اس رفتار کی رو سے دنوں میں سامنے آ جاتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ ادوار درخواہ ان کی مدت کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہوں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ حق و باطل کی یہ کشمکش "تاریخی وجوب" کی اندھی قوت کی رو سے جاری نہیں۔ یہ خدا سے علیم و حکیم کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق جاری ہے جس کی رو سے کائنات بالحق اور بامقصد پیدا کی گئی ہے اور وہ ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں جاری ہے۔ جب انسان حق کے مطابق نظام قائم کرنے کی کوشش چھوڑ دیتے ہیں تو وہ (حق) پھر کائناتی رفتار سے آگے بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ مستقل اقدار کی صحیح تعلیم و تربیت سے انسانوں کو ہر زمانے میں اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ وہ حق کا نظام قائم کر سکیں۔ تاریخ کے جن درخشندہ ادوار کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، وہ ادوار تھے جن میں انسانی جماعتوں کو اس قابل بنایا گیا تھا۔ آخری مرتبہ یہ دور محمد رسول اللہ والذین منہ کے زمانے میں آیا۔ جب تک اس صحیح تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ نظام قائم رہا۔ جب لوگوں نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا، تو وہ نظام بھی باقی نہ رہا۔ وہ مستقل اقدار جن کے مطابق یہ نظام قائم ہوا تھا، اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان میں یہ

صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں عملی نظام کی شکل میں متشکل کی جاسکیں۔ جب اور جہاں بھی ان کی صحیح تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا وہ نظام متشکل ہو جائے گا۔

۴۔ اس چودہ سو سال کے عرصے میں جبکہ حق کا وہ نظام جسے انسانی ہاتھوں نے قائم کیا تھا باقی نہ رہا۔ حق پر مبنی تصورات، کامناتی رفتار سے باقاعدہ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور انسانی معاشرہ پر غیر شعوری طور پر مسلط ہوتے جا رہے ہیں۔ ملکیت کا منہ جانا اور اس کی جگہ شراکت کے تصور کا عام ہو جانا۔ غلامی کا خاتمہ۔ ذات پات کی تمیز کا دور ہو جانا۔ قومیت کی جگہ عالمگیر انسانی برادری اور وحدت نظام انسانی کے تصور کا اجاگر ہوتے چلے جانا۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کے احساس کا بیدار ہوتے جانا۔ زمینداری۔ سرمایہ داری کے نظام کا مبعوض بن جانا اور عالمگیر نظام رابوہیت کا مقبول ہوتے چلے جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب قرائن و شواہد اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ حق کے مطابق نظریات زندگی، کامناتی قانون خداوندی کے مطابق آہستہ آہستہ ممکن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی قوت اُن باطل تصورات کو واپس نہیں لاسکتی۔ جنہیں حق کے تصورات نے شکست دے کر میدان سے بھگا دیا ہے۔ اس وقت اگر انسانوں کی تعلیم و تربیت قرآنی تصورات کے مطابق کر دی جائے تو صحیح نظام عدل و صداقت کے قائم ہونے میں جسے ہم خدا کے نظام رابوہیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اچھویر نہیں لگے گی۔ اس کے لئے کامناتی قانون نے فضا کو بڑا سا زگار بنایا ہے۔

۵۔ تصورات بالاسے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلام کا نظریہ حیات اور اشتراکیت کا فلسفہ زندگی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہم اکثر و بیشتر کہتے رہتے ہیں کہ نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے۔ عام لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ جب اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات اور قرآن کے معاشی نظام میں مماثلت دیکھتے ہیں تو جھٹ سے کہہ شٹتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ غلطی صرف اشتراکی نظام کے بارے میں ہی نہیں کی جاتی۔ ہر نظام کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مثلاً جب لوگوں نے دیکھا کہ مغربی جمہوریت بھی لوگوں کے خلاف ہے اور اسلام بھی ملکیت کی جگہ نظام شراکت کا حامی ہے تو انہوں نے فوراً اعلان شروع کر دیا کہ اسلام اور جمہوریت ایک ہی شے ہے۔ حالانکہ مغرب کی جمہوریت جس مادی نظریہ حیات کی پیداوار ہے وہ اسلامی نظریہ زندگی کے یکسر خلاف اور اس کی نقیض ہے۔ اسی قبیل کا یہ نعرہ ہے جسے آج کل مغربی

سیاست خاص طور پر بلند کر رہی ہے، کہ چونکہ عیسائی دنیا بھی خدا کو مانتی ہے اور مسلمان بھی خدا پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ عیسائی دنیا جس چیز کو خدا پر ایمان قرار دیتی ہے قرآن اسے کفر اور شرک سے تعبیر کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جب تک یہ لوگ خدا کو ان تصورات کے مطابق نہ مانیں، جنہیں قرآن کریم پیش کرتا ہے، وہ کبھی خدا کے ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔ بہر حال یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ اسلام کا نظریہ زندگی اور اشتراکی فلسفہ حیات ایک دوسرے کی خدمت میں۔

۶۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے، محترم مستفسر کے استفسارات کا اصولی جواب اسی میں آگیا ہے۔ لیکن ان کی بعض جزئی باتوں کے متعلق مختصر اذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) انہوں نے کہا ہے کہ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکری۔ اور ایک مخصوص خطہ میں ایسا نظام قائم کر دکھایا جو اس زمانے کے طبعی تاریخی دور سے الگ تھا اس متعلق وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور ایک معجزہ۔

محترم مستفسر! تو پورے طور پر اشتراکی فلسفہ کے قائل نہیں۔ یا رجحان بفریاد، انہیں پورے

طور پر اس کا علم نہیں۔ اشتراکی فلسفہ کی رُو سے نہ ”روحانیت“ کوئی شے ہے، اور نہ ہی اس پر مبنی معجزہ

کا کوئی وجود۔ جب تاریخ کی تعبیر یکسر مادی ہے تو اس میں روحانیت کا ذکر ہی کیا۔ مارکس، اس قسم کے

تصورات کو انسانی ادہام کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ جب تاریخی وجوہ کی قوت

ایسی بے پناہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کو نہیں روک سکتی، تو دنیا کے کسی ایک خطہ

ہی میں سہی اور تھوڑے سے وقت کے لئے ہی سہی۔ جب اس دھارے کا رخ موڑ دیا گیا اور اس کے

علی الرغم ایک اور نظام قائم کر کے دکھا دیا گیا تو وہ بنیادی منہدم ہو گئی جس پر اشتراکی فلسفہ کی عمارت

استوار ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرا فام روشن سے بہت کر سوچا جائے تو یہ بات ابھر کر سامنے آجائی

کہ جسے ”تاریخی وجوہ“ کہا جاتا ہے، اس کی اصل ہی کچھ نہیں۔ وہ تو قرآن کے الفاظ میں ”ان ناموں

میں سے ایک نام ہے، جنہیں تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے وضع کر لیا تھا۔“ محض ایک نام۔

تاریخ انسانوں کے اختیار و ارادہ اور اعمال و کردار کی داستان کا نام ہے۔ اسے ایک ایسی ہیبت قوت

سمجھ لینا جس کے سامنے انسان بے دست و پا، اور محکوم و مقہور بن کر رہ جائے، پتھر کو دیوتا بنالینے والی

بات ہے۔ مارکس نے خدا سے انکار کیا۔ اور اس کا مذہب اُسے جس خدا کا پرستار بنانا چاہتا تھا وہ خدا تھا ہی اس قابل کہ اس سے انکار کر دیا جاتا۔ اس خدا سے اس نے انکار کیا اور حقیقی خدا کا تصور اس کے سامنے کسی نے پیش نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے ذہن میں غلا پیدا ہو گیا۔ لیکن چونکہ غلا کا فائدہ اُن رہنما ملکات سے ہے اس لئے اسے اس خدا کو پورا کرنے کے لئے ایک "خدا" وضع کرنا پڑا۔ یہ خدا ہے "تاریخی وجوب" جو محض ایک سوہوم نام ہے۔ اس کی اصل حقیقت کچھ بھی نہیں۔ کوئی کمپونٹ آج تک یہ نہیں سمجھا سکا کہ "تاریخی وجوب" ہے کیا؟ نہ ہی خود مارکس کے ہاں اس کی تشریح ملتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ جو نظام رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا وہ تھوڑے عرصے کے بعد جاری کیوں نہ رہا، سو اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں مختصراً بتایا جا چکا ہے۔ رافضیہ دیکھنا ہو تو تسلیم کے نام خطوط کی تیسری جلد میں وہ خط دیکھئے جس کا عنوان ہے "اسلام آگے کیوں نہ چلا"

اس مقام پر اتنا اور بتادینا ضروری ہے کہ جو نظام نبی اکرم نے قائم فرمایا تھا وہ معجزہ تھا۔ نہ "روحانی" کا کرشمہ۔ وہ اس پر وگرام کا فطری نتیجہ تھا جسے قرآن کریم نے اس نظام کے قیام کے لئے تجویز کیا ہے یعنی صحیح تعلیم و تربیت سے مستقل انفرادی اہمیت کو اس قدر دلوں میں جاگزیں کر دینا کہ وہ انسانی زندگی کا نصب العین بن جائیں اور اس طرح انسان ان کے تحفظ کی خاطر ہر قسم کی مادی قربانی کے لئے بطریق خاطر تیار ہو جائے۔ اس پر وگرام پر جب بھی عمل کیا جائے گا اس کا نتیجہ وہی برآمد ہوگا جو نبی اکرم کے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ کبھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے اس نظام کے اصول دیئے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اس کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ انہیں ہر زمانے کے انسانوں پر پھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ انہیں اپنے حالات کے مطابق خود متعین کریں۔ اس لئے محترم مستفسر کا یہ سمجھنا کہ کسی ایک زمانے کی متعین کردہ جزئیات بھی ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ قرآنی تصور نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ خود نبی اکرم کے جانشینوں و خلفائے راشدین کے زمانے میں کئی ایک جزئیات میں جو پہلے متعین ہوئی تھیں تبدیلی کی گئی۔ ان میں سے جو علیٰ حالہ رہنے دی گئیں تو اس لئے کہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

(ii) محترم مستفسر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے۔

تاریخی ارتقا فطرت کے اصولوں میں سے ہے۔

یہ درست ہے لیکن اس اصول کا اطلاق اپنی اسوجہ ہو سکتا ہے۔ جو انسانی ذہن کے پیدا کردہ ہوں۔ آج سے چھ ہزار سال پہلے کا انسانی ذہن وہ باتیں سوچ سکتا تھا جو آج کا ذہن سوچ سکتا ہے۔ لیکن وحی خداوندی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے۔ جو ماحول کے اثرات سے بلند ہے۔ وحی انسان کو ابلی حقائق دیتی ہے جو مستقل بالذات اور غیر متبدل ہیں۔ وحی نے سب سے پہلے نبی سے بھی یہی کہا تھا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ ذرائع رزق انسانی نشوونما کے لئے ہیں۔ انہیں افراد و مخصوص گروہوں کی مفاد پرستیوں کے لئے محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ذہن انسانی اور وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ذہن انسانی کا طریق تجرباتی ہے۔ اس لئے وہ تدریجاً حقیقت تک پہنچتا ہے۔ لیکن وحی خداوندی پہلے ہی دن حقیقت کو سامنے لے آتی ہے۔ البتہ اس حقیقت کو عملی نظام میں تشکل کرنے کے لئے ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے گا اور یہ سب کچھ انسانی حدود و حدود کی رو سے ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وحی کی رو سے اس نظام کے اصول ملتے ہیں۔ جزئیات نہیں ملتیں۔ تدریجی ارتقاء کا عمل انسانی زندگی کی جزئیات میں ہوتا ہے۔ اصولوں میں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سچے کی مختلف قوتوں کی نشوونما مذہباً ہوتی ہے لیکن جن اصولوں پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے، وہ بچپن، جوانی، اور بڑھاپے میں یکساں رہتے ہیں۔ مثلاً زندگی کا دارومدار سانس پر ہے تو یہ چیز زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک یکساں طور پر کار فرما رہتی ہے۔ اسی طرح دھڑکنے اور صحت سے متعلق دوسرے اصولوں کی کیفیت ہے یہ اصول تدریجاً مرتب نہیں ہوتے جس نے زندگی دی ہے، اسی نے ان اصولوں کو مستقل طور پر معتین کر دیا ہے۔ جو ان اصولوں میں تغیر و تبدل کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔

پھر طرح زندگی کے خالق نے طبعی زندگی کے اصول دیئے ہیں، اسی طرح اس نے انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی اصول دیئے ہیں۔ یہ اصول بھی اسی طرح غیر متبدل ہیں جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول۔ تدریجی ارتقاء کا سوال نہ ان میں ہے نہ ان میں۔ پھر جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول انسانی ذہن کا پیدا نہیں کیا اسی طرح اس کی تمدنی زندگی سے متعلق اصول بھی ہن کے ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ کائنات کی چیزیں بھی اپنے لئے اصول آپ وضع نہیں کئے۔ سب وحی کی نوا سے ملے ہیں۔

(۱۱۱) محترم مستفسر نے اشتراک فی فکر کی ایک بنیادی کمزوری کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب (مثلاً) تاریخی وجوہ کی رو سے اب وقت آگیا ہے کہ سابقہ نظام سرمایہ داری کی جگہ اشتراک نظام

دنیائے مسلط ہو جائے تو اس کے لئے نہ کسی جدوجہد کی ضرورت ہے نہ لکھنؤ کی حاجت۔ "تاریخی وجوہ" کی بے پناہ قیمت اس جدید نظام کو خود بخود مسلط کر دے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دعوے کے سامنے روک بن کر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ یہ اسے جس وفاتناک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر اشتراکی ملک اشتراکیت کو پھیلانے اور مسلط کرانے کے لئے اس قدر فعل برآتش کیوں بہتے ہیں۔ یہ اس قدر پراپیگنڈے کا طوفان، مختلف ملک میں دہشت پسند جماعتیں، سرمایہ دارانہ نظام کی حامل سلطنتوں کے خلاف سرور گرم جنگ کا سلسلہ اس قدر سپاہ اتنا عظیم سامان جنگ، ایٹمی بم وغیرہ وغیرہ کس مقصد کے لئے ہیں۔ کیا "تاریخی وجوہ" اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ اسے ان سبھاروں کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ اور ضرورت پڑ رہی ہے ان انسانوں کے مقابلہ کے لئے جو اشتراکی فلسفہ کے مطابق نہایت بے بس اور مجبور ہیں۔

اس فلسفہ کی وہ سہری کمزوری یہ ہے کہ (مثلاً) آج کل جدلی جنگ کی روتے اشتراکی نظام کے مسلط ہونے کی یاری ہے۔ سوالیہ ہے کہ اس کے بعد جب ہی جنگ کے مطابق اشتراکی نظام کی ضد دوسرے نظام یعنی نظام سرمایہ داری کے مسلط ہونے کی باری آئے گی تو اس وقت اس فلسفہ کے معتقدین کا طرز عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اُس وقت انہیں نظام سرمایہ داری کا حامی ہونا پڑے گا۔ اور اشتراکی نظام کے خلاف وہی کچھ کرنا ہوگا جو کچھ وہ اس وقت نظام سرمایہ داری کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ تلہ لٹریچر جس میں نظام سرمایہ داری کو نوع انسان کے لئے لعنت قرار دیا گیا ہے، مذہب آتش کر دینا پڑے گا۔ اور وہ تمام دلائل جو اس وقت نظام اشتراکی کے حق میں دی جاتی ہیں، خود ان کی تردید کرنی پڑے گی۔ اُس وقت سب سے بڑا سرمایہ دار سب سے زیادہ سختی سے ایک دہنیت قرار دیا جائے گا۔

پھر اسی نقشہ کو دہرایچے کی طرف آئے۔ موجودہ دور سے پہلے نظام سرمایہ داری "تاریخی وجوہ" کے نقطہ کے عین مطابق تھا۔ سوال یہ ہے کہ آپ اُس دور کے سرمایہ پسندوں کو موجب لعنت و لعنت کیوں قرار دیتے ہیں؟ ان کی شان میں قصائد کیوں نہیں لکھتے۔ آپ اُس "مذہب" کو "افیون" کیوں قرار دیتے ہیں جو اُس وقت اُس نظام کی تائید کرتا تھا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا طرز عمل کس طرح خوب تاریخی کے خلاف ہے؟ اگر آپ اس

فلسفہ کو فی الواقعہ سچا سمجھتے ہیں تو آپ کو سابقہ دور کے سرمایہ پرستوں کی مدح میں قصیدے پڑھنے چاہئیں کہ انہوں نے تاریخی وجوب کا ساتھ دیا تھا۔ نیز اس زمانے کے مذہب کو سچا مذہب قرار دینا چاہیے جس نے تاریخی وجوب کی تائید کی تھی۔ اسی طرح آپ کو اس دور کے بعد بھی اس مذہب کو حق و صداقت کا مذہب سمجھنا چاہیے جو نظام سرمایہ داری کی تائید کرے۔ کیونکہ اس وقت تاریخی وجوب کا یہی تقاضا ہوگا۔

آپ مذہب پرست طبقہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ عقل و فکیر سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں بند کئے اپنے معتقدات پر جے رہتے ہیں اور جو شخص ان کے خلاف کچھ کہے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا نام آپ کے نزدیک مذہبی جنون (FANATICISM) ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ نظام اشتراکیت بہترین نظام ہے تو کیا آپ اس نتیجہ پر عقل و فکر کی مدد سے پہنچے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ بھن اتفاق ہے کہ آپ اس دور میں پیدا ہوئے جب تاریخی وجوب کی مدد سے اشتراکی نظام کی باری آئی۔ آپ نے اس نظام کی تائید شروع کر دی۔ اگر آپ چند صدیا پہلے پیدا ہوتے تو تاریخی وجوب کے معتقد کی حیثیت سے آپ نظام سرمایہ داری کو عین حق و صداقت کے مطابق نظام قرار دیتے۔ سوچئے کہ یہ مذہبی جنون نہیں تو اور کیا ہے؟ اور جنون بھی اس شدت کا کہ جو شخص آپ کے اس عقیدہ سے متفق نہیں آپ اسے زندہ رہنے کا حق تک دینے کے لئے تیار نہیں۔

اس کے مقابلہ میں دین خداوندی کو دیکھئے کہ اس نے پہلے دن سے ایک نظام ربوبیت کا کو حق و صداقت کا نظام قرار دیا اور آج تک اُسی کو حق و صداقت کا نظام قرار دیتے چلا جاتا ہے۔ اور ہمیشہ تک اسے ہی حق و صداقت پر مبنی نظام قرار دے گا۔ آپ سوچئے کہ جو لوگ اس نظام کے مؤید ہیں ان کا موقف علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی سمجھا جائے گا یا تاریخی وجوب کے مستندین کا جنہیں ہر دور میں ساقیہ موقف کے خلاف کہنا اور کرنا پڑے گا۔ یہ فرق ہے وحی خداوندی اور انسانی ذہن کے وضع کردہ نظریات حیات میں!

(iv) محترم مستفسر یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی قرآن سے پروردگار صاحب نظام ربوبیت ثابت کرتے ہیں اور اسی سے مودودی صاحب نظام سرمایہ داری کی تائید لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ گھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ

خداوند ایسے سادہ دل بندے کہ ہر جائیں!

محترم مستفسر جس خدا سے پوچھتے ہیں کہ تیرے سادہ دل بندے کہ ہر جائیں، اسی خدا نے

ان سادہ دل بندوں کو پہلے ہی بتا رکھا ہے کہ وہ کدھر جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ تم نہ یہ دیکھو کہ پرویز کیا کہتا ہے اور نہ یہ کہ مودودی کیا کہتا ہے؟ میری کتاب "گپت دویا" نہیں کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔ تم اس کتاب کو اپنی عقل و فک کی رو سے دیکھو اور سمجھو، بات صاف ہو جائے گی۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کے مالک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری قرآن کی تعلیم پر ہے یا انانوں کے خود ساختہ مذہب پر جسے بدستوری سے اسلام کا نام دے دیا گیا ہے۔

(۷) محترم مستفسر نے کہا ہے کہ ہمیں آگے بڑھنے کے لئے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہ نمائی لینی چاہیے اور اپنے ارد گرد کے حالات سے اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے نظام ربوبیت تک پہنچنے کے لئے سیدھا راستہ یہی ہے۔

ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟ یہ بات اگر وہ اس مذہب پرست طبقہ سے کہتے جو نظام سرمایہ داری کو مقدس سمجھتا ہے تو قابل فہم ہوتی۔ لیکن نظام ربوبیت کے داعیان سے یہ کہنا کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جسے وہ اپنے خطبے شروع میں بیان کر چکے ہیں یعنی یہ کہ نظام ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ نہ ہی ہمیں ایسا فرض کر لینے کا حق حاصل ہے کہ یہ صاحب واقعی اشتراکی ہیں، اس لئے ان کے پیش نظر وہی ذرائع ہیں جنہیں اشتراکی لیڈر اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے پیش نظر کوئی اور ذریعہ ہو۔ لیکن جہاں تک اشتراکی نظام کا تعلق ہے، اس کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے جو ذرائع ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن اس باب میں کہتا ہے کہ

ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائط کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ چنانچہ جاہلی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بانی، فریب دہی، عین حق و صداقت پر۔

اب رہا طریق کار۔ سو اس کے متعلق لیٹن لکھتا ہے۔

سرمایہ داری نظام حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔

ظاہر ہے کہ سلام کی رُو سے ان ذرائع کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اخلاقی حدود وہ مستقل اقدار ہیں جنہیں کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سلام، ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام ربوبیت بھی اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں، بلکہ ایک مہذب مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے انسانی ذات کی نشوونما۔ اور انسانی ذات کی نشوونما کی صورت یہ ہے کہ جہاں کوئی مستقل قدر ہر تھوڑے سے چھوٹی نشوونما رک گئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "زندگی کی بعض ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے" تو یہ خالص میکیاؤلی سیاست ہے جسے شریعت خداوندی سے کوئی واسطہ نہیں۔

باقی رہا تشدد کے ذریعہ انقلاب لانا تو قرآن کی رُو سے، اس طرح فساد تو برپا کیا جاسکتا ہے۔ انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ اس کے نزدیک خارج میں انقلاب آ نہیں سکتا۔ جب تک انسان کے قلب میں انقلاب پیدا نہ ہو، اور قلب میں انقلاب صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نبی اکرم جو انقلاب لائے تھے تو اس کا ذریعہ "تعلیم کتاب و حکمت" ہی تھا۔ اس سے حضورؐ نے اپنی جماعت کے قلب و نگاہ میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا جس سے ان کی نظروں میں زندگی کی اقدار بدل گئیں۔ تشدد کے ذریعے جس قسم کا انقلاب آتا ہے اس کا مزا خود روس نے چکھ لیا ہے۔ اسٹالن کا دور، تشدد کا سخت ترین دور تھا، اب روس میں اس دور کے ہیر و اسٹالن کی لاش تک کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے اور اس دور کے تشدد کی ہولناک داستانوں کو بار بار دہرا کر لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریہ حیات کی رُو سے انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا۔ لیکن قرآنی نظریہ زندگی کی رُو سے احترام انسانیت، انسانی ذات پر ایمان

کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ، ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریہ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ یہ تبدیلی 'یقین' (CONVICTION) سے آتی ہے اور (CONVICTION) کی بنیاد دلائل و براہین کی رو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ یہی ایمان وہ جذبہ محرک (INCENTIVE) عطا کرتا ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ خون پسینہ ایک کر کے زیادہ سے زیادہ کلمے اور اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لئے کر باقی سب، بطیب خاطر، دوسروں کی نشوونما کے لئے دید ماوی تاریخ، انسان کے اندر اس قسم کا جذبہ پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس پر اشتراکیت کی کشتی اس بُری طرح سے ٹوٹی ہے کہ نہیں اس کی شکست و ریخت کو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے وہاں آہنی پردے لٹکانے پڑ گئے ہیں، اس کے برعکس، جب اسلامی نظام قائم ہوتا ہے تو وہ دنیا بھر کے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے مرکز (کعبہ) میں آئیں۔ (لَبِيشْهُ قُلُوبُ مَنَافِعْ لَہُمْ) اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہ ان کی نفع بخشوں کے لئے کیا کچھ کرتا ہے۔ یہ ہے فرق اسلام کے طریق کار اور اشتراکیت کے طریق کار میں۔

(vi) محترم مستفسر نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام مسلم ممالک، اسلامی نظام کی مخالفت کو جاری ہے۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس نتیجے کے اخذ کرنے کے لئے یہ دلیل جس قدر کمزور ہے وہ ظاہر ہے۔ محترم مستفسر اس سے متفق ہوں گے کہ اس وقت دنیا کی اکثریت، اشتراکی نظام کی مخالفت ہے۔ کیا وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام صحیح نہیں کسی نظام کے صحیح یا غلط ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ کتنے لوگ اس کے موافق ہیں اور کتنے مخالف۔ اس بات کے پرکھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس نظام پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کیا جائے اور دلائل و براہین کی رُو سے کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔ قرآن اپنے ہر دعوے کو علم و بصیرت پیش کرتا ہے اور دلائل کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ تم اپنے دعوے کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کا پیش کردہ نظام ربوبیت، نوع انسان کی منفعت کا ضامن ہے اور اس کے سوا دنیا کا کوئی نظام یہ نتیجہ نہیں دے

کر سکتا۔ ہم اپنے اس دعوے کو غلم و بصیرت کی رو سے پیش کرتے ہیں اور اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو اس کے بلحاظ مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے دعوے کو غلم و بصیرت کی رو سے پیش کرے۔



آخر میں ہم غترم مستفسر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ اسے حسن اتفاق سمجھے کہ اس وقت آپ کے خیال کے مطابق تاریخی وجوب کا تقاضا بھی وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ سوال اس فلسفہ زندگی کے اختلاف کا ہے جس پر یہ دونوں نظام متفرع ہیں۔ اگر آپ اس نظام کو قرآنی فلسفہ زندگی کی رو سے اختیار کریں گے تو اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہو گا کہ کل کو جب تاریخی وجوب کی اہل گردش کے مطابق، پھر سے نظام سرمایہ داری کی باری آگئی تو اس وقت آپ کو یہ خفت نہ نہیں اٹھانی پڑے گی کہ جس اشتراکی نظام کو آپ کل تک نوع انسان کی ظلال و بہبود کا ضامن قرار دیتے تھے۔ اسے نوع انسان کی تباہی و بربادی کا موجب ٹھہرانا پڑے۔ قرآن یہ کبھی نہیں کرے گا کہ جس بات کو وہ آج نوع انسان کی منفعت کا موجب بتا رہے اسے کل کو انسانیت کی تباہی کا باعث قرار دیدے۔ اس کے اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ وہ تاریخی وجوب کی گردش و دولاپی سے ہر زمانے میں بدلے نہیں رہتے۔ اس نکتہ کو ذرا اشتراکی نظام کی تاریخ کی روشنی میں دیکھئے۔ مارکس نے اپنے تصور کو ایک عالمگیر نظام کی حیثیت سے پیش کیا اور لینن کے زمانے تک اسے ایسا ہی سمجھا جاتا رہا۔ لیکن اسٹالن نے اس کی عالمگیر حیثیت کو ختم کر کے قوی حیثیت دیدی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ نظام روس کا قومی نظام بن کر رہ گیا۔ اب اس نظام کی جنگ دوسرے نظاموں سے نہیں رہی۔ اب روس کی جنگ دیگر ممالک سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کو اپنی سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک سے دوستی کے معاہدات کرنے پڑ رہے ہیں جس نظام کے خلاف اشتراکی نظام صدائے احتجاج بن کر اٹھ اٹھا اور اس کے خلاف ان ممالک سے تعلقات منقطع کرنے پڑ رہے ہیں جو خود اشتراکی نظام کے داعی ہیں۔ یہ نتیجہ ہے مستقل اقدار پر ایمان نہ ہونے کا۔ اس کے برعکس قرآن کریم زندگی کا جو نظام پیش کرتا ہے اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ (۱) ہر انسان محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے۔ (۲) نظام دہی حق و صداقت پر مبنی سمجھا جاسکتا ہے جس کے پیش نظر کسی خاص ملک۔ خاص قوم۔ خاص گروہ اور خاص پارٹی کا مفاد نہ ہو، بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا مفاد ہو۔ (۳) دنیا میں "اپنوں" اور "بیگانوں" کی تمیز اور تفریق

کا معیار یہ ہے کہ جو لوگ قرآنی نظام کی صداقت پر ایمان رکھیں وہ اپنے میں جو اس کے مخالف ہوں وہ بیچلنے۔
 — خواہ وہ روس کے اشتراکی ہوں یا امریکہ کے جمہوریت نواز۔ (۴) اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ زندگی
 ہی دنیا کی زندگی نہیں۔ موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور ان کا ہر ارادہ اور عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا
 ہے۔ — خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آئے، یا اس کے بعد۔ اسی تصور کو بالفاظ دیگر یوں بیان کیا جاتا ہے
 کہ ان اپنے ہر عمل بلکہ ہر ارادہ تک کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

یہ اصول غیر متبدل ہیں اور کسی دور کے کسی مسئلہ کو اس کا اختیار نہیں کہ ان میں کسی قسم کی
 تبدیلی کر سکے۔ ہم بوجھنا چاہتے ہیں جناب مستفیسر سے کہ کیا نوع انسان کے امن و صلاح کا ضامن
 اس قسم کا نظام ہو سکتا ہے یا اشتراکی نظام؟

(طلوع اسلام۔ جنوری ۱۹۶۲ء)



اسلامی سوشلزم

قرآن کا اشتراکی نظام؟

انسانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جسے قرآن کریم "آدم کی جنت" کہہ کر دکھاتا ہے۔ اس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ۔ اِنْ لَّكَ اَرْوَاحٌ مِّمَّنْ فِيهَا وَلَا تَعْرِىٰ - وَ اَنْتَ لَوْ تَكْلُمُنَّوْا فِيْهَا وَلَا تَفْهَمُ۔ (۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ کسی کو بھوک کا خوف سنا سنا تھا، نہ پیاس کا۔ نہ کسی کو لباس کے لئے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا نہ مکان کے لئے۔ زمین، رزق کا بنیادی ذریعہ تھی (اور ہے) اور اس پر ہونہ کسی نے لکیریں کھینچ کر اپنی ملکیت ہیں جتنی کتنی۔ اس دور کا انسانی لغت "ملکیت" کے لفظ سے آشنا نہ تھا۔ وہاں تصور "تمتع" (UTILITY) کا تھا۔ اسی لئے قرآن نے ارض کے متعلق کہا تھا کہ وہ متاع ہے، بلکہ نہیں۔ لہذا، اُس دور میں ابھی "میری اور تیری" کے جھگڑے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ۔ وَ كُلَّ مِنْهَا رَعْدًا حَبِثٌ شَعْنًا۔ (۱۱۸-۱۱۹) جسے بھوک لگتی تھی وہ جہاں سے جی چاہے پیٹ بھر کر کھا لیتا تھا۔ "حَبِثٌ شَعْنًا" (جہاں سے جی چاہے) کی کیفیت منا بتا رہی ہے کہ وہ زندگی انفرادی ملکیتوں کی نہیں تھی، اشتراکی تمتع کی تھی۔ اسے قرآن نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد بعض لوگوں کے ذہن میں انفرادی مفاد پرستانہ تصور نے انگریزوں کی (قرآن نے اسے شیطانی دسوسہ سے تعبیر کیا ہے) اور اس ذہنیت نے ابن آدم سے وہ جنت چھین لی۔ اس سے

اُس دور کا آغاز ہوا جس میں حالت یہ ہو گئی کہ۔۔۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (پہلے) انسان اور انسان کے درمیان اپنے اپنے مفاد کی حد فاصل قائم ہو گئی۔ ان میں باہمی عداوت پیدا ہو گئی۔۔۔

رَالْعِدَدِی اس لکڑی WEDGE کو کہتے ہیں جو دو لکڑیوں کے درمیان دیدی جاتی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں۔ بادی تدریج حقیقت سامنے آجائے گی کہ نظام سرمایہ داری میں انفرادی مفادات کے باہمی ٹکراؤ سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اسے محسوس طور پر سامنے لانے کے لئے العِدَدِی سے بہتر تشبیہ اور کون سی ہو سکتی تھی؟ یہ دو سرمایہ پرستی جوں جوں آگے بڑھتا گیا، انسان اور انسان میں حائل شدہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ اس خلیج کو پاٹ دینا ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے انفرادی مفاد پرستی کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ وہ کسی دوسرے نظام کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ آدم کو پھر سے وہ جنتک دلا دیں، جس سے شیطانی دسواں انگریزی نے اسے نکالا تھا۔ یہ حضرات آتے اور میری اور تیری کی تفریق مٹا کر اپنے دائرہ عمل کے اندر پھر سے اس برادری کی تشکیل کر جاتے جس میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا شدہ عداوتیں باقی نہ رہتیں۔ لیکن ان کے چلے جانے کے بعد مفاد پرستوں کا گروہ پھر برسرِ اقتدار آ جاتا اور پھر سے اسی نظام کو قائم کر دیتا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تھی۔ آپ نے اپنی مدیم النظر تعلیم اور فقید المثال عمل سے ایک ایسی برادری کی تشکیل فرمائی جس میں انفرادی ملکیتوں کا عداوت انگیز تصور بجائی کو بجائی سے الگ کرنے کا موجب نہیں بنتا تھا۔ اس برادری کی تشکیل کن بنیادوں پر ہوئی تھی اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

مسلمان کیسے ہوا جاتا ہے

آج ہماری کیفیت یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، انہیں "مسلمان" ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اور جو غیر مسلم مسلمان ہونا چاہتا ہے، اس کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اَمْنَتْ بِاللّٰہ کے الفاظ دہرا دے۔ لیکن اسلامی برادری کی تشکیل اس طرح نہیں ہوئی تھی۔ اسلامی برادری ایک سوسائٹی تھی جس میں شامل ہونے کیلئے ایک معاہدہ (CONTRACT)

پر دستخط کرنا ضروری تھا۔ وہ معاہدہ یہ تھا کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِثَا
لَهُمُ الْجَنَّةَ. (۹۰)

ہاں سوسائٹی کی ممبر شپ قبول کرنے والا اس امر کا اقرار و اعلان کرتا تھا کہ اب سے میں اپنی حیاں اور اپنے مال کا مالک نہیں رہا۔ میں نے اسے "اللہ" کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اور "اللہ" اس کے جواب میں وعدہ کرتا تھا کہ اسے، اس کے عوض وہ "جنت" مل جائے گی جس سے آدم نکلا تھا۔ اور جس کی تلاش میں کاروان انسانیت اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔ یہ عہد و معاہدہ یونہی نظری اور اعتقادی نہیں تھا کہ ایک شخص نے یہ الفاظ دہرا دیئے اور سمجھ لیا کہ معاہدہ کی شرط پوری ہو گئی ہے۔ اسے اپنی جان اور مال سب کچھ فروخت کر دینا ہوتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا، خود تو کسی انسان کے سامنے آتا نہیں، اس لئے یہ متاع کس کے پاس بھی جاتی تھی؟ اس کے لئے خود خدا نے بتا دیا کہ اسے تم اس رسول کے ہاتھوں فروخت کر دو جو ہمارا نظام قائم کرنے کے لئے یہ عہد تم سے لیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں جو ذمہ داری ہم نے لی ہے (یعنی تمہیں پھر سے جنت دیدینے کی ذمہ داری) اسے یہی نظام پورا کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ یہ سودا کیا کرتے تھے، ان کے متعلق کہہ دیا کہ

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (۹۱)

اے رسول! جو لوگ اپنی اس متاع کو تیرے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں وہ دراصل اسے خدا کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ اس معاہدہ کی پختگی کے لئے تو جوان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہو تو یہ ہاتھ دیکھنے میں تو تیرا ہاتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت یوں سمجھو کہ یہ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے

خدا کی ذمہ داری

اس معاہدہ کے بعد یہ شخص اسلامی سوسائٹی کا ممبر بنتا تھا۔ اور یہ تھی وہ سوسائٹی جو دنیا میں اس جنت کو مشکل کرتی تھی جس میں، نہ کسی کو بھوک کا خوف نہ تھکا نہ پیاس کا۔ نہ اسے لباس کی فکر نہ پیناں کرنی تھی نہ مکان کی: جب اور جہاں کسی کو بھوک لگتی تھی اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔ یوں یہ سوسائٹی اسلامی نظام، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرتی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱)

زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے سر نہ لئے رکھی ہو۔

اسی ذمہ داری کی ضمانت کے لئے وہ نظام اعلان کرتا تھا۔ کہ

خُفِّنْ نَزْرُ شُكْرٍ وَ إِيَّا هُمْ (۱۲)

اے افراد انسانیہ! تم رزق کی طرف سے پریشان مت ہو۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

اس نظام کا نام تھا اسلامی نظام، اور اسے قائم کرنے والی جماعت کے نمبر و **ملکیت کا نام** کو کہتے تھے مسلمان۔ کچھ عرصہ کے بعد مفاد پرست گرد و ہوں نے پھر سر نکالا اور جو کچھ سابقہ انبیائے کرام کے پیش کردہ نظام کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اسلامی نظام کے ساتھ ہو گیا۔ یعنی اسلام کے اشتراکی نظام کی جگہ انفرادی ملکیت کے نظام نے لے لی، اور بیع و شری کے خدائی عہد نامہ پر دستخط کر کے اس سوسائٹی کا نمبر بننے کے بجائے، بعض اسلام کی طرف اپنی نسبت کرنے والے مسلمان سمجھ لئے گئے۔ ملکیت کے نظام کی بدترین شکل ملوکیت ہوتی ہے۔ اس میں ساری ملک ایک فرد کے قبضہ میں رہتی ہے۔ پھر جس جس کو وہ کچھ حصہ دیدے۔ وہ اس حصہ کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ باقی دنیا کی طرح یہی نظام مسلمانوں میں بھی متواتر چلا آ رہا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ باقی دنیا اسے برتتا مصلحت قبول و اختیار کئے ہوئے ہے۔ جب کسی کی مصلحت کا تقاضا ہو وہ اسے بدل سکتے ہیں لیکن مسلمانوں نے گزشتہ انبیائے کرام کے نام لیواؤں کی طرح، اسے خدائی نظام، قرار دے رکھا ہے جسے بدلا ہی نہیں جاسکتا۔ حتیٰ کہ اب ان کی طرف سے یہاں تک بھی کہ دیا جاتا ہے کہ انفرادی مفاد کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنا، انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس کے سوا، محنت کرنے کا کوئی اور جذبہ محرکہ ہو نہیں سکتا۔ اور چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے انفرادی مفاد پرستی عین مطابق اسلام بلکہ تقاضائے دین ہے۔ خدا فرم ہی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

عصر حاضر میں جب انسانی ذہن نے ملوکیت کے خلاف احتجاج کیا تو مفاد پرست گرد و ہوں نے اس کے لئے ایک اپیرن تیار کیا جس کا نام ڈیموکریسی (جمہوریت) رکھا گیا۔ ملوکیت اور مغربی جمہوریت

میں فرق صرف اصطلاح کا ہے۔ روح دونوں کی ایک ہے۔ یعنی انفرادی ملکیت کا تصور دونوں جگہ موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو فیصلہ ایک فرد کیا کرتا تھا اور اسے "بادشاہ کا حکم" کہا جاتا تھا، اب وہ فیصلے مفاد پرستوں کا ایک گروہ کرتا ہے جو مختلف سیاسی حروں اور دولت کے زور سے یہ پولیشین حاصل کر لیتا ہے۔ اور ان کے فیصلوں کو ملکیت کا قانون اور ان کے مفاد کو مفاد عامہ (PUBLIC - INTEREST) جیسی غریب آخری اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اشتراکیت

لیکن زمانے کے تقاضے اس تغیر لفظی سے مطمئن نہیں ہو سکے۔ وہ "ملکیت" کے تصور سے آبا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اشتراکیت (کیونٹزم) کی صورت میں سامنے آیا۔ اس نقطہ خیال سے دیکھئے یعنی انفرادی ملکیت کے تصور کو ختم کر دینے کے نقطہ خیال سے، تو اشتراکیت نے وہی کچھ کرنے کا دعو کیا ہے جو کچھ کرنے کے لئے اسلام آیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشتراکیت انفرادی ملکیت کے تصور کو بزور مٹانا چاہتی ہے۔ لیکن اسلام اپنی ہمہ گیر تعلیم اور بلند فلسفہ حیات کی بنیاد پر انسانی قلوب میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے کہ ملکیت کے اس تصور کو مٹانا ان کے لئے اسی طرح تقاضا حیات بن جاتا ہے جس طرح طبیعی زندگی کے لئے سانس لینا تقاضا ہے حیات ہوتا ہے۔ ہم کسی قانون کے ڈرت سانس نہیں لیتے۔ بہر حال، انفرادی مفاد پرستی (یعنی نظام سرمایہ داری) کے تصور کو مٹانا، اشتراکیت اور اسلام دونوں میں قدر مشترک ہے۔ اگر مسلمانوں کے سامنے دین اپنی حقیقی شکل میں ہوتا، تو وہ عصر حاضر کے اس تقاضے کو اپنے حق میں جبری نیک فال سمجھتے۔ کیونکہ اس نے فساد نظام کو دوبارہ متشکل کرنے کے لئے سازگار ہو گئی تھی جس کا قیام، اسلام کا مقصد تھا۔ لیکن ان کی (اور ان کے ساتھ عالم انسانیت کی) بد نصیبی کہ انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھنے کے بجائے، اس تصور کو خلاف اسلام قرار دیدیا اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت شروع کر دی۔ سرمایہ دار مملکتوں کے لئے ان کا یہ رد عمل بڑا مفید مطلب تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی ان کی بیٹھ کھوئی۔ اس طرح انہوں نے (مسلمانوں نے) اس محاذ میں، اس تصور کے سب سے بڑے مخالف کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ اب صورت یہ ہے کہ ہمارا مذہب ہی پیشوائیت کا طبقہ اس مخالفت کو جہاد قرار

دے رہا ہے ان کی طرف سے، اس تصور کے خلاف رجبے سوشلزم سے تعبیر کیا جاتا ہے، دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں، وہ سننے کے قابل ہیں۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب اپنی کتاب ”سکہ ملکیت زمین“ میں لکھتے ہیں۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطہ نظر کی ضد ہے۔ لہذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصول یا نسبت العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ جینے پر مجبور کیا جاسکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریہ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر مقرر ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی ہاتھوں میں سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقے سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے، بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیات شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو، مگر کلیات شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدلی اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا لیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اسلامی تصور اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر

افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں۔ اور اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار
افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

اس دلیل کا بودا بین

اس دلیل کا ذرا تجزیہ کیجئے۔ سوال یہ تھا کہ ”اسلامی نظام“ میں، ذرائع پیداوار افراد کی
ملکیت میں رکھے جائیں گے یا امت کی مشترکہ تحویل میں ہوں گے۔ اس نکتہ کو ایک دفعہ پھر سمجھ لیجئے
کہ سوال یہ تھا کہ کیا اسلام کی رو سے یہ جائز ہو گا کہ ذرائع پیداوار امت کی مشترکہ تحویل میں رکھے
جائیں اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی نظام حکومت میں ذرائع پیداوار
نظام کی تحویل میں دیدیئے جائیں تو اس سے پوری موسائی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائیگی
جو ان ذرائع پر متصرف ہو گا۔ جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی قوتیں
ہوں گی، انہی کے ہاتھوں میں اگر سوداگری کا رخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو
اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہو جائے گا جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان
ایجاد نہیں کر سکا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی نظام میں بھی کیفیت یہ ہوگی کہ

(۱) پورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر سے گروہ کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ اور امت اس گروہ کی
غلام ہوگی۔

(۲) اس گروہ کے ہاتھ میں، فوج، پولیس، قانون سازی کا اقتدار ہو گا وہ اسے قوم کو اپنا
غلام بنانے کے لئے استعمال کرے گا۔ لہذا

(۳) اگر ذرائع پیداوار بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں تو وہ اس شیطانی نظام کے
ہاتھوں انسانیت کا گلا گھٹ جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی نظام کے درباب حل و عقد کی بھی یہی حالت ہوگی کہ وہ اپنے اقتدار و
اختیار کو انسانیت کو ذبح کرنے کے لئے استعمال کریں گے، تو پھر فرعونی نظام اور اسلامی نظام میں
فرق کیا ہو گا؟ اگر حالت یہی ہوتی ہے تو پھر اس اسلامی نظام کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں۔

کہ اس کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کے لئے اس قدر قربانیاں کی جائیں! یہ حضرات ہمیں بتاتے ہیں کہ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اسلام کے نظام حکومت میں نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو گا جو نہایت متدین، متشعر، متقی، خدا ترس، صالح، اور بہتہ دجود، خدا اور اس کے رسول کے رنگ میں رنگے ہوں گے، اور وہ خلافت راشدہ کے نظام کو پھر سے قائم کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کے لوگوں کی بھی حالت یہی ہو گی، کہ جس قدر ان کے اختیارات بڑھتے جائیں گے، اسی قدر انہوں پر عرصہ چٹا تنگ ہوتا جائے گا تو پھر ان لوگوں میں اور موجودہ ایسی ہی نظام ہائے حکومت کے ارباب بست و کث میں فرق کیا ہو گا؟ اگر ”صالحین“ کے ہاتھوں بھی خلق خدا کا وہی حشر ہونا ہے تو ”فاسقین اور فاجرین“ کے ہاتھوں میں ہو رہا ہے تو ”صالحین“ کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے اس قدر کد و کاوش کا ہے کہ یہ ہے وہ دلیل جسے یہ حضرات اس طمطراق سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مودودی خدا فرماتے ہیں کہ اگر زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر امت کی مشترکہ تحویل میں دید جائے تو اس سے ایسا نظام وجود میں آ جاتا ہے جس سے زیادہ انسانیت کش نظام شیطان وضع نہیں کر سکا۔ ہم ان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ کیا تھا کہ انہیں انفرادی ملکیت میں دینے کے بجائے، حکومت کی تحویل میں رکھا جائے، تو کیا اس کے بعد وہ نظام واقعی ”انسانیت کش شیطانی“ نظام میں تبدیل ہو گیا تھا۔

دینی انتشار

اگلے دنوں روزنامہ نوائے وقت میں چوہدری محمد علی صاحب کا ایک مقالہ مسلسل قسطوں میں شائع ہوا تھا جس کا موضوع تھا ”اہل پاکستان کے سیاسی اور معاشی مقاصد“۔ اس میں انہوں نے بھی ذرائع پیداوار کو قومی تحویل میں دیدینے کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اس کے لئے ان کی دلیل کیا ہے، وہ بھی سننے کے لائق ہے۔ وہ اسلامی نظام حکومت کی خوبیاں گنواتے

ہوئے لکھتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام میں ارباب حکومت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ حکومت کے اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے یا اپنے خویش واقارب کے لئے مال دولت فراہم کریں۔ حکومت کے تمام اختیارات اور سارا خزانہ یا بیت المال عوام کی امانت ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔
 کریم! تعلق تمہارے مال کے ساتھ دھی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں حاجتمند ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا۔ اور اگر حاجتمند ہوں تو معمولی گزارہ لے لوں گا۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق خلافت راشدہ میں خلیفہ اور گورنروں اور عاملوں کے لئے بیت المال سے فقط اتنا شاہر مقرر کیا گیا تھا جو ان کے گھروالوں کو ایک عام مسلمان گھرانے کی طرح زندگی بسر کرنے دے۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتوحات اور مال غنیمت کی کثرت کی وجہ سے عام لوگوں کی مالی حالت بدرجہا بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن خلیفہ وقت کی خود یہ حالت تھی کہ کپڑوں میں کئی کئی پیوند لگے ہیں۔ مکان کے لئے ایک جھوپڑا ہے اور کھانا وہی ہے جو ایک آدمی کو میسر آتا ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں ہر خلیفہ وقت کی یہی کیفیت رہی۔ اور مختلف صوبوں کے گورنروں کو بھی ایسی ہی زندگی بسر کرنے کے احکام تھے۔ اس امر پر اجماع صحابہ ہے کہ جو حکمران ہے وہ سوداگری نہیں کر سکتا۔ یعنی حکومت کو مال دار بننے کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔ خلافت راشدہ اور ہر دوسری طرز حکومت کے درمیان یہ حد فاصل ہے۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ حکمرانوں نے بالعموم حکومت کو اپنے اور اپنے اعزہ واقارب کے لئے مال و آسائش کا ذریعہ بنایا اور بندگان خدا پر اپنی آفاقی کاسکے جایا۔

نوائے وقت - باب ۲۰ جون ۱۹۶۶ء

ظاہر ہے کہ جس نظام حکومت میں حکمران طبقہ کی یہ کیفیت ہو اس میں اگر ماضی ذرائع حکومت کی تحویل میں دیدیئے جائیں تو اس سے کیا خرابی لازم آسکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں کہ

اسلام ارتکاز مال و اقتدار پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ اور بچائے اس کے کہ وہ دونوں کو ایک ہاتھ میں جمع ہونے دے، ان میں تفریق کرتا ہے۔

یعنی ارباب اقتدار، اوبیکٹر و عمرز کی سیرت و کردار کے حامل بھی کیوں نہ ہوں، اسلام انہیں بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا اس لئے اقتدار اور مال کو ایک ہی ہاتھ میں جمع ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ یا اللعجب! جس نظام میں اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ وہ ارباب اختیار کو صرف مال کے معاملہ میں حدود کے اندر رکھ سکے، اس کے متعلق یہ دعوے کرنا کہ وہ انسانیت کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے، خوش فہمی کے سوا اور کیا کہلا سکتا ہے؟

ہمیں اس اعتراض کے وزنی ہونے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ معاشرہ کے موجودہ نظام میں ارباب اقتدار کے ہاتھ میں جس قدر زیادہ اختیارات ہوں گے معاشرہ میں اتنی ہی زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ لیکن اس سے یہ دعوے کرنا کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ذرائع پیداوار کو قوم کی مشترکہ تحویل میں رکھا جائے۔ اگر فریب دہی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ اس موضوع پر گفتگو اس انداز سے ہونی چاہئے کہ

(۱) کیا اسلام کی رُو سے یہ جائز ہے کہ ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت کے بجائے امت کی مشترکہ تحویل میں رکھا جائے۔

(۲) اگر یہ جائز نہیں تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ حکمران "صالحین" ہیں یا فاسقین۔

(۳) اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ معاشرہ کی موجودہ حالت کو پیش نظر رکھتے

ہوئے ہمیں کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے ہم بتدریج اس منتہی تک پہنچ سکیں۔

اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہم معاشرہ کے پورے نظام کو آہستہ آہستہ قرآن کریم کی عطا کردہ

اقدار کے قالب میں ڈھالتے جائیں۔ یاد رکھئے۔ اسلام زندگی کا کُل نظام عطا کرتا ہے

معاشری نظام اس کا ایک گوشہ ہے۔ اس نظام کے مختلف گوشے اپنے انسانیت ساز نتائج

اسی صورت میں مرتب کریں گے جب اسے بالکل نیا نافذ کیا جائے۔

اس کے کسی ایک گوشے کو، باقی نظام سے الگ کر کے، مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

اسلامی سوشلزم

اب ہم اس مسئلہ کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں جو گوشہ اول سے بھی زیادہ اہم بنے اور اس کا تعلق ہے ان حضرات سے جو اس کے قائل اور مدعی ہیں کہ پاکستان میں سوشلزم کا نظام رائج ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) سوشلزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا کوئی ایک مفہوم ابھی تک متعین نہیں ہو سکا۔ اس لئے جب یہ کہا جائے کہ پاکستان میں سوشلزم کا نظام رائج ہونا چاہیے تو اس سے کوئی خاص نظام سلسلہ نہیں آتا۔

(۲) چونکہ سوشلزم کی نسبت عام طور پر روس اور اب، چین کی طرف کی جاتی ہے اس لئے اس اصطلاح سے ذہن اسی طرف جاتا ہے۔ یعنی سمجھایا جاتا ہے کہ یہ لوگ یہاں روس دیا اب، چین کی سوشلزم رائج کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) روس اور اب، چین میں سوشلزم سے مفہوم صرف معاشی نظام نہیں۔ سوشلزم (اور اس سے آگے کیونرزم) سے مراد ہے ایک خاص فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام ہوگا (بالخصوص چین میں) ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ چین کی تو روس سے لڑائی ہی اس بات پر ہے کہ روس نے سوشلزم کے فلسفہ حیات میں تحریف کر دی ہے۔ اسی لئے وہ اسے ”بدعتی“ قرار دیتا ہے۔

(۴) سوشلزم کا معاشی نظام تو تران کے معاشی نظام کے ماثل ہے۔ لیکن سوشلزم کا فلسفہ قرآنی فلسفہ حیات سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ اس کی ضد ہے۔

(۵) ہمارے ہاں سوشلزم کے مدعی، ان دونوں بنیادی چیزوں (یعنی سوشلزم کے فلسفہ حیات اور اس کے معاشی نظام) میں تفریق نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نظام سرمایہ داری کے حامی ہیں، وہ سوشلزم کے خدا فراموش فلسفہ حیات کو ابھار کر سامنے آتے ہیں اور پھر مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے نزدیک اس قسم کا نظام جس میں نہ خدا کو مانا جاتا ہے نہ رسول کو، نہ آخرت پر ایمان ہوتا ہے نہ وحی پر کسی طرح بھی قابل قبول

ہو سکتا ہے؟ اور نظا ہر ہے کہ اس قسم کا نظام کسی بھی مسلمان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس طرح وہ اپنے پراسیگنڈہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(۶) اس تبلیغ (یا القیاس) کو محسوس کرتے ہوئے بعض حضرات نے یہاں 'اسلامی سوشلزم' کی اصطلاح رائج کرنی چاہی ہے۔ لیکن ان کی طرف سے بھی متعین طور پر نہیں بتایا جاتا کہ اس سے مراد کیا ہے؟ اس سے نظام سرمایہ داری کے حامیوں کو پھر اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ترجمان، ہفتہ وار 'الاشعین' (لاہور) کی ۱۶ مارچ ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں، اس موضوع پر سوال و جواب کی شکل میں مودودی صاحب کے جوابات شائع ہوئے۔ وہ غور طلب ہیں۔

» سوال « آج کل "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کثرت سے استعمال ہو رہی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ براہ کرم وضاحت فرمائیے۔

جواب :- جو لوگ "اسلامی سوشلزم" کا نام لیتے ہیں، پہلے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی وضاحت فرمائیں، بعد میں ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت صرف "اسلامی سوشلزم" کے الفاظ ہی سنے جاتے ہیں میری نگاہ سے نہیں گذرنا کہ کسی نے اس کی وضاحت بھی کی ہو، اور اگر کہیں کچھ لوگوں نے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے تو دو آدمیوں کی وضاحت آپس میں نہیں ملتی۔ ہر ایک نئے معنی پیش کرتا ہے۔ اب ہوائی باتوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ یہ تو "اسلامی سوشلزم" کا فقرہ بلند کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟

» میں مختصراً جو کچھ بتا سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ سوشلزم ایک خاص مسلک کی حیثیت سے دنیا میں

معروف ہے اس مسلک کے اگرچہ مختلف مذاہب (SCHOOLS OF THOUGHT) ہیں مگر ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ایک ملک کے تمام ذرائع کو نیشنلائز کر لیا جائے۔ اب اگر اس نیشنلائزیشن کو سوشلزم سے نکال دیا جائے تو اس کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور اگر اس مفہوم کو باقی رکھا جائے جیسا کہ وہ ہے تو اس کے ساتھ اسلامی لفظ لگانا سراسر فریب ہے۔

» اسلام میں اس طرح کی قومی ملکیت کا کوئی جواز نہیں کہ تجارت، کھیت، کارخانے، گھر حتیٰ کہ

برتن، کپڑے تک سرکاری ملکیت میں ہوں اور افراد کے پاس کوئی شے نہ چھوڑی جائے۔ یہ چیز بدترین

آمریت کے سوا کچھ نہیں دیجی۔ ہمارے ہاں جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں وہ اپنے آپ کو جمہوریت کا قائل بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ اگر سوشلزم کا نام کہیں رائج ہو تو جمہوریت وہاں پنپ ہی نہیں سکتی۔ سوشلزم ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے آتا ہے یا پھر اگر جمہوریت موجود ہو تو اسے ختم کر دیتا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ جہاں ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں لے لئے گئے ہوں تو وہاں کیا حال ہو گا۔ اس کا اندازہ خود لگالیں۔ سوشلزم میں زمین اور کھیت قومی ملکیت ہوتے ہیں، آپ صرف کاشتکار ہوتے ہیں۔ سارے کارخانے حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں، آپ صرف مزدور ہوتے ہیں۔ اظہار رائے آپ نہیں کر سکتے، اختلاف کا کوئی آپ کو حق حاصل نہیں ہوتا۔ جن قوموں پر ڈکٹیٹر شپ مسلط ہے وہ تو خدا کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس قوم سے زیادہ احق کون ہو گا، جو اسے اپنی مرضی سے اپنے اوپر مسلط کرنے کی خواہش کرے۔ ان کی معیشت آزاد نہ ہو تو اس کی ہر آزادی ختم ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں اس کا ضمیر بھی غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ اسلام نے انسان کی بھلائی کا ہر راستہ تجویز کیا ہے اس میں کسی زبردستی یا جبر کا تصور نہیں۔ اسلام ضمیر کی موت یا شرف آدمیت سے محرومی کی قیمت پر کسی نظام حیات کا قائل نہیں ہے۔

”میں چاہتا ہوں کہ جن پارٹیوں کے لیڈر ”اسلامی سوشلزم“ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، وہ حقائق کی روشنی میں ان باتوں پر غور کریں۔ اس سے ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ تقاضا درکنہ ہے کہ اسلامی سوشلزم کا لغو بلند کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

(۱) سوشلزم سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفہ حیات، دوس یا چین کا معاشی نظام۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ اسلامی پیوند لگ ہی نہیں سکتا۔

(۲) اگر سوشلزم سے اس کا فلسفہ زندگی نکال دیا جائے تو وہ سوشلزم نہیں رہتی بلکہ ایک سوشل سسٹم (SOCIAL SYSTEM) رہ جاتا ہے۔ اگر اسلامی سوشلزم سے مراد ہے (اسلام کا فلسفہ حیات) اس قسم کا معاشی نظام جو دوس یا چین میں رائج شدہ نظام کے مماثل ہے، تو اسے آپ اسلام کا سوشل سسٹم کہہ سکتے ہیں، اسلامی سوشلزم نہیں کہہ سکتے۔ بادی النظر میں ہر دو اصطلاحات میں یونہی لفظی فرق نظر آئے گا لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو

یہی لفظی سافرق ان دونوں کے مفہوم کو الگ الگ کر دے گا۔ سوشلزم میں (ISM) کا تعلق فلسفہ حیات سے ہے۔ لیکن (سوشل سسٹم) میں فلسفہ حیات کا تصور شامل نہیں ہوتا، صرف سوشل نظام مقصود ہوتا ہے۔ لہذا اسے۔

قرآن کا سوشل سسٹم

— کہا جاسکتا ہے۔ اس پر وہ اعتراضات وارد نہیں ہو سکیں گے جو اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر (حسن نیت یا پراپیگنڈہ کی غرض سے) عائد کئے جاتے ہیں۔

(۳) سوشلزم کے خلاف یہ اعتراض بھی درج ہے کہ یہ ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے ہی قائم ہو سکتی ہے — یہ اس لئے کہ روس یا چین میں سوشلزم کے علمبردار شروع سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اسکی بنیاد (PROLETARIAT DICTATORSHIP) ہے۔ قرآن کے نظام معیشت پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اس لئے کہ اس کا معاشی نظام کوئی الگ شے نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ قرآن ایک نظام کی دیتا ہے جو زندگی کے ہر گوشہ کو محیط ہوتا ہے۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام، سب اس کی نظام کے مختلف پہلو (FACETS) ہیں چونکہ قرآنی نظام میں ڈکٹیٹر شپ نہیں، اس کا نظام مشاورتی ہے، جس میں ساری امت شریک ہوتی ہے، اس لئے قرآنک سوشل سسٹم پر یہ اعتراض بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے لئے ڈکٹیٹر شپ لازمی ہے۔

(۴) چوہدری محمد علی صاحب نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ سوشلزم، تشدد کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ ان کا یہ اعتراض بھی دقیق ہے۔ سوشلزم کے مدعی اس حقیقت کو چھپا کر نہیں رکھتے کہ یہ انقلاب تشدد کے بغیر برپا نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن کے سوشل نظام پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ یہ انقلاب قلب و دماغ میں صالح تبدیلی سے برپا ہوتا ہے۔ ایمان، قلب و دماغ کی کامل رضا مندی سے صداقت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ یہ (CONVICTION) ہے (COERCION) نہیں۔ اس میں طاقت کی ضرورت وہاں لاحق ہوتی ہے جہاں اسلام کے دشمن (قریش مکہ کی طرح) اس نظام کے قیام کی راہ میں حائل ہوں یا اسے طاقت کے ذریعے مٹانا چاہیں۔

(۵) مودودی صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ "سوشلزم میں زمین اور کھیت قوی ملکیت ہوتے ہیں۔ آپ صرف کاشتکار ہوتے ہیں۔ سارے کارخانے حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں، آپ صرف مزدور

ہوتے ہیں: یہ اعتراض اس سسٹم پر تو دارد ہو سکتا ہے جس میں "قوم" الگ ہو اور "افراد" الگ۔ یا "حکومت" اور ہو اور "رہایا" اور۔ تر آنی نظام میں یہ شرق اور امتیاز ہوتا ہی نہیں۔ وہاں "قوم" کا وجود افراد سے الگ نہیں ہوتا۔ نہ ہی حکومت، اور رہایا درجہ اگلا نہ وحدتیں ہوتی ہیں۔ وہاں ہر فرد قوم ہوتا ہے، اور حکومت خود افراد کی اپنی ہوتی ہے۔ کسی غیر کی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں قومی ملکیت سے مراد ہوتی ہے جملہ افراد کی مشترکہ ملکیت (بلکہ تحویل) اور حکومت سے مراد ہوتی ہے افراد کا اپنا قائم کردہ نظام معاشرہ۔

آپ نے غور نہ کیا کہ سطح میں حضرات جسے محض اصطلاح کا لفظی فرق کہتے ہیں، وہ درحقیقت کس قدر دور رس نتائج کا حامل ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم اس پر زور دیتے رہتے ہیں کہ ہمیں اصطلاحات ترقی ہی استعمال کرنی چاہئیں۔

ایک اہم شہادت

باقی رہا مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ اگر سوشلزم کا مفہوم ہے نیشنلائزیشن (NATIONALIZATION) - یعنی ذرائع پیداوار کو امت کی مشترکہ تحویل میں دے دینا۔ تو اس کے ساتھ اسلامی لفظ لگانا سراسر فریب ہے۔ مودودی صاحب سے کسی معاملہ میں قرآن کی بنیادوں پر گفتگو کرنا بے کار ہے سو اس سلسلہ میں ہم ایک ایسی تائید پیش کرتے ہیں جسے (غالباً) وہ سند تسلیم کر لیں گے۔ انھوں نے مسلمان کے سربراہ، سید قطب (مرحوم) کے متعلق ان کے جو خیالات ہیں وہ واضح ہیں۔ وہ انہیں عصر حاضر کا عظیم مفکر اور جلیل القدر مفسر قرآن مانتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب (العدل الاجتماعيہ) "اسلام کا نظام عدل" میں لکھتے ہیں کہ

"اسلام یہ کر سکتا ہے کہ مفاد عامہ سے متعلق ساری چیزوں کو، ان نفع اندوزوں اور سٹہ بازوں کے ہاتھ سے لے کر جو قومی مفاد کا ذرا بھی پاس اور لحاظ نہیں رکھتے، قوم کے ہاتھ میں دے دے"

(صفحہ ۳۰۲)

اس سلسلہ میں اتفاق سے خود مودودی صاحب کی ایک ایسی بات سامنے آتی ہے جو ان کے تمام اعتراضات کا جواب ہٹا کر دیتی ہے۔ ان کے درس قرآن و حدیث میں کسی نے یہ سوال پوچھا کہ

آپ نے فرمایا ہے کہ آدمی بقدر کفایت پس انداز کر سکتا ہے۔ ہزار روپیہ ماہوار آمدن پانے والے آدمی کے لئے بقدر کفایت کیا رقم ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ

اس کا فیصلہ تو آدمی خود کر سکتا ہے۔ اور صحیح فیصلہ وہی شخص کرے گا جس میں اسلامی ذوق موجود ہو۔ مغربی ذوق رکھنے والے آدمی کا انداز بالکل مختلف ہوگا۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں کبھی کسی شخص کو اپنے مستقبل کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ معاشرہ خود سارا انتظام کرتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی معاشرہ میں ہر فرد ایک دوسرے سے کٹا ہوا نظر آتا ہے اور اسے اپنے مستقبل کو خود سمجھانا پڑتا ہے اسلئے وہاں بقدر کفایت کا مفہوم اسلامی معاشرہ سے بالکل مختلف ہے۔

(ایشیا۔ مؤرخہ ۲۶)

بس یہی فرق قرآن کے اشتراکی معاشرہ اور نظام سرمایہ داری میں ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ہر فرد دوسرے سے کٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اسے اپنے مستقبل (بلکہ حال اور مستقبل دونوں) کو خود سمجھانا پڑتا ہے اور قرآن کے اشتراکی معاشرہ میں کسی شخص کو اپنے (حال اور) مستقبل کی فکر آپ نہیں کرنی پڑتی۔ معاشرہ اس کا خود سارا انتظام کرتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب تمام افراد کے (حال اور) مستقبل کا فکر معاشرہ کو کرنا ہوگا تو معاشرہ اپنے اس عظیم فریضہ کو اسی صورت میں پورا کر سکے گا جب ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے، معاشرہ کی تحویل میں رہیں۔ اسی کا نام اشتراکی نظامِ ربوبیت یا قرآن کا سوشل نظامِ معیشت ہے۔ (سوشل کے معنی ہی یہ ہیں کہ افراد ایک دوسرے سے کٹے ہوئے نہ ہوں۔ ایک وحدت کے غیر منقسم اجزاء ہوں) افراد کے متعلق معاشرہ کی یہی وہ اجتماعی ذمہ داری تھی جس کے احساس سے حضرت عمرؓ نے

سرمایہ تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتاب بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم، عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ اور اسی ذمہ داری سے عہدہ براہونے کے لئے آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ عراق کی مفتوحہ زمینیں افراسیاب تقسیم کرنے کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ یہی وہ قرآن کا اشتراکی تصور تھا جس کی تابندہ جھلک ہمیں صحیفین کی اس روایت میں ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے بیان کیا کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر ویسے فلتے کی نوبت آ جاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر بٹھتے لٹکا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اشعریوں کا یہی دستور تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قرآنی راہ نمائی میں) اسلامی نظام معاشرہ کے آئین کی حیثیت سے رائج فرمایا۔ اسی کو قرآنی نظام معیشت کہا جاتا ہے جس میں پوری امت کا دسترخوان مشترک ہوتا ہے۔

ایک فریب ہے ایک حقیقت

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، ہم اس وقت تاریخ کے ایک بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ قرنہا قرن کے سرمایہ داری کے مستبدانہ نظام کے بعد، خدا خدا کر کے یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے کہ زمین میر و سلطان سے بیزار ہے

سرمایہ داری نظام کی قوتوں نے ہمیشہ مذہب کو اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ وہ آج بھی یہی کر رہی ہیں۔ اس کے لئے ان کی طرف سے اشتراکیت کی مخالفت کے لئے

BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER.

کافر یا انگریز غرہ بلند کیا جاتا ہے۔ اگر ہم اس وقت (BELIEVERS IN GOD) کے اس غرہ غرہ

لے خدا کی طرف سے عطا شدہ دین کی سخت صورت کا نام مذہب ہے۔

میں آگئے تو معلوم تاریخ میں اس قسم کا موڑ کب آئے۔ اس سلسلہ میں ہم نظام سرمایہ داری کے حمایتیوں سے تو کچھ کہنا بے کار سمجھتے ہیں، البتہ جو حضرات اپنے سینے میں ”اسلام اور سوشلزم“ کا درور رکھتے ہیں ان سے ضرور عرض کریں گے کہ وہ اپنے موقف کی وضاحت صاف صاف کریں تاکہ معترضین کے لئے غلط پرائیگنڈے کی گنجائش نہ رہے اور ظاہر ہے کہ یہ موقف اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ۔

(۱) اسلام ایک کئی نظام زندگی ہے جس کی بنیاد اس اصل عظیم پر ہے کہ اطاعت اور حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآن کریم) کی اطاعت ہے۔

(۲) یہ اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اجتماعی طور پر، معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے جس معاشرہ میں اطاعت کتاب اللہ کی ہو اسے اسلامی معاشرہ کہتے ہیں۔

(۳) اسلامی معاشرہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوتی ہے۔ اور معاشرہ اپنی اس عظیم ذمہ داری سے جبدہ براہوں کے لئے ذرائع پیداوار کو اپنی اجتماعی تحویل میں لے سکتا ہے۔ ذرائع پیداوار کے متعلق قرآن کا دیا ہوا تصور یہی ہے کہ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام افراد کے لئے سامان زیست ہونا چاہئے۔

(۴) اسلام کے اس معاشی نظام کو ”سوشلزم“ نہیں کہنا چاہیے۔ کیونکہ سوشلزم (SOCIALISM AS SUCH) صرف ایک معاشی نظام نہیں بلکہ ایک خاص فلسفہ زندگی پر متفرع معاشی نظام ہے اور وہ فلسفہ زندگی، اسلامی نظریہ حیات کی نقیض ہے۔ اگر اسے قرآنک سوشل آرڈر“ کہہ لیا جائے تو اس میں سوشلزم کے فلسفہ زندگی کا تصور نہیں آتا۔ قرآنی نظامِ ربوبیت اس کا صحیح مفہوم ادا کر سکتا ہے۔ یعنی ایسا معاشی نظام جو سوشلزم کے معاشی نظام کے تو مماثل ہے لیکن جو، سوشلزم کے نہیں، بلکہ قرآن کے اپنے فلسفہ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

(۵) جہاں تک ”خدا کو ماننے“ کا تعلق ہے، قرآن، جماعتِ مومنین کے علاوہ کسی کو بھی

خدا پر ایمان رکھنے والا تسلیم نہیں کرتا۔ دوسروں کے متعلق اس کا اعلان یہ ہے کہ

فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا (۱۱۳)

اگر یہ لوگ (جو خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں) اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر ہیں۔

لہذا، جہاں تک اسلامی آئیڈیالوجی کا تعلق ہے، خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی (یہود و نصاریٰ) اور منکرین خدا (کمیونسٹ) ایک سطح پر ہیں۔ لیکن جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، نظام سرمایہ داری اسلام کی مذہب اور اشتراکی نظام اس سے اقرب ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے مؤیدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے موقف کی وضاحت مذکورہ صدر انداز سے کریں تاکہ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کے لئے، عوام کو لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا کر فریب دہی کی گنجائش نہ رہے۔ اور وہ نظام سرمایہ داری کی حمایت کرنا چاہیں تو کھل کر سامنے آئیں۔ اس وقت ان کا انداز یہ ہے کہ وہ سوشلزم کی مخالفت میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اس میں خدا، وحی، رسالت، آخرت کا انکار ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اسلام کے متعلق نقطہ اتنا کہہ دیتے ہیں کہ اس میں تمام دنیا کی مشکلات کا حل موجود ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں بتاتے کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہے جس میں (کم از کم) انسان کے معاشی مسئلہ کا حل موجود ہے۔ وہ جب اس قسم کا مبہم دعویٰ کریں تو ان سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ تفصیلاً بتائیں کہ وہ نظام کیا ہے جس کے متعلق وہ اس قدر بلند آہنگ دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کا متعین جواب ان کی طرف سے کبھی نہیں دے گا۔

یاد رکھیے۔ انسانیت کی فلاح صرف قرآن کے اشتراکی نظام سے ہو سکتی ہے۔ اور وہ نظام اس کے نظام کلی کا ایک جزو ہے جو اس کی اپنی آئیڈیالوجی پر متفرع ہے۔
اگر بائیں نرسیدی تمام بولہبی است

(اگست، ۱۹۶۶ء)



نظامِ رُبُوبیت کس قیام ہوگا؟

(پرویز)

مجھ سے اکثر احباب پوچھتے رہتے ہیں رباً بالمشافہ بھی اور خطوط کے ذریعہ بھی، کہ نظامِ رُبُوبیت جس کا تصور میں ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں، وہ بالآخر کب قائم ہوگا؟ مجھے ان احباب کی بیتابی، تمنا کا پورا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ معاشرہ کے حالات جس قدر خراب ہو چکے ہیں ان سے اس طبقہ پر کیا گزر رہی ہے جو پوری پوری محنت و مشقت اور سعی و کادش کے باوجود، اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں کر سکتے۔ ان کے حالات سننا ہوں تو دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی ان مصیبتوں کا علاج — اتنا ہی نہیں بلکہ بے شمار خرابیوں کا علاج — قرآنی نظامِ رُبُوبیت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نظامِ انفرادی طور پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ملک کے وسائل پیداوار، تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے ملت کی اجتماعی تحویل میں ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انتظام، حکومت کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے میں پہلے دن سے نہایت صراحت اور وضاحت سے پیش کرتے چلا آ رہا ہوں۔ اور اس کے لئے میرا اولین مخاطب، برسرِ اقتدار طبقہ ہوتا ہے، کہ اگر بات ان کی سمجھ میں آجائے اور وہ اس قرآنی مشن کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اس نظام کے قائم ہونے میں نہ دیر لگ سکتی ہے نہ دقت پیش آ سکتی ہے۔ ہمارا دور آئینی ہے اور مملکت کے نظام میں ہر تبدیلی آئینی طور پر ہی پیدا کی جاسکتی ہے اس کے لئے دوسری صورت یہ ہے کہ اس تصور کو ملک میں اس قدر عام کیا جائے کہ یہ جمہور کا تقاضا بن جائے اور وہ ایسے افراد کو اپنا نمائندہ منتخب کر کے مجالسِ توائین ساز میں بھیجیں جو اس نظامِ خداوندی کی قیادت پر

علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہوں اور اسے عملاً متشکل کرنے کا عزم لے کر ان مجالس میں جاؤں۔ میں جو اس فکر کو، اپنی بساط کے مطابق عام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو اس سے یہی مقصد ہے۔

۲۔ بعض احباب یہ تجویز لے کر آتے ہیں کہ جو لوگ اس تصور سے متفق ہیں وہ ایک محدود شکل میں اپنے طور پر اس نظام کو قائم کیوں نہیں کر لیتے۔ ان کی تجویز کا لہجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ احباب ایک چھوٹی سی بستی بسالیں جس میں اس تصور کو عملی شکل دے کر اپنی زندگی اس پہنچ پر بسر کریں۔

یہ تجویز نئی نہیں۔ یہ برسوں سے میرے سامنے لائی جا رہی ہے اور متعدد بار اس پر غور و خوض ہو چکا ہے۔ اور اسے ناقابلِ عمل پایا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب آپ اس قسم کے انفرادی نظام کی آواز بلند کریں گے، اس پر لٹیک کینے والوں میں (زیادہ نہیں تو کم از کم) نوٹس فی صد (HAVE - NOTS) یعنی وہ لوگ ہوں گے جن کی آمدنی ان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کفایت نہیں کرتی۔ اور (شاید) دس فی صد لوگ ایسے ہوں جو اپنی ضروریات پوری کر سکیں یا جن کے پاس ضروریات سے کچھ زائد ہو۔ میں احباب کو مایوس نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا خیال ہے کہ میرا یہ اندازہ بھی کچھ خوش نہی ہی پر مبنی ہے۔ جن کے پاس ضروریات سے نائد دولت ہو، وہ بہت کم ادھر آئیں گے۔ اب آپ سوچئے کہ جو نظام ان احباب پر مشتمل ہو جو اپنی کمائی سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوں، اور ایسے لوگ اس میں شامل نہوں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو وہ چل کیسے سکے گا؟

اس کے بعد ایک بڑی دشواری اور سامنے آتی ہے۔ اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زائد از ضروریات دولت رکھنے والے حضرات کے افراد خاندان — ان کے بیوی بچے اور دیگر متعلقین — سب اس فکر سے متفق اور اس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے دلی تعاون کے بغیر یہ نظام ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک الگ جماعت قائم کرنا — چہ جائیکہ ایک الگ بستی بنانا — تو میری دعوت کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اسی سے فرقہ بندی کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ میں وہ وجوہات جن کی بنا پر اس تجویز کو نہ اس سے پہلے کبھی قابلِ عمل سمجھا گیا۔ اور نہ ہی اب ردِ خور اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ نامساعد حالات کے باعثوں پس چلنے والے احباب کی بیانی تمنا بجا اور درست۔ لیکن اس کا علاج پورے معاشرہ کے نظام میں تبدیلی کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر

عرض کیا ہے۔ ان مصیبت زدہ احباب کی داستانِ غم و الم سن کر جو کچھ میرے قلبِ حساس پر بتتی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس سے میرے سینے میں بھی جذبات کے کچھ کم تلاطم انجیز طوفان نہیں اٹھتے۔ لیکن میں شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔ رہنے ہی کسی کو ایسا قدم اٹھانے کا مشورہ دے سکتا ہوں) جس کا نتیجہ مایوسی اور افسردگی کے سوا کچھ نہ ہو۔

۲۔ بعض حضرات یہ اعتراض بھی پیش کرتے ہیں کہ اس معاشی نظام کو قانون کے ذریعے نافذ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ایک خاص قسم کا نظام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ یہ نظام، اسلام کا تجویز کردہ ہے یا نہیں۔ اگر یہ اسلامی نظام نہیں تو اسے قانون نافذ کرنا تو ایک طرف، اگر مسلمان اسے بطیب خاطر بھی اپنے ہاں رائج کرنا چاہیں تو ان کا یہ اقدام سراسر غلط ہوگا اور ایک اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس کی روک تھام کرے۔ لیکن اگر یہ نظام، اسلام کے مطابق ہے تو پھر اس کا قانون نافذ کرنا مسلمانوں پر جبر کرنے کے مراد نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ بطیب خاطر اس کا اقرار کرتا ہے کہ وہ ہر اسلامی فیصلہ کو قبول اور اختیار کرے گا۔ مثلاً شراب و خمر کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے۔ اگر حکومت اس کا استعمال از روئے قانون ناجائز قرار دیدے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ حکومت نے ان مسلمانوں پر جبر کیا ہے جو شراب نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قرآنی فیصلہ کے سامنے تسلیم خم کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تو اس کے لئے یہ راستہ کھلا ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔

لہذا، قرآن کے معاشی نظام کا، قانون کی رو سے نفاذ، مسلمانوں پر جبر نہیں کہلا سکتا۔ (ایسے ہی جیسے کسی کمیونسٹ پر کمیونزم کے معاشی نظام کا قانون نافذ، جبر نہیں کہلا سکتا)۔ میری کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں پر اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ نظامِ ربوبیت، قرآن کریم کا تجویز کردہ نظام ہے اور اس کا اپنے ہاں رائج کرنا عین اسلام کا تقاضا۔

۳۔ اس سلسلہ میں، میں اتنا اور عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دعوت صرف نظامِ ربوبیت کا قیام نہیں۔ یہ تو اس دعوت کا ایک گوشہ ہے۔ میری دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ

اسلام، جو خدا کے عطا کردہ دین کے بجائے، انسانی ذہنوں کا تراشیدہ مذہب بن کر رہ گیا ہے، اسے پھر سے اس کی اصلی اور حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، اور اس طرح قرآن کی شمع آسمانی کو جس پر انسانوں کے خود ساختہ تصورات، نظریات، معتقدات اور رسوم و رواج کے دبیر پردے پڑ چکے ہیں، پھر سے وجہ تابیانی، محض انسانیت بنایا جائے۔ اگر دین اپنی حقیقی شکل میں مسلمانوں کے سامنے آجائے تو پھر نظام ربوبیت کا قیام اس کا فطری نتیجہ ہو گا۔ اس وقت اس کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے خود ساختہ "مذہب" کا وجود ہے۔ یہ ہے میری بنیادی دعوت اور یہ ہے میری تمام کوششوں کا منہتی اور مقصود۔ اس نے صرف ہمارے نظام معیشت میں تبدیلی آئے گی بلکہ زندگی کا ہر گوشہ خوشگوار آسمانی انقلاب سے ہم آغوش ہو گا، جس سے پھر وہ انسانیت ساز فضا وجود پر و مندی دل و دماغ ہو گی تو ایک بار سرزمین حجاز میں، محمد رسول اللہ والذین معہ رضی اللہ عنہ کے مقدس ہاتھوں آئینہ پوش ہوئی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کیلئے انسانیت کی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ بلکہ الحمد للہ اس باب میں مجھے جو کامیابی ہوئی ہے وہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میں جب اُس فضا پر نگاہ ڈالتا ہوں جس میں یہ آواز آج سے پچیس تیس برس پہلے بلند کی گئی تھی، پھر اپنی بے سرو سامانی پر نظر ڈالتا ہوں، اور اس کے بعد یہ دیکھتا ہوں کہ آج کس طرح ملک کے گوشے گوشے تک یہ آواز پہنچ چکی ہے اور اس نے کس طرح فضا میں ایک خوشگوار ارتعاش اور امید اتر اتر کر پھیل کر ویلے، تو میرا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں، ستانہ وار جھک جاتا ہے۔

(ماہ ۱۹۶۵ء۔ باضافہ ستمبر ۱۹۶۶ء)